عورت
اسلامی معاشرہ میں
سید جلال الدین انصر عمری

بسم الله الرحمن الرحيم

مولانا سید جلال الدین انصر عمری

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

نام کتاب : عورت اسلامی معاشرہ میں
مصنف : مولانا سید جلال الدین انصر عمری
اشاعت : ایڈیشن تعداد
16 1100
مئی 2005ء
اہتمام : پروفیسر محمد امین جاوید (منیجنگ ڈائریکٹر)
اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳۔ کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔ پاکستان
فون : 7248676-7320961۔ فیکس 7214974
ویب سائٹ : www.islamicpak.com.pk
ای میل : islamicpak@hotmail.com
islamicpak@yahoo.com
طابع : ڈے ٹائم پرنٹرز
قیمت : -/99 روپے

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرضِ ناشر

عورت کا صحیح مقام کیا ہے اور اس کا صحیح دائرہ کیا ہے؟ قدرت نے اس کے سپرد کیا کام کیے اور کیا نہیں کیے ہیں؟ ان تمام امور کو سمجھنے کے لیے آپ کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مولانا سید جلال الدین صاحب انصر عمری کی یہ گراں قدر تالیف اس موضوع پر ایک بلند پایہ کتاب ہے جس میں آپ نے نہایت خوبی سے عورت کا صحیح مقام پیش کیا ہے۔ آپ نے قدیم اور جدید تہذیبوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ عورت کو صحیح مقام صرف اسلامی تہذیب ہی میں حاصل ہوا ہے۔

اپنے معاشرہ کو پاکیزہ اور اعتدال کی راہ پر قائم رکھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

اس موضوع پر سیر حاصل مطالعہ کے لیے ہم قارئین سے سفارش کریں گے کہ اس کتاب ساتھ ہی وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی حسب ذیل گراں قدر کتب کا بھی ضرور مطالعہ کریں۔

۱- پردہ۔

۲۔ حقوق الزوجین۔

۳۔ اسلام اور ضبط ولادت۔

اس طرح نہ صرف یہ کہ اس مسئلہ کے تمام پہلو ان کے سامنے آجائیں گے بلکہ ہمیں امید ہے کہ وہ دوسری کتابوں سے بڑی حد تک مستغنی بھی ہو جائیں گے۔

لاہور ـــــــــــ ۱۳۸۸ھ

مینجنگ ڈائرکٹر

اسلامک پبلیکیشنز لیمٹڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

عورت نصف انسانیت ہے۔ مرد انسانیت کے ایک حصّہ کی ترجمانی کرتا ہے تو دوسرے حصّہ کی ترجمانی عورت کرتی ہے۔ عورت کو نظر انداز کر کے نوعِ انسانی کے لیے جو بھی پروگرام بنے گا وہ ناقص اور ادھورا ہو گا۔ ہم ایسی کسی سوسائٹی کا تصوّر نہیں کر سکتے جو تنہا مردوں پر مشتمل ہو، اور جس میں عورت کی ضرورت نہ ہو۔ دونوں ایک دوسرے کے یکساں محتاج ہیں۔ نہ عورت مرد سے مستغنی ہو سکتی ہے اور نہ مرد، عورت سے بے نیاز۔ ان کے احتیاج کی نوعیت سماجی و معاشرتی بھی ہے اور جنسی و نفسیاتی بھی۔ ایک طرف اجتماعی زندگی ان سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ قدم سے قدم اور شانہ سے شانہ ملا کر کام کریں، دوسری طرف جنسی تقاضے ان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے دامن میں سکون اور اطمینان ڈھونڈیں۔

اجتماعی زندگی ترقی اس وقت کرتی ہے جب کہ دونوں کا سیاسی و سماجی رشتہ ٹھیک ہو اور جنسی تعلق بھی صحیح ہو۔ عورت کی سعی و جہد میں جو خلا رہ جائے اُس کو مرد پُر کرے اور مرد کی دوڑ دھوپ میں جو نقص اور کمی ہو، اس کو عورت پُورا کرے۔ اسی طرح جنسی تعلق کو اپنی فطری حد میں رہنے دیا جائے اور لذت کشی کا ذریعہ نہ سمجھ لیا جائے۔

لیکن اگر مرد اور عورت کے سماجی و معاشرتی رشتوں میں عدمِ توازن اور جنسی تعلقات میں بے اعتدالی ہو تو معاشرہ زوال اور انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔

کیونکہ سماجی رشتوں میں توازن نہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے بعض گوشے خالی اور ویران ہونے لگتے ہیں اور بعض گوشوں پر ضرورت سے زیادہ توجہ صرف ہو جاتی ہے، اور یہ دونوں ہی باتیں معاشرہ کے لیے تباہکن ہوتی ہیں۔ اسی طرح جنسی تعلق میں بے اعتدالی سے سوسائٹی یا تو بے راہ روی کا شکار ہو گی یا تجرد کی طرف مائل ہو گی۔ اب تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ جن قوموں میں جنسی آوارگی عام ہوئی، وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکیں اور تجرد پسندی نے تو کسی تہذیب کو وجود ہی میں آنے نہیں دیا۔

موجودہ تہذیب عورت اور مرد کے درمیان سماجی روابط قائم کرنے میں بھی ناکام ہے اور جنسی مسئلہ حل کرنے میں بھی۔ اس نے عورت اور مرد کا سماجی رشتہ متعین کرنے میں غلطی یہ کی کہ عورت کو اس کے حقیقی مقام سے ہٹا کر مرد کی صف میں کھڑا کر دیا۔ چنانچہ وہ مرد کے دائرہ میں تو تگ و دو کرتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اس میدان سے غائب ہے جس کے لیے فطرت نے اس کی تخلیق کی تھی۔ جنسی جذبات کو موجودہ تہذیب نے اس قدر ابھارا ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر ان کا مکمل غلبہ ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹھوس کاموں سے توجہ ہٹتی جا رہی ہے اور لذت پسندی کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔

موجودہ تمدنی و معاشرتی حالات پر غور و فکر کرنے والا انسان اس اعتراف پر مجبور ہے کہ عورت اور مرد کے غلط رشتہ نے موجودہ تہذیب کی بنیادیں ہلا دی ہیں اور انسان کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا ہے جہاں سکون اور چین کے ہزار سامان کے باوجود وہ ان سے محروم ہے۔

یہ حالات ہیں جن میں اسلامی معاشرہ میں عورت کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ وقت کے سماجی نقشہ میں کوئی پیوندکاری نہیں ہے بلکہ یہ اس دور کے لیے ایک نیا اور مختلف نقشہ ہے، چاہے دنیا اس کو قبول کرے یا نہ کرے۔ لیکن ہمارا یقین ہے کہ صرف اسلامی معاشرہ نے عورت اور مرد کے سماجی و جنسی تعلقات کے لیے

صحیح بنیادیں فراہم کی ہیں، ان بنیادوں پر جو تعلقات استوار کیے جائیں گے وہ کامیاب ہوں گے۔ ان کے علاوہ جس اساس پر بھی یہ تعلقات قائم ہوں گے ان کی ناکامی یقینی ہے۔

جو شخص اسلامی معاشرہ میں عورت کی سیاسی و تمدنی اور تہذیبی و معاشرتی حیثیت سمجھنا چاہے انشاء اللہ وہ اس کتاب میں قابلِ اطمینان حد تک مواد پائے گا۔ کوشش کی گئی ہے کہ جو بات کہی جائے قرآن و حدیث کی روشنی میں کہی جائے اور تحقیق و استناد کے ساتھ کہی جائے۔ کتاب میں بعض مباحث ایسے بھی ہیں جن میں قرآن و حدیث کی واضح تعلیمات نہیں ہیں، ان مباحث میں فقہ و کلام سے مدد لی گئی ہے کیونکہ یہ اس امت کے ان بہترین دماغوں کا حاصل ہے جن کی زندگیاں کتاب و سنت کے رموز و اسرار کے سمجھنے کے لیے وقف تھیں۔ اس لیے بلا مبالغہ یہ علمی سرمایہ اس قابل ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ لیکن اس کا مرتبہ کتاب و سنت کے بعد ہی ہوگا۔ چنانچہ جہاں کوئی خیال قرآن و حدیث کے خلاف نظر آیا ہم نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اس سے اختلاف کیا ہے اور اپنی رائے دلائل کے ساتھ پیش کر دی ہے لیکن خود ہماری رائے پر جرح و تنقید کی بہرحال گنجائش ہے، قلم سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ دل ہر علمی تنقید کے استقبال کے لیے کھلا ہوا ہے۔

جلال الدین

۳۰ جنوری ۱۹۶۰ء

عورت دَورِ قدیم میں

اس وقت زمین کے مختلف حصّوں پر تقریباً تین ارب انسان پائے جاتے ہیں۔ اُن کی صدہا زبانیں ہیں۔ ان کے رہنے سہنے، کھانے پینے، شادی بیاہ اور خوشی اور غم کے بے شمار طریقے ہیں۔ سائنس دانوں کے اندازہ کے مطابق نوعِ انسانی کی عمر دو لاکھ سال سے زاید ہے۔ اس لمبی مدت میں انسان کو کن حالات و مسائل کا سامنا کرنا پڑا، موجودہ حالت تک کن مراحل سے گذر کر اس نے رسائی حاصل کی، کہاں کہاں اس کی آبادیاں تھیں وہ کتنی قوموں اور قبیلوں میں بٹا ہوا تھا، اس نے کب کس قسم کی صنعت ایجاد کی، کیا اس نے وحشت و بربریت سے تہذیب و تمدن کی طرف ترقی کی یا اس سے پہلے بھی وہ ترقی کے ادوار دیکھ چکا ہے؟ یہ اور اس طرح کے جتنے سوالات ہیں ان کے بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ انسان اپنے ماضی سے بہت ہی کم واقف ہے۔ اتنا، جتنا کہ کوئی ستّر سالہ بوڑھا اپنی زندگی کے صرف ایک سال کو جانے۔ لیکن اس کے باوجود اتنی بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انسان کے سفر کا آغاز عورت اور مرد کے اتحاد سے ہوا۔ اسی سے اس کی نسل بھی پھیلی۔ اور علم و فن، صنعت و حرفت اور تہذیب و تمدن میں بھی ارتقاء ہوا۔

عورت اور مرد کے اتحاد کے علاوہ انسانوں کے درمیان جتنے رشتے اور تعلقات ہیں وہ یا تو اسی اتحاد کا نتیجہ ہیں یا خارجی اسباب و حالات نے ان کو

پیدا کیا ہے۔ اگر یہ اسباب و حالات مفقود ہوں تو یہ تعلقات بھی وجود میں نہیں آ سکتے۔

ایک ہمسایہ دوسرے ہمسایہ سے محبت کرتا ہے، ایک ساتھی دوسرے ساتھی کو گلے سے لگاتا ہے، ایک مسافر دوسرے مسافر کا ہم خیال ہوتا ہے، اسی طرح ایک طالب علم دوسرے طالب علم سے، ایک تاجر دوسرے تاجر سے، ایک پیشہ والا دوسرے ہم پیشہ شخص سے قرب اور یگانگت محسوس کرتا ہے۔ لیکن جب دونوں کی حیثیت بدل جاتی ہے تو ان میں دوری اور اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس عورت اور مرد کے اتحاد کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ بعض نوعی خصوصیات یا تمدنی ضروریات کی بنا پر وہ ایک ساتھ رہنے اور مل جل کر کام کرنے لگے ہوں، بلکہ ان کا تعلق اس فطری جذب و کشش کا ظہور ہے جو ان کو جڑے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس لیے وہ بغیر کسی خارجی محرک کے ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہیں، حالانکہ ان کی دلچسپیاں مختلف اور ان کے کام کے دائرے الگ الگ ہیں۔

عورت اپنے خون کے ذریعہ نسلِ انسانی کی پرورش تو کر سکتی ہے لیکن پال چلا کر اپنی معاش کا فراہم کرنا اور تیر و تفنگ سے دشمن کا مقابلہ کرنا اس کے لیے دشوار ہے۔ کیونکہ قدرت نے اس کو آہنی پنجہ اور قوی بازو نہیں عطا کیے ہیں البتہ وہ اپنے سینہ میں مہر و الفت اور ہمدردی و ایثار کے جذبات رکھتی ہے۔ چنانچہ ہمیشہ بچوں کی دیکھ بھال، گھر کا انتظام، کھانے اور کپڑے کی تیاری عورت کے فرائض رہے ہیں۔ اور جانوروں کا شکار، زراعت اور تجارت اور دشمن کی مدافعت مرد کی رہی ہے۔ کیونکہ وہ جفاکش اور محنتی ہے اور مضبوط دست و بازو رکھتا ہے۔

لیکن عورت اور مرد کی قوتوں اور صلاحیتوں کا یہ فرق تاریخ کے بیشتر ادوار میں عزت اور ذلت کا معیار بن گیا۔ مرد زور اور قوت رکھتا ہے اور ایسے کام بآسانی کر گزرتا ہے جن کو عورت اپنی حدِ استطاعت سے باہر سمجھتی ہے، اس

لیے اس کو ارفع و اعلیٰ سمجھ لیا گیا اور اس کے مقابلہ میں عورت کی حیثیت فروتر قرار پائی کیونکہ وہ کمزور ہے اور بہت سے معاملات میں وہ مرد کی دست نگر ہے، چنانچہ جو ممالک اپنے عدل و انصاف میں مشہور تھے، جہاں شب و روز اخلاق کے درس دیئے جاتے تھے اور انسانی حقوق کی تعلیم ہوتی تھی وہاں بھی مرد کی برتری ایک مسلمہ حقیقت تھی، اور عورت کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کو جانوروں کی طرح خریدا اور بیچا جاتا تھا حتیٰ کہ بعض اوقات اس کو ان حقوق سے بھی محروم رکھا گیا جن سے اس زمان پر سانس لینے والا ہر متنفس بہرہ مند ہے۔

یونان و روم اور عورت

قدیم تاریخ کے متعلق کسی قدر مفصل اور مستند معلومات ہمیں یونانیوں اور رومیوں کے عہد سے ملتی ہیں۔ انہوں نے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں اس قدر ترقی کی کہ اس کی بنیاد پر بہت سی تہذیبیں اور بہت سے علوم وجود میں آگئے۔ لیکن بایں ہمہ ترقی ان کے ہاں عورت کا مقام بہت ہی پست تھا۔ وہ اس کو انسانیت پر بار سمجھتے تھے۔ اس کا مقصد ان کے نزدیک سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ خادمہ کی طرح گھر والوں کی خدمت کرتی رہے۔

اہل یونان اپنی معقولیت پسندی کے باوجود عورت کے بارے میں ایسے ایسے تصورات رکھتے تھے جن کو سن کر ہنسی آتی ہے لیکن ان سے اس بات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ان کی نگاہ میں عورت کی کیا قدر و قیمت تھی اور وہ اپنے درمیان اس کو کیا حیثیت دیتے تھے۔ ان کا قول تھا: "آگ سے جل جانے اور سانپ کے ڈسنے کا علاج ممکن ہے، لیکن عورت کے شر کا مداوا محال ہے۔" پنڈورا نامی ایک عورت کی بابت ان کا عام اعتقاد تھا کہ وہی تمام دنیوی آفات و مصائب کی جڑ ہے۔ ایک یونانی ادیب کہتا ہے "دو مواقع پر عورت، مرد کے لیے باعث مسرت ہوتی ہے۔ ایک تو شادی کے دن،

دوسرے اس کے انتقال کے دن۔

لیکی نے اپنی کتاب تاریخ اخلاق یورپ میں لکھا ہے:۔

"بہ حیثیت مجموعی باعصمت یونانی بیوی کا مرتبہ بہ غایت پست تھا، اس کی زندگی مدۃ العمر غلامی میں بسر ہوتی تھی۔ لڑکپن میں اپنے والدین کی، جوانی میں اپنے شوہر کی، بیوگی میں اپنے فرزندوں کی وراثت میں، اس کے مقابلہ میں اس کے مرد اعزہ کا حق ہمیشہ راجح سمجھا جاتا تھا۔ طلاق کا حق اسے قانوناً ضرور حاصل تھا تاہم عملاً وہ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی کیونکہ عدالت میں اس کا اظہار یونانی ناموس وحیا کے منافی تھا...... افلاطون نے بے شبہ مرد اور عورت کی مساوات کا دعویٰ کیا تھا لیکن یہ تعلیم محض زبانی تھی۔ عملی زندگی اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔ ازدواج کا مقصد خالص سیاسی رکھا گیا۔ یعنی یہ کہ اس سے طاقتور اولاد پیدا ہو جو حفاظتِ ملک کے کام آئے اور اسپارٹا کے قانون میں تو یہ تصریح موجود تھی کہ کمسن وضعیف القویٰ شوہروں کو اپنی کمسن بیویاں کسی نوجوان کے حبالۂ عقد میں دے دینا چاہئے تاکہ فوج میں قوی سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ ہو"

اسی مصنف کی زبان سے رومی عورت کا حال سنیئے:۔

"عورت کا مرتبہ رومی قانون نے ایک عرصہ دراز تک نہایت پست رکھا افسر خاندان جو باپ ہوتا یا شوہر، اسے اپنے بیوی بچوں پر پورا اختیار حاصل تھا اور وہ عورت کو جب چاہے گھر سے نکال سکتا تھا۔ جہیز یا دلہن کے والد کو نذرانہ دینے کی رسم کچھ بھی نہ تھی اور باپ کو اس قدر اختیار حاصل تھا کہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کو بیاہ دے، بلکہ بعض دفعہ تو وہ کی کرائی شادی کو توڑ سکتا تھا۔ زمانہ مابعد یعنی دور تاریخی میں یہ حق باپ کی طرف سے شوہر کی طرف منتقل ہوگیا اور اب اس کے اختیارات یہاں تک وسیع ہوگئے کہ وہ چاہے تو بیوی کو قتل کرسکتا تھا۔ ۵۲۰ سال تک طلاق کا کسی نے نام بھی نہ سنا"

غلاموں کی طرح عورت کا مقصد بھی خدمت اور چاکری سمجھا جاتا تھا۔ مرد اسی

غرض سے شادی کرتا تھا کہ وہ بیوی سے فائدہ اٹھا سکے گا۔ وہ کسی عہدہ کی اہل نہیں سمجھی جاتی تھی حتیٰ کہ کسی معاملہ میں اس کی گواہی تک کا اعتبار نہیں تھا۔ رومی سلطنت میں اس کو قانونی طور پر کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ البتہ اس کی طبعی کمزوریوں کی بنا پر اس کو بعض سہولتیں دی گئی تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعد کے ادوار میں رومیوں نے اس کو حقوق بھی دیے لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کو مرد کے مساوی درجہ کبھی نہیں ملا[1]

عرب اور عورت

تہذیب و تمدن کے ان مراکز میں جب اس صنف نازک کی مظلومیت اور بیچارگی کا یہ حال تھا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تمدن نا آشنا عرب میں وہ کس درجہ بے کس و بے بس رہی ہوگی۔

اہل عرب عورت کے وجود کو موجب ذلت و عار سمجھتے تھے۔ لڑکی کی پیدائش ان کے لیے غم و اندوہ کا پیام تھی۔ وہ نرینہ اولاد پر اتراتے اور فخر کرتے لیکن لڑکیوں کا وجود ان کے سر عظمت کو جھکا دیتا۔ قرآن مجید نے ان کے ان جذبات کی کتنی صحیح تصویر کشی کی ہے :-

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ

(النحل - ۵۸)

"جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ

---

[1] روم کے مختلف ادوار میں عورت کے سماجی و معاشرتی حالات کیا تھے۔ اور ان میں بتدریج کیسے اصلاح ہوئی؟ اس کی تفصیل انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں دیکھی جائے۔

پڑ جاتا ہے اور وہ غم سے گھٹنے لگتا ہے۔ اس خبر کو وہ اس حد تک بُرا سمجھتا ہے کہ اپنے آپ کو اپنی قوم سے چھپائے پھرتا ہے (اور سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ) آیا ذلت برداشت کرتے ہوئے اس کو باقی رکھے یا زیر زمین دفن کر دے"

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:۔

وَاللّٰہُ ان کنا فی الجاھلیۃ ما نعد للنساء امرا حتی انزل اللہ فیھن ما انزل وقسم لھن ما قسم[۱]۔

"قسم بخدا ہم دورِ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی حیثیت ہی نہیں دیتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اپنی ہدایات نازل کیں اور ان کے لیے جو کچھ حصہ مقرر کرنا تھا مقرر کیا"

عورت سے نفرت اور بیزاری اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ایک شخص کے گھر لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے اس گھر ہی کو منحوس سمجھ کر چھوڑ دیا[۲] اس سے بھی آگے کی بات یہ کہ عورت کے لیے ان کے اندر رحم و محبت کے جذبات ناپید تھے چنانچہ وہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس شقاوت قلب کا مظاہرہ ان افراد کی طرف سے ہوتا تھا جن کو شفقت و محبت کا سرچشمہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض ایسے اندوہناک واقعات منقول ہیں کہ انہیں سن ہی کر دل کانپ جاتا ہے۔

ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے جاہلیت کے زمانہ کا واقعہ سنایا کہ میرے ایک بچی تھی اور وہ مجھ سے بہت مانوس بھی تھی۔ جب کبھی میں اسے بلاتا تو بڑی مسرت سے میرے پاس آجاتی۔ چنانچہ ایک دن میں نے

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الطلاق۔

[۲] تفسیر کبیر، جلد ۷، صفحہ ۴۳۵۔

اسے آواز دی تو وہ میرے پیچھے پیچھے دوڑی چلی آئی میں اسے اپنے ساتھ لے گیا اور قریب کے ایک کنوئیں میں جھونک دیا اور وہ اس وقت بھی ابا جان ابا جان ہی کہتی رہی۔" واقعہ کو سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں یہاں تک کہ ریش مبارک تر ہو گئی۔[1]

اس سے زیادہ مظلومیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ باپ کا دستِ شفقت اس کے حق میں بھیڑیے کا پنجہ ثابت ہو۔

قیس بن عاصم نے جاہلیت میں آٹھ دس لڑکیاں دفن کی تھیں۔[2]

اس مظلوم صنف کو وہ زندہ بھی رکھتے تو اس سے تمام حقوقِ زندگی سلب کر لیتے تھے۔ شادی کی کوئی حد نہیں تھی۔ جتنی عورتوں کو چاہتے اپنے نکاح میں رکھتے۔ وہب اسدی رض نے جس وقت اسلام قبول کیا تو ان کے عقد میں دس بیویاں تھیں۔[3] غیلان ثقفی مسلمان ہوئے تو ان کے پاس دس بیویاں تھیں۔[4]

اسی طرح طلاق پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ مرد جب چاہتا اور جتنی مرتبہ چاہتا طلاق دیتا اور عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتا۔[5] اس طرح وہ زندگی بھر اپنی بیوی کو دق کر سکتا تھا۔ ایک شخص کے متعلق روایت آتی ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو پریشان کرنا چاہا تو اس سے کہا کہ میں نہ تو تجھے اپنے ساتھ رکھوں گا اور نہ جدا کروں گا۔ بیوی نے دریافت کیا وہ کیسے؟ کہا اس طرح کہ طلاق دوں گا اور جب عدت ختم ہونے لگے گی رجوع کر لوں گا، پھر دوبارہ

---

[1] سنن دارمی، باب ما کان علیہ الناس قبل بعثۃ النبی ﷺ الخ۔

[2] تفسیر ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۴۷۸، ۴۷۷۔

[3] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی من اسلم وعندہٗ نساء اکثر من اربع۔

[4] ترمذی، ابواب النکاح، باب ما جاء فی الرجل یسلم وعندہٗ عشر نسوۃ۔

[5] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی نسخ المراجعۃ بعد التطلیقات الثلاث۔

طلاق دوں گا اور پھر عدت کا زمانہ پورا ہونے سے پہلے رجوع کرلوں گا[1]

جب تک خاوند زندہ رہتا وہ اس کے ماتحت رہتی خاوند کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء کا اس پر مکمل حق ہوتا، چاہتے تو خود ہی اس سے شادی کرلیتے اور چاہتے تو کسی دوسرے سے شادی کردیتے، اور وہ اس میں بھی آزاد تھے کہ اس کی شادی ہی نہ ہونے دیں[2]

بیوہ کے مال پر قبضہ کرنے کے لیے اسے دوبارہ ازدواجی زندگی ہی سے محروم کردیتے، بعض اوقات کسی کم سن لڑکے کے بڑے ہونے تک اس کا نکاح روکے رکھتے تاکہ وہ اس سے شادی کرسکے[3]

سوتیلی ماں تک سے شادی کرنا ان کے نزدیک معیوب نہیں تھا۔ علامہ ابوبکر جصاص لکھتے ہیں:

وقد کان نکاح امرأۃ الاب مستفیضا شائعا فی الجاھلیۃ[4]

"سوتیلی ماں سے نکاح جاہلیت میں عام تھا"

اگر اتفاق سے کوئی حسین وجمیل اور صاحب ثروت یتیم لڑکی کسی شخص کی

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۲۸۰۔ اس حدیث کے راوی یعقوب بن حمید کے بارے میں امام ذہبی فرماتے ہیں "منتفرغیر واحد" لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان سے امام بخاری نے اپنی کتاب "افعال العباد" میں احادیث لی ہیں۔ اور ابن ماجہ اور دیگر محدثین نے بھی ان کی روایات کو قبول کیا ہے۔ لسان المیزان جلد ۲

[2] بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ النساء باب قولہ لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرہا۔ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب قولہ لا یحل لکم ان ترثوا النساء۔

[3] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۴۶۵۔

[4] احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۲۸۔

سرپرستی میں آجاتی تو خود ہی اس سے نکاح کر لیتا اور مہر بھی ٹھیک سے ادا نہ کرتا[1]

وراثت میں عورت کا کوئی حصہ نہیں تھا[2] جنگ اُحد کے بعد کا واقعہ ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر شکایت کی کہ جنگ احد میں ثابت شہید ہو گئے ان کی دو بچیاں ہیں۔ لیکن ثابت کے بھائی نے ان کے پورے مال پر قبضہ کر لیا ہے اور ان بچیوں کے لیے ایک حبہ نہیں چھوڑا ہے۔ بتائیے ان کی شادی کیسے ہو؟[3]

اسلام نے وراثت میں عورت کا حصہ متعین کیا تو اہل عرب کو بڑا تعجب ہوا اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ! کیا عورت آدھی میراث کی حق دار ہے جو نہ گھوڑے پر سوار ہو سکتی ہے نہ دفاع کر سکتی ہے؟[4]

یورپ اور عورت

یورپ اس وقت مساوات مرد و زن کا، سب سے بڑا دعویدار ہے۔ لیکن اسی یورپ میں ایک صدی سے کچھ پہلے تک عورت، مرد کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی اور کوئی ایسا مضبوط قانون نہیں تھا جو مرد کی زیادتیوں کو روکتا۔ انگلستان کے قانون کی رو سے یہ بات طے تھی کہ شادی کے بعد مرد کی طبیعت میں تو کوئی تبدیلی نہیں آتی البتہ عورت کی شخصیت مرد کی شخصیت کا ایک جزء بن جاتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ اصول تھا کہ شادی سے پہلے عورت

---

[1] بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ النساء

[2] بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ النساء، باب ولکم نصف ما ترک ازواجکم۔

[3] ترمذی، ابو داؤد، کتاب الفرائض۔ باب ما جاء فی میراث الصلب۔

[4] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۴۵۸۔

کے ذمہ جو قرض ہو گا وہ مرد ادا کرے گا اور عورت کی جو مال و دولت یا جائیداد ہو گی وہ مرد کی ہو جائے گی الّا یہ کہ اپنی جائیداد کے سلسلہ میں عورت شادی سے پہلے کوئی معاہدہ کر لے۔

نان و نفقہ کا بھی کوئی مناسب قانون نہیں تھا اور نہ عورت کو مرد کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا حق تھا۔ مرد چاہتا تو عورت کو حق وراثت سے محروم کر سکتا تھا۔ لیکن بیوی کی جائیداد کا وہ جائز حق دار سمجھا جاتا تھا۔

عورت کسی قسم کا بھی معاملہ کرنے میں آزاد نہیں تھی۔ وہ اپنے اختیار سے کوئی معاہدہ نہیں کر سکتی تھی حتیٰ کہ اس کو اس کی بھی اجازت نہیں تھی کہ خود کما کر اپنی ذات پر خرچ کرے اور نہ اپنی پسند سے شادی کرے۔

لڑکیاں ماں باپ کی ملک سمجھی جاتی تھیں وہ جس سے چاہتے شادی کرتے۔ شادی ایک تجارت تھی جس کے ذریعہ والدین اپنی لڑکیاں لڑکوں کو فروخت کرتے تھے۔

آزادیٔ نسواں کا مشہور علمبردار مل اپنی کتاب "محکومیت نسواں" میں لکھتا ہے۔

"تاریخ یورپ کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ باپ اپنی بیٹی کو جہاں چاہتا بیچ ڈالتا تھا اور اس کی مرضی کی کچھ پرواہ نہ کرتا تھا۔"

"دینِ مسیح کے پھیلنے سے پیشتر مرد مالک الکل کی حیثیت رکھتا تھا۔ عورت کے مقابلہ میں مرد کے لیے نہ کوئی تعزیر تھی نہ کوئی قانون۔ مرد جب چاہتا عورت کو چھوڑ دیتا لیکن عورت کو کسی حالت میں مرد سے علیحدگی کا اختیار نہ تھا۔ انگلستان کے پرانے قوانین میں مرد کو عورت کا مالک کہا جاتا ہے بلکہ حقیقتاً وہ اس کا بادشاہ مانا جاتا تھا یہاں تک کہ شوہر کے قتل کا اقدام قانونی اصطلاح میں بغاوتِ ادنیٰ کہلاتا تھا اور عورت اس کا ارتکاب کرے تو اس کی پاداش میں اس کو جلا دینے کا حکم تھا جو بغاوت کی سزا سے بھی زیادہ ہے اور اب تک انگریزی قوانین میں

بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں عورت گویا مرد کی زر خرید مانی جاتی ہے۔ اب بھی گرجا میں نکاح کے وقت اس سے تمام عمر شوہر کی اطاعت کا عہد لیا جاتا ہے اور عمر بھر قانون کی رو سے وہ اپنا عہد پورا کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ شوہر کی مرضی کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتی اگر چاہے بھی تو اپنے لیے کوئی جائیداد نہیں پیدا کر سکتی اور اگر پیدا کرتی ہے تو وہ سب خود بخود شوہر کی ہو جاتی ہے۔ اس بارہ میں انگلستان کا قانون، عورت کی حیثیت اتنی بھی نہیں باقی رہنے دیتا جو اکثر ممالک میں غلاموں کی تھی۔"

عورت مذہب کی نظر میں

یونان ہو یا روم، عرب ہو یا عجم، یورپ ہو یا ایشیا ہر جگہ عورت مظلوم ہی رہی ہے۔ اس کی پوری تاریخ مظلومیت کی داستان ہے۔ حد یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں خدا کی طرف سے نیکی و شرافت، سیرت و کردار اور عفت و عصمت کی جو تعلیم آتی رہی ہے رفتہ رفتہ اس کا مطلب بھی یہ سمجھا جانے لگا کہ عورت سے تعلق نہ رکھا جائے اس سے کنارہ کشی اور دوری اختیار کی جائے۔ کیونکہ اس سے ربط و تعلق انسان کو معصیت اور گناہ سے قریب کرتا ہے۔

زمانہ کی رفتار کے ساتھ جیسے جیسے یہ تصور بڑھتا گیا عورت سے نفرت اور بیزاری میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کو شیطان کی ایجنٹ اور معصیت کا دروازہ کہا گیا۔ اس سے تعلق کو منافیٔ تقویٰ، اور اس سے احتراز کو خدا ترسی کی دلیل سمجھ لیا گیا۔

ان تصورات کا اثر لازماً عورت کی اجتماعی و معاشرتی زندگی پر بھی پڑا۔ اس کو سوسائٹی میں عزت و سربلندی کا وہ مرتبہ نہیں مل سکا جو مرد کو حاصل تھا۔ اس کے وہ حقوق نہیں رہے جو مرد کے تھے۔ اس کی حیثیت ایک ایسے گناہ گار اور مجرم کی تھی جسے حقارت اور ذلت سے دیکھا جاتا ہے۔

یہودیت اور عورت

یہودیت کا شمار دنیا کے ان مذاہب میں ہوتا ہے جنہوں نے صرف چند عقائد و نظریات ہی نہیں پیش کیے بلکہ ان کی بنیاد پر زندگی کے عملی مسائل سے بھی تفصیلی بحث کی ہے۔ ایسے ایک مذہب سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ عورت کے بارے میں حقیقت پسندانہ خیالات کا اظہار کرے گا لیکن وہ ہمارے سامنے یہ تصور لاتا ہے کہ مرد نیک سرشت اور نیک کردار ہے اور عورت بد طینت اور مکار۔ نسل انسانی کے پہلے فرد حضرت آدمؑ جنت میں عیش و راحت کی زندگی گزار رہے تھے کیونکہ وہ خدا کے فرمانبردار تھے لیکن ان کی بیوی حوا نے انہیں سب سے پہلے خدا کی نافرمانی پر اکسایا اور ان کو ایک ایسا پھل کھلایا جس کے کھانے سے خدا نے انہیں روکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی نعمتوں سے محروم کر دیئے گئے اور ان کو مشقت اور تکلیف کی زندگی نصیب ہوئی۔

عہد نامہ قدیم میں ہے کہ جب خدائے تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے دریافت کیا: "کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟" تو آدم نے جواب دیا کہ "جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا۔"

تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حوا سے کہا:۔

"میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی۔ اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔"

(پیدائش باب ۳)۔

دوسرے الفاظ میں حوا نے آدمؑ کو گمراہ کر کے جس جرم کا ارتکاب کیا تھا خدا کی طرف سے اس جرم کی یہ سزا ملی کہ وہ حمل اور ولادت کی تکلیف میں مبتلا کی گئی اور ہمیشہ کے لیے اس پر مرد کا اقتدار اور غلبہ قائم کر دیا گیا۔ اب قیامت تک مرد عورت پر حکومت کرتا رہے گا۔ اسی فلسفہ کا نتیجہ ہے کہ یہودی شریعت میں مرد کا اقتدار و تصرف اس

حد تک بڑھا ہوا ہے کہ "اگر کوئی عورت خداوند کی منت مانے اور اپنی نوجوانی کے دنوں میں اپنے باپ کے گھر ہوتے ہوئے اپنے اوپر کوئی فرض ٹھہرائے اور اس کا باپ جس دن یہ سنے اسی دن اسے منع کرے تو اس کی کوئی منت یا کوئی فرض جو اس نے اپنے اوپر ٹھہرایا ہے قائم نہیں رہے گا اور خداوند اس عورت کو معذور رکھے گا۔ کیونکہ اس کے باپ نے اسے اجازت نہیں دی۔ اور اگر کسی آدمی سے اس کی نسبت ہو جائے حالانکہ اس کی منتیں یا منہ کی نکلی ہوئی بات جو اس نے اپنے اوپر فرض ٹھہرائی ہے اب تک پوری نہ ہوئی ہو اور اس کا آدمی یہ حال سن کر اس دن اس سے کچھ نہ کہے تو اس کی منتیں قائم رہیں گی لیکن اگر اس کا آدمی جس دن یہ سب سنے اسی دن اسے منع کرے تو اس نے گویا اس عورت کی منت کو اور اس کے منہ کی نکلی ہوئی بات کو، جو اس نے اپنے اوپر فرض ٹھہرائی تھی توڑ دیا اور خداوند اس عورت کو معذور رکھے گا۔ اگر اس نے اپنے شوہر کے گھر ہوتے ہوئے کچھ منت مانی یا قسم کھا کر اپنے اوپر فرض ٹھہرایا ہو اور اس کے شوہر نے جس دن یہ سب سنا اسی دن اسے باطل ٹھہرایا ہو اور اس کے شوہر نے ان کو توڑ ڈالا ہے اور خداوند اس عورت کو معذور رکھے گا۔ اس کی ہر منت کو اور اپنی جان کو دکھ دینے کی ہر قسم کو اس کا شوہر چاہے تو قائم رکھے یا اگر چاہے تو باطل ٹھہرائے۔ شوہر اور بیوی کے درمیان اور باپ بیٹی کے درمیان جب بیٹی نوجوانی کے ایام میں باپ کے گھر ہو۔ ان ہی آئین کا حکم خداوند نے موسیٰ کو دیا" گنتی باب ۳۰۔

حتیٰ کہ یہودی قانون کی رو سے مرد وارث کی موجودگی میں عورت وراثت سے محروم ہو جاتی تھی۔ اسی طرح عورت کو دوسری شادی کا بھی حق نہیں تھا (انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا)

عیسائیت اور عورت

عورت کے ساتھ عیسائیت کی روش تو اور بھی زیادہ ناپسندیدہ رہی ہے۔ اس نے اس مظلوم صنف کو جس قدر پستی میں پھینکا جا سکتا تھا پھینک دیا۔ عورت

کے بارے میں عیسائیت کے جذبات کا اندازہ طرطولین کے ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔

"عورتو! تم نہیں جانتیں کہ تم میں سے ہر ایک حوا ہے۔ خدا کا فتویٰ جو تمہاری جنس پر تھا وہ اب بھی تم میں موجود ہو تو پھر جرم بھی تم میں موجود ہوگا۔ تم تو شیطان کا دروازہ ہو۔ تم ہی نے آسانی سے خدا کی تصویر یعنی مرد کو ضائع کیا۔"

سینٹ پال اپنے ایک خط میں لکھتا ہے۔

"عورت کو چپ چاپ کمال تابعداری سے سیکھنا چاہیئے اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے یا مرد پر حکم چلائے بلکہ چپ چاپ رہے۔ کیونکہ پہلے آدم بنایا گیا اس کے بعد حوا اور آدم نے فریب نہیں کھایا بلکہ عورت فریب کھا کر گناہ میں پڑ گئی" (تیمتھس کے نام پولس کا پہلا خط ب ۲)۔

ایک دوسرے خط میں لکھا ہے :-

"پس میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہر مرد کا سر مسیح اور عورت کا سر مرد اور مسیح کا سر خدا ہے۔ وہ (مرد) خدا کی صورت اور اس کا جلال ہے مگر عورت مرد کا جلال ہے، اس لیے کہ مرد عورت سے نہیں بلکہ عورت مرد سے ہے اور مرد عورت کے لیے نہیں بلکہ عورت مرد کے لیے پیدا ہوئی۔ پس فرشتوں کے سبب سے عورت کو چاہیے کہ اپنے سر پر محکوم ہونے کی علامت رکھے۔" (پولس رسول کا پہلا خط کرنتھیوں کے نام ب ۱۱)

ہندومت اور عورت[1]

ہندوستان ایک مذہبی ملک سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کی مذہبی حیثیت ہمیشہ دوسری حیثیتوں پر غالب رہی ہے۔ یہاں بھی عورت کو غلامی اور محکومی کی زندگی

---

[1] ہندو مذہب کے بارے میں یہ معلومات مولانا اکبر شاہ خان صاحب نجیب آبادی کی کتاب نظام سلطنت سے ماخوذ ہیں۔

سے نجات نہیں ملی۔ ہندوستان کے مشہور مقنن منو راج نے عورت کے بارے میں کہا ہے کہ:۔

"عورت لڑکپن میں اپنے باپ کے اختیار میں رہے اور جوانی میں شوہر کے اختیار میں اور بیوہ ہونے کے بعد اپنے بیٹوں کے اختیار میں رہے، خود مختار ہو کر کبھی نہ رہے" منو سمرتی $\frac{۵}{۱۳۸}$

"عورت خواہ نابالغ ہو خواہ جوان ہو خواہ بوڑھی، گھر میں کوئی کام...... خود مختاری سے نہ کرے" منو سمرتی $\frac{۵}{۱۴۷}$

"عورت کے لیے قربانی اور برت کرنا گناہ ہے، صرف شوہر کی خدمت کرنا چاہیے، عورت کو چاہیے کہ اپنے شوہر کے مرنے کے بعد دوسرے شوہر کا نام بھی نہ لیوے، اکم خوراکی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن پورے کرے۔" ۱۵۵، ۱۵۷، ب۵۔

"جھوٹ بولنا عورتوں کا ذاتی خاصہ ہے" ب $\frac{۹}{۱۲}$

چانکیہ برہمن جس نے منوجی مہاراج کی منو سمرتی کو حشو و زوائد سے پاک کیا، اور جس کی تعلیمات ایک عرصہ تک حکومت کا دستور العمل رہیں وہ عورت کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

"دریا، مسلح سپاہی، پنجے اور سینگ رکھنے والے جانور، بادشاہ اور عورت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے" چانک نیتی ب $\frac{۱}{۱۵}$

"جھوٹ بولنا، بغیر سوچے کام کرنا، فریب، حماقت، طمع، ناپاکی، بے رحمی یہ عورت کے جبلی عیب ہیں" ب $\frac{۲}{}$

"شہزادوں سے تہذیب اخلاق، عالموں سے شیریں کلامی، قمار بازوں سے دروغ گوئی اور عورتوں سے مکاری سیکھنی چاہیئے" ب $\frac{۱۲}{۱۸}$

"آگ، پانی، جاہل مطلق، سانپ، خاندان شاہی اور عورت یہ سب موجب ہلاکت ہوتے ہیں ان سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیئے" ب $\frac{۱۴}{۱۴}$

"دوست، خدمت گار اور عورت مفلس آدمی کو چھوڑ دیتے ہیں، اور جب وہ دولت مند ہو جاتا ہے تو پھر اس کے پاس آجاتے ہیں۔" ؎۱

ہندوستان میں ستی کا رواج خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہاں عورت کا کوئی مستقل وجود نہیں سمجھا جاتا تھا اور خاوند کی موت کے ساتھ اس سے بھی زندگی کا حق چھین لیا جاتا تھا۔

ہندو مذہب ہو یا یہودیت وعیسائیت یا دنیا کا اور کوئی مذہب، ان کے مرکز دنیا کے وہ علاقے رہے ہیں جو تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی بڑھے ہوئے تھے اور ہیں۔ ایک حقیقت ہے کہ ایسے تمام علاقوں میں اقتدار و قیادت ہمیشہ مرد ہی کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ مرد نے ان مذاہب میں ایسی تحریفات کی ہیں جن کی بنا پر عورت کے ساتھ ہر طرح کی چیرہ دستی اس کے لیے جائز ہو جائے اور ہر ظلم و زیادتی کے لیے اس کو خدائی سند مل جائے۔ ورنہ خدائے تعالیٰ عدل و انصاف کا سرچشمہ ہے، اس کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کبھی ظلم اور ناانصافی کا بھی حکم دے سکتا ہے۔

عورت اور جدید نظریات

ظلم کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ عورت ایک طویل عرصے سے مظلوم چلی آرہی تھی، جب اس کی مظلومیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو اس کے نتائج بھی انتہائی گھناؤنی شکل میں نمودار ہونے لگے۔ دورِ جدید میں جہاں زندگی کے بہت سے میدانوں میں انقلاب آیا وہاں عورت کی سماجی حیثیت بھی بدل گئی۔ کل تک اس کو ذلیل و خوار سمجھا جاتا تھا لیکن آج وہ عزت و سربلندی کی دعویدار ہے۔ ایک وقت تھا جب کہ مرد اس کو اس کا صحیح مقام دینے تک کے لیے تیار نہ تھا لیکن جیسے ہی موقع ملا وہ اپنی اصل پوزیشن سے آگے بڑھ گئی اور مزید بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ اس پر زندگی کے وہ دن بھی گزرے جب کہ وہ گھر کے چھوٹے سے دائرہ میں آزاد نہیں تھی اور آج اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ کوئی گھر کے اندر ہے اور نہ گھر کے باہر۔

عورت کو آزادی کے اس مرحلے تک پہنچانے میں تاریخی طور پر وقت کے حالات نے بھی ساتھ دیا، جس وقت وہ مرد کے پنجۂ ستم سے رہائی کے لیے کوشاں تھی اس وقت مغرب میں بڑی تیزی سے صنعتی انقلاب آرہا تھا۔ اس انقلاب نے عورت کی جدوجہد آزادی کو کامیابی کی راہ پر لگا دیا۔ وہ اس سے پہلے گھر (جو اس کا دائرہ کار سمجھا جاتا تھا) سے بغاوت کرنا چاہتی بھی تو اسے نہیں معلوم تھا کہ گھر سے باہر وہ کیا کرے گی اور زندگی کے کس نقشے کو اختیار کرے گی۔ اس انقلاب نے اس کے سامنے گھر سے باہر کے لیے ایک ایسا نقشہ پیش کیا جو

خانگی زندگی سے زیادہ حسین تھا اور جس کے ذریعہ وہ غلامی کی زنجیر کو توڑ سکتی تھی۔ اس نئے نقشے کو پاکر وہ، جو کبھی ماں باپ اور شوہر کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتی تھی ان سے بغاوت پر آمادہ ہوگئی کیونکہ اب وہ کسی معاملے میں ان کی دست نگر نہیں تھی۔ اس کے لیے ہر طرف رزق کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

اس بغاوت کے پیچھے عورت کے اندر اپنی حالت کی اصلاح سے زیادہ مرد کی بندشوں سے آزادی اور اس سے انتقام کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے اس نظام کو توڑنا شروع کیا جو اس کو، مرد کے تابع اور ماتحت رکھتا تھا۔ حالانکہ یہ نظام بالکلیہ قابل رد نہیں تھا۔ اس میں گو بعض خامیاں گھس آئی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اندر بہت سے صالح اور مفید اجزا بھی رکھتا تھا۔ لہٰذا اس نظام کی شکست و ریخت کی نہیں بلکہ اصلاح کی ضرورت تھی۔ لیکن کسی نظریہ و مسلک کے خلاف ردِ عمل ہمیشہ اپنی انتہا کو پہنچ کر رہتا ہے۔ چنانچہ مرد کی چیرہ دستی اور ظلم کے خلاف نفرت اور غم و غصہ کے شدید جذبات نے آزادیٔ نسواں کی تحریک کو بھی اپنی حد کے اندر رہنے نہیں دیا اور اس نے عورت کو وہاں پہنچا دیا جہاں عورت، عورت نہیں رہتی بلکہ مرد کا روپ دھار لیتی ہے۔ حالانکہ یہ ایک مصنوعی لبادہ ہے جو اس نے اوڑھ رکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ نہ عورت مرد بن سکتی ہے، اور نہ مرد کو عورت کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ صلاحیتوں اور قوتوں کے مالک ہیں۔ ایک ہی مقام، ایک ہی آب و ہوا اور ایک ہی ماحول میں پرورش پانے والے مرد اور عورت طبعی اور نفسیاتی طور پر باہم اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے دو ہم جنس افراد اتنے مختلف نہیں ہو سکتے۔ دو مردوں کے درمیان مزاج اور رجحانِ طبع کے ہزار اختلاف کے باوجود اتنی متحد و مماثل خصوصیات بھی موجود ہوں گی کہ ان کا تناسب متضاد رجحانات سے کہیں زیادہ ہوگا یہ تناسب کسی بھی مرد اور عورت کے درمیان نہیں پایا جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

قدرت کی نگاہ میں رنگ و نسل، آب و ہوا اور جغرافیہ و زبان کا اختلاف کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ اس کے نزدیک صنفی اختلاف انتہائی اہم ہے۔ اس لیے وہ صلاحیتوں کے عطا کرنے میں سیاہ و سفید، پست قد اور بلند قامت کے درمیان کوئی قابلِ لحاظ فرق نہیں کرتی، ہاں یہ فرق ضرور کرتی ہے کون کس صنف سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخ کا مسلسل تجربہ ثابت کر چکا ہے کہ صنفی اختلاف معمولی اور جزئی اختلاف نہیں بلکہ بنیادی اختلاف ہے۔ اس فرق و اختلاف کو تعلیم و تربیت اور ماحول کے ذریعہ مٹایا نہیں جا سکتا۔ کیوں کہ آدمی اپنے اندر ایسی ہی قوتوں کو نشوونما دے سکتا ہے جو فی نفسہٖ اس میں موجود ہوں کسی ایسی قوت کا پیدا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں جس کا مادہ قدرت نے اس کے اندر رکھا ہی نہ ہو۔ عورت ہو یا مرد کسب و محنت سے قدرت کی طرف سے عطا کردہ صلاحیتوں کو جلا تو دے سکتے ہیں، کوئی نئی صلاحیت پیدا نہیں کر سکتے۔

یہ ایسی حقیقت ہے جس کا ثبوت ہر دور کی تاریخ فراہم کر چکی ہے۔ لیکن آج تک کوئی علمی تحقیق اس کی تردید نہیں کر سکی، ایک فرانسیسی مصنف الگزس کیرل، جس کو نوبل پرائز ملا تھا اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

> "مردوں اور عورتوں کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ بنیادی نوعیت کے ہیں۔ یہ اختلافات ان کے جسم کی رگوں اور ریشوں کی ساخت کے مختلف ہونے سے پیدا ہوتے ہیں عورت کے بیضہ دان سے جو کیمیاوی مادے خارج ہوتے ہیں ان کا اثر صنفِ نازک کے ہر حصے پر پڑتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے طبعی اور نفسیاتی اختلافات کا سبب بھی یہی ہے۔"

ڈاکٹر لیبروس گنا اپنی کتاب روح نسوانیت میں تحریر کرتی ہے کہ "عورتیں

اور مرد صرف طول و قامت، ہڈیوں کی ساخت اور عضلاتی بناوٹ کے اعتبار سے مختلف نہیں بلکہ اس اعتبار سے بھی مختلف ہیں کہ وہ ہوا اور غذا کی ایک ہی مقدار جذب نہیں کرتے، ان کے امراض کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، ان کے ذہن اور اخلاقی رجحانات میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔"

یہ وہی خیالات ہیں جن کا اظہار تقریباً ایک صدی قبل جب کہ آزادیٔ نسواں کا پودا برگ و بار نہیں لایا تھا، علمی حلقوں میں کیا گیا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے:۔

"مرد و عورت میں اعضائے تناسل کی ترکیب و صورت کا اختلاف اگرچہ ایک بڑا اختلاف نظر آتا ہے لیکن صرف یہی ایک اختلاف نہیں ہے بلکہ عورت کے اور تمام اعضاء سر سے پیر تک مرد کے اعضاء سے مختلف ہیں یہاں تک کہ وہ اعضا بھی جو بظاہر آخر الذکر سے بے حد مشابہ نظر آتے ہیں۔"

دونوں صنفوں کا یہ اختلاف متقاضی ہے کہ جس صنف میں جس نوعیت کی قوت و صلاحیت ہے اس سے اسی نوعیت کا کام لیا جائے۔ زندگی کے بیشتر معاملات میں عمل بھی اسی پر کیا جاتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی انجینیر کو کاشتکاری میں لگا دیا جائے یا کسی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے کو فوج میں منتقل کر دیا جائے۔ ایک ہی صنف کے دو افراد کے درمیان صلاحیت، رجحانِ طبع، ذوق اور مناسبت کی بنا پر فرق کیا جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دو مختلف صنفوں کے مابین اس فرق کو نظر انداز کر دیا جائے جب کہ دونوں کی جسمانی ساخت پیدائش سے موت تک، ان پر طاری ہونے والے حالات اور دونوں کے جذبات و احساسات صاف بتاتے ہیں کہ ان کی تخلیق بالکل جداگانہ ڈھنگ پر ہوئی ہے، اور قدرت ان سے دو مختلف نوعیت کے کام لینا چاہتی ہے۔

لیکن جدید فکر کی غلط اندیشی نے دونوں کو ایک ہی میدان میں دھر گھسیٹا

ہے اور ایک ہی میدان میں ترقی کے مواقع بھی فراہم کیے ہیں۔ حالانکہ اس کے پاس اس بات کا کوئی طبی اور نفسیاتی ثبوت نہیں ہے کہ عورت اور مرد کی صلاحیتیں اور قوتیں ایک نوعیت کی ہیں اور جو کام مرد انجام دیتا ہے وہ عورت بھی انجام دے سکتی ہے۔

الکزس کیرل مردوں اور عورتوں کے طبی اور نفسیاتی اختلافات پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ان بنیادی حقائق کو (جو عورت اور مرد کے طبعی فرق پر دلالت کرتے ہیں) نظر انداز کر دینے کی وجہ سے نسوانی آزادی کے علمبرداروں نے یہ دعویٰ کیا کہ مردوں اور عورتوں کی ذمہ داریاں اور حقوق بالکل یکساں اور مساوی ہونے چاہئیں حالانکہ فی الحقیقت مردوں اور عورتوں کے درمیان بے حد اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عورت کے جسم کے ہر خلیے پر اس کی نسوانیت کے نقوش مرتسم ہوتے ہیں۔ یہی بات اس کے اعضاء کے متعلق بھی صحیح ہے اور بالخصوص اس کے نظام عصبی کے متعلق۔ عورتوں کو اپنی فطرت کے مطابق اپنے رجحانات کی تشکیل کرنی چاہیئے بغیر اس کے کہ وہ مردوں کی تقلید کریں۔ تہذیب کے ارتقاء میں عورتوں کا بہ نسبت مردوں کے زیادہ حصہ ہے۔ اس لیے انہیں اپنے خصوصی فرائض سے پہلو تہی نہیں کرنا چاہیئے۔"

ڈاکٹر لیبرون سارقم طراز ہے:

"ترقی اور ارتقاء صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مردوں اور عورتوں کے معاشرتی حقوق و فرائض کا تعین کرنے میں ان کے فروق و اختلافات کو مدِ نظر رکھا جائے۔"

حقیقت یہ ہے کہ مغرب نے مساواتِ مرد و زن کا تصور اس لیے نہیں قبول

کیا ہے کہ اس نے دونوں کے طبعی فرق کو غلط ثابت کر دیا ہے یا بدل کر رکھ دیا ہے بلکہ اس کی نگاہ میں یہ تصور ، عورت کی مظلومیت کا واحد حل ہے۔ اس کے نزدیک عورت کی مظلومیت کی وجہ یہ ہے کہ سوسائٹی میں مرد کو ظلم و زیادتی کے تمام مواقع حاصل ہیں اور عورت ان حقوق سے محروم ہے جن سے کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ رہتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ عورت کو بھی وہ تمام سماجی حقوق حاصل ہوں جو مرد کو حاصل ہیں اور جن اسباب و وسائل کے ذریعہ سوسائٹی میں عزت و سربلندی حاصل کی جاتی ہے وہ کسی ایک صنف کے ساتھ مخصوص نہ سمجھے لیے جائیں تاکہ مرد کی طرح عورت بھی اونچے سے اونچے منصب تک رسائی حاصل کر سکے اور بہتر سے بہتر صنعت اور اعلیٰ سے اعلیٰ پیشہ اختیار کر سکے ورنہ کسی ایک صنف کو ترقی کے مواقع فراہم کرنے اور دوسری کو محروم رکھنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم سماج میں انسانیت کی ایک صنف کو مستقلاً ذلیل اور پست رکھنا چاہتے ہیں اور اس کی ترقی کے خواہاں نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کوئی طبقہ سماجی حیثیت سے پست ہوگا تو وہ برتر طبقہ کے جور و ستم کا نشانہ بنا رہے گا۔ بااقتدار گروہ کو ظلم اور چیرہ دستی سے دنیا کی کوئی قوت باز نہیں رکھ سکتی۔

اس پوری بحث میں عورت کے سماجی حقوق اور اس کی سماجی ذمہ داریوں کو ایک کر دیا گیا ہے ، حالانکہ ان میں بنیادی فرق ہے۔ کسی فرد کے ساتھ عدل و انصاف اور مساوات کا سلوک ایک الگ چیز ہے اور اس کو کسی متعین سماجی کام میں لگا دینا ایک دوسری ہی چیز۔ ان دونوں کو ایک قرار دینا یا ایک کو دوسرے پر منحصر سمجھنا خطرناک غلطی ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ جو شخص بعض متعین کام انجام نہ دے وہ سماجی حقوق سے بھی محروم رہے۔ اگر عورت پر ظلم و زیادتی ہوتی ہے اور وہ اپنے حقوق سے محروم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست اور سماج اپنی ذمہ داری سے غفلت برت رہے ہیں ، ان کا فرض ہے کہ اس کو معاشی و معاشرتی ، تعلیمی و تمدنی سہولتیں بہم پہنچائیں تاکہ وہ ایک آزاد اور پُرامن شہری کی حیثیت سے

زندگی گزار سکے۔ جو ریاست اپنے اس فرض کو صحیح طور سے انجام نہیں دیتی وہ اپنے وجود کی نفی کرتی ہے۔ کیونکہ فرد ریاستی اور اجتماعی زندگی کو اسی لیے اختیار کرتا ہے کہ زندگی کے جن اہم مقاصد کو وہ اپنے محدود ذرائع و وسائل کی بنا پر پورا نہیں کر سکتا ریاست کے وسیع اور قوی ذرائع سے ان کی تکمیل کر سکے۔ اس لیے کسی ریاست کو نہ تو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی شہری کو اس کی بنیادی ضروریات سے محروم کر دے اور نہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مخصوص طبقے کے ساتھ امتیازی برتاؤ کرے اور دوسرے طبقے کو عدل و انصاف سے محروم رکھے، دنیا کی کوئی بھی ریاست اس امتیاز کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں رکھتی۔

لیکن کسی ریاست کا شہری ہونا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہر قسم کی ریاستی ذمہ داری بھی اس پر ڈال دی جائے کیونکہ ذمہ داری اہلیت کی بنا پر سونپی جاتی ہے اور ضروری نہیں کہ ہر شخص میں ہر کام کے کرنے کی اہلیت ہو۔ اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ عورت پر وہی ذمہ داریاں عائد کی جائیں جن کی وہ متحمل ہو، اور جن کو پورا کرنے کی اس میں صلاحیت ہو۔

مغرب نے اپنے استدلال میں اسی حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے ترقی اور عزت کو چند مخصوص پیشوں اور صنعتوں کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ عزت و ذلت کا ایک خود ساختہ پیمانہ ایجاد کیا ہے۔ یہ وہ پیمانہ ہے جس کے بنانے میں مرد کی قوتوں اور صلاحیتوں کو تو سامنے رکھا گیا ہے، لیکن عورت کے مزاج اور فطرت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور پھر اس کو دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ عزت و سربلندی کی خواہاں ہے تو اس پیمانے پر پوری اترے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ فطرت نے جس صنف انسانی میں جس نوعیت کی صلاحیت رکھی ہے اسی نوعیت کا کام اس کے لیے کامیابی و کامرانی کا ذریعہ تصور کیا جاتا۔ اس طرح ہر صنف فطری طور پر معاشرے میں اپنا مقام پیدا کرتی اور عزت حاصل کرنے کے لیے اس کو غیر فطری جدوجہد کرنی پڑتی۔

کہا جاتا ہے کہ جس چیز کو عورت کی فطرت کہا جاتا ہے وہ دراصل ایک مصنوعی حالت ہے جو مرد کے مسلسل ظلم کی وجہ سے اس پر طاری ہو گئی ہے۔ عورت کو چونکہ ایک زمانۂ دراز سے کچلا اور دبایا جا رہا تھا اس لیے اس کی فکری وعملی قوتیں ٹھٹھر کر رہ گئیں۔ کیونکہ جب تک صلاحیتوں کے اُبھرنے کے مواقع نہیں ملتے وہ دبی پڑی رہتی ہیں ورنہ اس کو اگر حرکت وعمل کی آزادی ہوتی تو وہ ان میدانوں میں بھی بہترین پارٹ ادا کر سکتی جو مرد کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔

جہاں تک عقل اور استدلال کا تعلق ہے، اس دعوے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیونکہ جس طرح اس بات کا امکان ہے کہ عورت آزادیٔ عمل پا کر ہر پہلو سے مرد کی برابری کا ثبوت دے۔ اسی طرح بالکل اس کے مساوی اس بات کا بھی امکان ہے کہ آزادی کے باوجود وہ وہیں رہے جہاں پہلے تھی۔ جب یہ دونوں امکانات ایک ہی درجے میں پائے جاتے ہیں تو کس دلیل کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر خالص مردانہ ذمہ داریوں کے انجام دینے کی بھی صلاحیت ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کی موجودہ نفسیات اور صلاحیتیں گواہی دیتی ہیں کہ زندگی کی جدوجہد میں اس کا دائرہ اور مرد کا دائرہ بالکل الگ الگ ہے۔

پھر یہ بات بھی حقیقت واقعہ کے خلاف ہے کہ مرد ہمیشہ ظالم رہا اور اس کے جور وستم نے عورت کے جذبات اور ارادوں کو ظہور پذیر ہونے نہیں دیا۔ کیونکہ اگر مرد کو جبر وظلم کی قوت حاصل ہے تو عورت کے پاس حسن و دل رُبائی کا افسوں ہے جس سے وہ سنگ دل اور بے رحم انسانوں کو موم بنا سکتی ہے چنانچہ تاریخ میں جہاں مردوں کی چیرہ دستی کی مثالیں ملتی ہیں وہاں اس قسم کے واقعات کی بھی کمی نہیں ہے کہ وقت کی ایسی شخصیتیں عورت پر جان ودل سے نثار رہی ہیں جن کے کسی طرف جھک جانے کے معنی یہ تھے کہ سارا ماحول ان کے تابع ہو گیا۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ عورت بڑے بڑے تخت وتاج کی بلا شرکت غیرے مالک رہی ہے، لیکن اس کے باوجود معاشرتی نفسیات کے محققین کی رائے ہے

کہ عورت نے اپنے دائرے سے باہر کوئی اہم کارنامہ انجام نہیں دیا۔

ہیولاک ایلس جو اس زمانے میں نفسیات کا سب سے بڑا ماہر خیال کیا جاتا ہے اپنی کتاب "مرد اور عورت" میں لکھتا ہے :۔

"عورت دوسروں کی ہمدردی کے لیے تڑپتی ہے اور اس میں خود مختاری کا جذبہ و بیباکی زور نہیں ہوتا جیسا مردوں میں ہوتا ہے"

اس دعوے کے ثبوت میں ایلس ان چند عورتوں کی مثال پیش کرتا ہے جنہوں نے بڑے بڑے علمی کام کیے ہیں۔ ان میں ایک عورت بھی ایسی نہیں جس نے اپنا بہترین کام مردوں سے الگ رہ کر انجام دیا ہو۔ چنانچہ میڈم کیوری نے اپنے شوہر کیوری کے ساتھ سائنس میں مسز براؤننگ اپنے رفیق حیات براؤننگ کے ساتھ شاعری میں اور جارج ایلیٹ نے مسٹر لیوس کے ساتھ ناول نویسی کے میدان میں جو کارہائے نمایاں کیے وہ مردوں کی معیت اور رفاقت کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئے۔

جن خواتین نے مواقع حاصل ہونے کے باوجود مرد کے میدان میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا ان کے متعلق ممکن ہے یہ توجیہ کر دی جائے کہ گو ان خواتین کو انفرادی طور پر آزادی میسر تھی۔ لیکن طبقہ نسوانیت کے طویل ذہنی و عملی انحطاط نے ان کے جذبات فکر و عمل کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ مرد کے سہارے کے بغیر کسی اہم اقدام کی جرأت نہیں کرتی تھیں، ان کے اندر یہ حوصلہ نہیں تھا کہ آزادانہ رائے قائم کریں اور اپنے بل بوتے پر کوئی کام کریں۔ اس لیے ضروری ہے کہ عرصہ دراز تک وہ حریت اور آزادی کی زندگی گزاریں۔ اسی کے بعد یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کے اندر عزم و حوصلہ اور خود اعتمادی کی روح بیدار ہو گی۔

یہ توجیہ گو حسین ہے لیکن واقعات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ تاریخ میں ایسے دور بھی گزر چکے ہیں جب کہ عورت کو مرد کے برابر جد و جہد کے مواقع حاصل

تھے اور آج بھی بہت سی ایسی غیر مہذب قومیں ہیں جن میں عورت کسی ایک دائرے میں بند ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ زندگی کے تمام مسائل سے مرد کی طرح براہ راست نبٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود فطرت نے عورت اور مرد کے درمیان جو طبعی فرق رکھا ہے وہ جوں کا توں باقی ہے۔

خود موجودہ تہذیب نے ایک صدی سے آزادی میں مرد کے ساتھ اس کو بھی شریک کر رکھا ہے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس آزادی نے مزاج نسوانیت میں تبدیلی پیدا کر دی؟

پروفیسر دو فارینی لکھتا ہے:-

"جس طرح مرد اور عورت کے جسمانی اور دماغی قویٰ کا باہمی اختلاف تم کو پیرس جیسے متمدن شہر کے شائستہ باشندوں میں نظر آتا ہے بعینہٖ اسی طرح امریکہ کی وحشی ترین اقوام میں بھی پایا جاتا ہے"

یہی مصنف مزید لکھتا ہے:-

"تمدن بڑھنے کے ساتھ ہی قدرتی اختلافات کی وضاحت بھی زیادہ ہو جاتی ہے چنانچہ گوری رنگت کے مردوں اور عورتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ سیاہ فام رنگت کے وحشی مردوں اور عورتوں کے باہمی اختلاف سے کئی درجہ بڑھا ہوا ہے"

اپنے فطری دائرے سے عورت کے خروج کو جائز ثابت کرنے کے لیے مغرب نے ایک اور دلیل بھی فراہم کی ہے وہ یہ کہ اگر عورت سماجی و تمدنی کاموں سے کنارہ کش ہو جائے تو تہذیب و تمدن کی رفتار گھٹ کر آدھی ہو جائے گی اور پچاس سال کے عرصے میں تہذیب و ترقی کے جن منازل تک پہنچ سکتی ہے ان تک سو سال میں پہنچے گی۔

بالفاظ دیگر اس دلیل کا مطلب یہ ہے کہ عورت کی خانگی مصروفیت اور جدوجہد سے سماج کو فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے، اس لیے اس کو ایسے کام اختیار کرنے چاہئیں

جن سے سماج کی تعمیر و ترقی ہو سکے۔

یہ دلیل انتہائی غلط اور غیر علمی ہے۔ کیونکہ سماج کوئی مخصوص فنی نوعیت کا ادارہ نہیں کہ صرف اس فن کی ترقی کو سماج کی ترقی سمجھا جائے۔ بلکہ یہ زندگی کے مختلف شعبوں کی ترکیب سے وجود میں آتا ہے۔ ان ہی میں وہ شعبہ بھی ہے جس کو عورت سنبھالے ہوئے ہے۔ اگر یہ شعبے ختم ہو جائیں تو سماج بھی فنا ہو جائے۔ اس لیے سماجی ارتقاء کے معنی یہ ہیں کہ اس کے تمام شعبے اپنی اپنی جگہ ترقی کریں اور بحیثیت مجموعی زندگی کا معیار بلند ہو۔ مزدور کو اپنی مزدوری میں آسانیاں فراہم ہوں اور خوشحالی نصیب ہو۔ صحافی کو صحافت میں کوئی زحمت نہ ہو، تاجر کو تجارت کی آزادی ہو۔ اسی طرح سماجی ترقی کے لیے ناگزیر ہے کہ عورت کو بھی اس کے اپنے دائرے میں کام کے پورے مواقع ہوں اور اس پر کسی قسم کی غیر ضروری قدغن نہ عائد کی جائے نہ یہ کہ سماج کی فلاح و بہبود کے نام پر اس کو اس کے حقیقی دائرہ عمل سے باہر کھینچ لایا جائے۔ اس کا جواز صرف اس صورت میں نکل سکتا ہے جب کہ ہم یہ ثابت کر دیں کہ عورت سماج کی جو خدمات انجام دے رہی ہے وہ سماج کے لیے نقصان دہ یا کم از کم غیر مفید ہیں ورنہ سوال پیدا ہوتا ہے کیوں نہ مزدور اپنا کارخانہ چھوڑ دے صحافی اپنے اخبار بند کر دیں اور پڑھنے اور پڑھانے والے تعلیم گاہوں سے باہر نکل آئیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی عقلمند اس کو درست نہیں قرار دے سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ بلاشبہ عورت سماج ہی کے فائدے کے کام کر رہی ہے، لیکن اس کو بالکل معمولی اور حقیر کاموں کے لیے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے اور اگر وہ معاشرے کی کوئی اہم خدمت انجام دینا بھی چاہے تو اس کو اس کی اجازت نہیں دی جاتی حالانکہ ہر پیشے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ جب چاہے اپنا پیشہ بدل دے اور جس صنعت کو چاہے اختیار کرے۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ عورت کو جو قوتیں اور صلاحیتیں حاصل ہیں، عقل کا صریح تقاضا ہے کہ ان ہی کے مطابق اس کے لیے نقشۂ عمل تجویز کیا جائے

اور اگر یہ نقشہ کسی کو ناقص نظر آتا ہے تو اسے فطرت سے سوال کرنا چاہیئے کہ کیوں اس نے ایک صنف کو حصولِ کمال کی سعادت سے مستقلاً محروم رکھا! یا کم از کم اس کو عورت کی صلاحیتوں میں ایسی تبدیلی لانی چاہیئے جس سے وہ اس کے تجویز کردہ نقشے کے مطابق کام کر سکے۔

موجودہ تمدنی ترقی کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے اس نظریے کی تردید کر دی ہے کہ عورت ایک مخصوص دائرے ہی میں کام کر سکتی ہے۔ کیونکہ تمدن نے جس شعبے میں بھی ترقی کی ہے اس میں مرد کے ساتھ عورت بھی شریک رہی ہے۔ اگر عورت نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو ترقی کی رفتار گھٹ جاتی۔

یہ تجزیہ حقیقت کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ موجودہ تمدن کی ترقی کا سبب وہ طبعی و مادی علوم ہیں جن کا آغاز اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپ میں ہوا جن کی مدد سے انسان بہت سے ایسے مادی حقائق کے دریافت کرنے میں کامیاب ہوا جن کو وہ اپنی دسترس سے باہر خیال کر رہا تھا۔ یہی حقائق و انکشافات ہیں جو موجودہ تمدن کا سرچشمہ ہیں۔ ان علوم کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ تحقیقات مرد کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس میں عورت کا حصہ بہت کم رہا ہے۔ اس نے اس میدان میں ایسا کوئی مستقل کارنامہ نہیں انجام دیا ہے جس کا تمدن پر کوئی گہرا اثر پڑا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کے کسی شعبے میں آج تک اس کو امامت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ ——— اس لیے کہ یہ اس کا حقیقی دائرہ عمل نہیں ہے۔ وہ اگر اس طرف رخ کرتی ہے تو اس کی حیثیت ایک اجنبی کی سی ہوتی ہے۔ اس میدان میں کام کے خواہ کتنے ہی مواقع اس کو کیوں نہ حاصل ہوں وہ مرد کی رفتار کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ آج خود مغربی مفکرین کو اعتراف ہے کہ عورت تمام سہولتوں کے باوجود ان شعبوں میں اتنی کارآمد نہیں ثابت ہو رہی ہے جتنی کہ اس سے توقع کی جاتی ہے، اور ایک کم تعلیم یافتہ مرد سوسائٹی کو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت سے

زیادہ فائدہ پہنچا رہا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کام تو کرنا چاہتی ہے مردوں کا، لیکن اس کی نسوانیت اس کو اس کی اجازت نہیں دیتی۔ موجودہ رجحانات اس کو جس طرف لے جا رہے ہیں اس کی طبعی صلاحیتیں اس طرف چلنے سے انکار کر رہی ہیں۔ اس کشمکش نے اس کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے جس سے خود مغرب پریشان ہے۔

پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پچھلے دنوں ہم نے خالص مادی پہلو سے اپنی مشکلوں کا حل سوچنے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام رہی اور ہمارے تمام منصوبے تسخر بن کر رہ گئے۔ ہم سوچتے ہیں کہ ہم نے ایسی مشینیں ایجاد کر کے جن سے ہزاروں آدمیوں کو مشقت سے بچایا جا سکتا ہے ہم نے کتنی "عظیم الشان" ترقی کی ہے۔ بیشک یہ صحیح ہے لیکن اس کا یہ ایک عجیب نتیجہ نکلا کہ عورت غریب آج اتنی محنت کر رہی ہے جتنی اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی مثلاً امریکی عورت ہی کو لیجئے وہ گھریلو کام کاج کے لیے بیرونی مدد لینے سے محروم ہے اور خود اس کے حالات اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ محض خانہ داری کی دیکھ بھال ہی کے لیے اپنا سارا وقت دے سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے چاری دوہری مشقت میں پیسی جا رہی ہے۔ گھر پر وہ بیوی اور ماں ہے، اور باہر وہ کسی دفتر یا کارخانے میں ملازم ہے۔

جنگ کے دنوں میں انگلستان میں عورت کی یہ حیثیت تقریباً ملک گیر تھی۔ حالات کا یہ رُخ کسی طرح حوصلہ افزا نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ دنیا میں تنزل کے دَور عام طور پر وہی رہے ہیں جب عورت گھر کی چار دیواری کو چھوڑ کر باہر نکلی ہے۔ قدیم تاریخ

میں پانچویں صدی قبل مسیح کا یونان ترقی کی معراج پر پہنچا ہوا تھا لیکن اس دور میں عورت گھر کی زینت تھی مگر اسکندر کے بعد جس زمانے میں شہری ریاستیں رو بہ زوال تھیں تو جب بھی ایک ایسی ہی نسوانی تحریک شروع ہوئی تھی جیسی آج ہمارے زمانے میں پائی جاتی ہے۔"

عورت کا گھر کی چار دیواری کو چھوڑ نا دو اسباب کی بنا پر زوال کا باعث ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس سے زندگی کا بہت بڑا دائرہ معطل ہو جاتا ہے اور اس کے بے شمار مسائل لاینحل رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ ان مسائل کو عورت ہی کا ناخن تدبیر حل کر سکتا ہے۔ مرد کے بس میں نہیں کہ ان کو حل کر دے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس اقدام سے عورت اور مرد کے تعلقات اور دونوں کی سرگرمیوں کا رُخ وہ ہو جاتا ہے جس کے بارے میں تاریخ کا فیصلہ ہے کہ اس پر چلنے والا کبھی کامیاب نہیں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ سوسائٹی میں عورت اور مرد کا صحیح مقام اور دونوں کے تعلق کو متعین کرنے میں نہ قدیم تصورات کو کامیابی حاصل ہوئی اور نہ جدید فکر ہی اس کو حل کر سکا ہے۔

ہمارے نزدیک صرف اسلام نے دونوں کی نفسیات، طبعی رجحانات اور فکری و عملی قوتوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے۔ اس لیے نظام تمدن میں دونوں کی حیثیت متعین کرنے میں بھی وہ پوری طرح کامیاب ہے۔

سب سے پہلے وہ یہ حقیقت ہمارے سامنے لاتا ہے کہ فطرت وجود حیات کا سلسلہ دو متقابل صنفوں کی مدد سے باقی رکھے ہوئے ہے، اس مقصد کے لیے وہ جس صنف سے جس نوعیت کا کام لینا چاہتی ہے اس کو اسی نوعیت کی صلاحیتیں بھی دی ہیں۔ لہٰذا ہر صنف کا کمال یہ ہے کہ اس کی طبعی صلاحیتیں منشائے قدرت کی تکمیل میں صرف ہوں۔

اس نظریے کے ماتحت معاشرے میں مرد و زن کے حدود عمل گو ایک دوسرے سے لازماً الگ قرار پائیں گے لیکن کسی صنف کو محض اس بنا پر کوئی تفوق حاصل نہ ہو گا کہ وہ مخصوص اوصاف اور قوتوں کی حامل ہے جو دوسری صنف میں نہیں ہیں اور نہ

کوئی صنف اپنی تگ و دو کو ذلت آمیز اور رسوا کن خیال کرنے پر مجبور ہو گی۔ اس کے برعکس جو افراد فطرت کے بتائے ہوئے راستہ پر گامزن ہوں گے معاشرے میں ان کی پذیرائی ہو گی اور وہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے اور جو کوششیں شاہراہ فطرت سے ہٹی ہوئی ہوں گی وہ حقارت اور مذمت کی مستحق قرار پائیں گی۔ ساتھ ہی اس کا عملی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر صنف کو اس کے اپنے دائرے میں تو سبقت و اقدام کے پورے مواقع فراہم ہوں گے لیکن اس دائرے سے باہر اس کی سرگرمیوں کو کم سے کم کیا جائے گا۔

ایک شخص یہ کہہ کر اس نظریے کی قدر و قیمت گھٹا سکتا ہے کہ عمل کی دنیا میں انسان اعلیٰ نظریات ہی کا پابند نہیں رہتا، بلکہ عموماً وہ ایسے عوامل و محرکات کے پیچھے دوڑ پڑتا ہے جن سے اس کے جذبات کی تسکین ہوتی ہو اور جو اس کے لیے زیادہ پُرلطف اور حسین ہوں۔ اس لیے اسلامی نظریات پر ایمان رکھنے کے باوجود یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ مرد عورت کے ساتھ مساویانہ سلوک کرے گا۔ کیونکہ انسان کا قوی ترین داعیہ یہ ہے کہ اس کو دوسروں پر اقتدار اور غلبہ حاصل رہے۔ یہ داعیہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے سے کمزور مخلوق کو کمزور ہی رکھے اور اس کے ابھرنے اور برابر ہونے کا موقع نہ دے۔

یہ بات دنیا کے اور نظریات کے متعلق ممکن ہے صحیح ہو لیکن اسلامی تصورات کو ان پر قیاس کرنا غلط ہو گا۔ کیونکہ ان کے پیچھے ایک زبردست ہستی کا زندہ و محکم یقین اور اس کا بے پناہ خوف کارفرما ہوتا ہے۔ اس یقین کے منافی کسی حرکت کا صدور ایسا ہی ہے جیسے موت کے پھندے کو موت کا پھندا سمجھتے ہوئے کوئی شخص اس میں لٹک جائے۔

اس کے باوجود اسلام نے عورت کی قسمت کو مرد کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ دیا ہے کہ اگر خدا کا خوف اس کو ظلم و زیادتی سے روکے تو رک جائے، اور اگر یہ خوف دھندلا ہو گیا ہے تو ہر طرح کی تعدی کی اس کو گنجائش نکل آئے۔ بلکہ اس نے قانوناً

بھی عورت کی پوزیشن اتنی مضبوط کر دی ہے کہ وہ اپنی طبعی کمزوریوں کے باوجود سماج میں نہ تو مظلوم و بے بس رہے گی اور نہ فقر و فاقہ پر مجبور ہو گی۔ اس کو تقریر و تحریر کا حق ہو گا، وہ ریاست کے تمام ذرائع و وسائل اور سہولتوں سے اسی طرح فائدہ اٹھا سکے گی جس طرح مرد فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کے ساتھ عدل و انصاف میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا، اس کی جان و مال اور عفت و عصمت پر دست درازی کا حق ریاست کے کسی بھی فرد کو نہیں ہو گا، حتیٰ کہ ماں باپ، شوہر اور حاکم وقت بھی اس سے کسی غیر قانونی مطالبہ کا مجاز نہ ہو گا۔

قانون کی اس شدت کے ساتھ اسلام مرد کے اندر لطف و محبت کے جذبات بھی ابھارتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ عورت ایک کمزور مخلوق ہے اس لیے ہمدردی اور مہر و الفت کی مستحق ہے نہ کہ سختی اور تشدد کی۔ اقتدار و بالادستی خدا کی صفت ہے۔ اگر مرد کو عورت کے مقابلے میں خدا کی اس صفت کا کچھ زیادہ حصّہ ملا ہے تو اس کو محبت و ہمدردی میں بھی بڑھا ہوا ہونا چاہیے۔ کیونکہ خدا جتنا بڑا صاحب اقتدار ہے اتنا ہی بڑا رحیم و کریم بھی ہے، وہ شخص انتہائی کم ظرف ہے جس کے اندر اقتدار کا نشہ درندوں اور بھیڑیوں کی صفات پیدا کر دے۔ ان جذبات میں اتنی قوت ہے کہ کوئی بھی قانون اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

آئندہ صفحات میں آپ کو ان ہی اجمالات کی تفصیر ملے گی۔"

عورت اسلامی معاشرہ میں

اساسی تصورات

کسی نظام کو جو نظریات وجود میں لاتے ہیں ان کو جانے بغیر اس نظام کی تفصیلات کا سمجھنا دشوار ہے۔ کیونکہ ان ہی سے اس نظام کی حیثیت متعین ہوتی ہے، اس کا مزاج بنتا ہے، معاشرتی و سماجی اور تہذیبی و تمدنی حقوق مقرر ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان ہی کی بنیاد پر زندگی کا سارا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اور افراد کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔ اس لیے اسلامی معاشرہ میں عورت کی حیثیت، مرتبہ و مقام، اس کے حقوق و اختیارات اور فرائض و واجبات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے عورت کے بارے میں اسلام کے تصورات سے واقفیت حاصل کی جائے تاکہ ان کی روشنی میں تفصیلات کا مطالعہ کیا جا سکے۔

(۱) انسان محترم ہے

اگر آپ اسلام کی تعلیمات کا لب لباب دریافت کرنا چاہیں تو اس کا جواب ایک جملہ میں دیا جا سکتا ہے کہ وہ انسان کی عظمت و سربلندی کی دعوت ہے۔ وہ انسان کو زوال و ادبار کی پستیوں سے اٹھا کر رفعت و بلندی کے ایک ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچانا چاہتا ہے جو حد ادراک سے بھی بہت آگے ہے۔ وہ حرمت نفس اور عظمت آدمیت کا درس دیتا ہے۔ وہ خدائے واحد کی بندگی کی طرف بھی اس لیے بلاتا ہے تاکہ انسان ایک در پر اپنا سر نیاز جھکا کر کائنات کی تمام مخلوقات کے مقابلہ میں سربلند ہو جائے۔ اسلام کی نگاہ میں انسان من حیث الانسان اپنی خلقت

اور صفات کے لحاظ سے نامۂ فطرت کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ وہ اپنی ظاہری صورت اور باطنی خصوصیات دونوں کے اعتبار سے کائنات کی ایک مکرم و محترم ہستی ہے جس کے شرف مجد اور فضیلت و بزرگی کا مقابلہ دنیا کی کوئی مخلوق اور کوئی قوت نہیں کر سکتی۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (بنی اسرائیل - ۷۰)

"ہم نے بنی آدم کو بزرگی بخشی اور انہیں خشکی و تری میں (قطع مسافت کے لیے) سواریاں عطا کیں اور صاف ستھری چیزوں کی روزی دی اور اپنی مخلوقات میں سے بہتوں پر انہیں فضیلت دی۔"

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ (سورۃ تین - ۴)

"ہم نے انسان کی بہتر طریقہ پر تخلیق کی۔"

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ۝ (ص - ۷۱ - ۷۵)

"تیرے رب نے جب فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں پھر جب ٹھیک سے اسے بنا لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر پڑو چنانچہ سب کے سب فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے غرور کیا اور وہ تھا ہی نافرمانوں میں سے تھا تو اللہ نے فرمایا اے ابلیس کس چیز نے

تجھ کو روک دیا اس مخلوق کو سجدہ کرنے سے جسے میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، کیا تو نے گھمنڈ کیا یا تو بہت بڑے درجہ والا ہے۔"

یہ اور اس قسم کی بہت سی آیات نے صحیح معنوں میں دنیا کو انسان کی حقیقی عظمت کا احساس دلایا اور بتایا کہ وہ اپنے مقصد وجود اور جبلی خصوصیات کے لحاظ سے اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کی طرف حقارت کی نگاہ اٹھائی جائے اور اس کے ساتھ کوئی ایسا سلوک روا رکھا جائے جس سے اس کے تفوق و برتری کو دھکا لگے۔ اگر کوئی شخص اس ضابطہ کے خلاف قدم اٹھاتا ہے تو وہ خدا کے عطا کردہ عزت و احترام کو چیلنج کرتا ہے اور ایک ایسے قانون پر حرف گیری کا مرتکب ہوتا ہے جس کا ایک ایک گوشہ تنقید سے بالاتر ہے اور جس کے ہر ہر حرف پر صحت و صداقت کی مہر ثبت ہو چکی ہے۔

(۲) معیار بزرگی ایمان و عمل

اس تصور کو تسلیم کرنے کے بعد انسان (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) کی عظمت فرش خاک سے بلند ہو کر کائنات مہر و انجم سے بھی کہیں آگے نکل جاتی ہے اور اسے قدرتی طور پر ایک ایسا اونچا مقام حاصل ہو جاتا ہے کہ فکر و نظر کے لیے جس سے بڑھ کر بلندی کا تصور ممکن نہیں ہے الّا یہ کہ وہ اپنے فکر و عمل سے خود کو اس بلندی کا نااہل ثابت کر دے، پھر تو دنیا کی کوئی قوت اسے عزت و رفعت نہیں دے سکتی۔

اسلام کے نزدیک انسان کی فلاح و خسران، سلامتیٔ فکر اور درستیٔ عمل کے ساتھ وابستہ ہے وہ ان نظریات کو جاہلانہ نظریات سمجھتا ہے جو عورت کو محض عورت ہونے کی وجہ سے ذلیل تصور کر کے انسانیت کی بلند ترین سطح سے دور پھینک دیتے ہیں اور مرد کو محض اس لیے "عرش بریں" کا حقدار خیال کرتے ہیں کہ وہ مرد ہے۔

اس نے صاف اور غیر مبہم الفاظ میں واضح کر دیا کہ عزت و ذلت اور

سربلندی و نگوں بختی کا معیار صلاح و تقویٰ ہے اور سیرت و اخلاق ہے جو اس کسوٹی پر جتنا کھرا ثابت ہوگا اتنا ہی خدا کی نگاہ میں قابل قدر اور مستحق اکرام ہوگا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (النحل-۹۷)

"جس مرد اور عورت نے بھی اچھا کام کیا اگر وہ مومن ہے تو ہم اس کو ایک پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔ اور ان کے بہتر اعمال کا جنہیں وہ کرتے تھے اجر دیں گے۔"

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۔ (الاحزاب-۳۵)

"بلاشبہ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور اہل ایمان مرد اور اہل ایمان عورتیں، اور عبادت گزار مرد اور عبادت گزار عورتیں اور سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں اور صابر مرد اور صابر عورتیں اور صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم تیار کیا ہے۔"

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ

مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ۔ (آل عمران - ۱۹۵)

"پس اُن کے رب نے اُن کی دعا قبول کی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک ہی ہو پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور انہیں میری راہ میں تکلیف دی گئی، اور جو لڑے اور مارے گئے تو ضرور میں ان کی غلطیاں معاف کروں گا اور انہیں ایسے باغات میں داخل کروں گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں یہ بدلہ ہے اللہ کی جانب سے اور اللہ کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

یعنی نوع انسانی کے دونوں اصناف میں سے جو صنف بھی اپنے نامۂ اعمال کو پاکیزگیٔ کردار سے جلا یاب کرلے، سرخروئی اور کامیابی اس کے لیے مقدر ہو چکی ہے، خالق کائنات کی جانب سے یہ سوال نہیں کیا جائے گا کہ تمہارا تعلق کس طبقہ اور کس صنفِ انسانی سے تھا، لیکن اگر کوئی اپنی کتابِ زندگی کو اعمالِ بد سے سیاہ کرچکا ہے تو سربلندی و بامرادی کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

قرآن مجید میں ایک مقام پر ان مومنین کی صفات بیان کی گئی ہیں جنہوں نے اپنی جان و مال اور اپنی خواہشات و جذبات کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کردیا۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ

النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (التوبہ۔ ۱۱۲)

"وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے، اس کی عبادت کرنے والے، اس کی حمد و ثنا کرنے والے، روزہ رکھنے والے، اس کے سامنے رکوع و سجدہ کرنے والے، بھلائی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور مومنوں کو خوشخبری دو۔"

ایک دوسرے مقام پر ازواج مطہرات کو اپنے اندر بعینہ ان ہی صفات کے پیدا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان صفات کے بغیر وہ نبی کے حبالۂ عقد میں نہیں رہ سکتیں اور نبی کو بڑی آسانی سے ایسی بیویاں مل جائیں گی جو ان اوصاف سے متصف ہوں گی۔ ارشاد ہوا:

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓىٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓىٕحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا (التحریم۔ ۵)

"اگر نبی تم کو طلاق دے دے تو اس کو تمہارے عوض تم سے بہتر بیویاں عطا کرے گا جو خدا کی اطاعت کرنے والی، ایمان رکھنے والی، فرماں بردار، توبہ کرنے والی، عبادت گزار اور روزہ رکھنے والی ہوں گی جو بیاہی ہوئی اور دوشیزہ دونوں طرح کی ہو سکتی ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک صلاح و تقویٰ اور آخرت کی کامیابی کا جو معیار مرد کے لیے ہے وہی معیار عورت کے لیے بھی ہے۔ اس معیار کو پورا کیے بغیر نہ مرد اپنی منزل کو پا سکتا ہے اور نہ عورت۔

(۳) مرد اور عورت تہذیب کے معمار ہیں

قرآن مجید ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ زندگی کی گہما گہمی اور نشیب و فراز میں ہمیشہ مرد

اور عورت میں سے ہر ایک دوسرے کا مددگار اور معاون رہا ہے۔ زندگی کے بارگراں کو دونوں نے سنبھالا ہے۔ تمدن کا ارتقار دونوں کے اتحاد سے عمل میں آیا ہے، دنیا کی کوئی قوم اور کوئی تحریک ان میں سے کسی بھی طبقہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی جس طرح حق کے فروغ اور اس کے غلبہ واقتدار میں مرد اور عورت دونوں شانہ بشانہ مصروف عمل نظر آتے ہیں اسی طرح باطل کی ترقی و استحکام میں بھی دونوں حصہ دار اور شریک کار ہیں۔

اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ۝ (التوبہ — ۶۷)

"منافق مرد اور منافق عورتیں آپس میں ایک ہی ہیں، برائی کا حکم دیتے اور بھلائی سے روکتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے اپنے ہاتھ روکے رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کو بھلا دیا اور اللہ نے بھی انہیں فراموش کر دیا۔ بلا شبہ منافق بڑے ہی نافرمان ہیں"

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (التوبہ — ۷۱)

"ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، ان لوگوں پر اللہ ضرور رحم کرے گا۔ بلاشبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے"

اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد کہ تہذیب و تمدن کے انقلابات عورت

اور مرد کی کوششوں کا نتیجہ ہیں عقل و انصاف کی وہ کون سی دلیل ہے جو ایک کو توقیر و احترام کے قابل اور دوسرے کو ذلت و حقارت کا مستحق ثابت کر سکتی ہے اور جب زمانہ کی صلاح اور بگاڑ میں دونوں کا ہاتھ ہے تو کیا یہ حماقت نہ ہوگی کہ ایک کو کارگاہ و تمدن سے خارج کر کے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا جائے؟ کیا دنیا کا کوئی شخص اپنے جسم کے ایک حصہ کو بے کار اور مفلوج کرنے کے بعد بھی زندگی کے میدان میں اپنا پارٹ ادا کر سکتا ہے!

(۴) عورت کے متعلق اسلام کا نظریہ

اسلام کے آنے سے پہلے دنیا نے عورت کو ایک غیر مفید بلکہ مخل تمدن عنصر سمجھ کر میدانِ عمل سے ہٹا دیا تھا اور اسے پستی کے ایک ایسے غار میں پھینک دیا تھا جس کے بعد اس کے ارتقاء کی کوئی توقع نہیں تھی، اسلام نے دنیا کی اس روش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بتایا کہ زندگی، مرد اور عورت دونوں ہی کی محتاج ہے۔ عورت اس لیے نہیں پیدا کی گئی ہے کہ اسے دھتکارا جائے اور شاہراہِ حیات سے کانٹے کی طرح ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ جس طرح مرد اپنا مقصدِ وجود رکھتا ہے اسی طرح عورت کی تخلیق کی بھی ایک غائت ہے اور قدرت ان دونوں اصناف کے ذریعہ مطلوبہ مقاصد کی تکمیل کرا رہی ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَاۗءُ عَقِيْمًا اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ (الشوریٰ: ۴۹—۵۰)

اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے لڑکیاں، اور جسے چاہتا ہے لڑکے عطا کرتا ہے یا انہیں لڑکوں اور لڑکیوں کے جوڑے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے۔ بے شک وہ علم والا اور قدرت والا ہے۔"

اسلام نے عورت کو ذلت و رسوائی کے مقام سے اتنی تیزی سے اٹھایا اور حقوق و مراعات سے نوازا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں :-

کنا نتقی الکلام والانبساط الی نسائنا علی عهد النبیﷺ هیبة ان ینزل فینا شیئ فلما توفی النبیﷺ تکلمنا وانبسطنا[1]

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم اپنی عورتوں سے گفتگو کرتے اور بے تکلفی برتتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں ہمارے متعلق کوئی حکم نہ نازل ہو جائے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا تو ہم ان کے ساتھ بے تکلف رہنے لگے۔"

اس مظلوم صنف کو حق زیست تک حاصل نہ تھا۔ قرآن نے کہا نہیں! وہ زندہ رہے گی اور اس کے اس حق پر جو شخص بھی دست درازی کرے گا خدا کی طرف سے اس کی باز پرس ہو گی۔

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝

(التکویر، ۸—۹)

"جب کہ زندہ درگور لڑکی کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کس گناہ میں وہ ماری گئی۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مظلوم صنف کی حمایت میں جو ہدایات اور تعلیمات دی ہیں آج تک کوئی بھی مدعی حقوق نسواں ان سے زیادہ صحیح اور حقیقی تعلیمات نہیں پیش کر سکا۔ آپ نے فرمایا :-

انّ اللہ حرّم علیکم عقوق الامهات ومنعا وهات

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب الوصاۃ بالنساء۔ ابن ماجہ، باب ذکر وفاتہ و دفنہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

وواد البنات[1]

"اللہ نے حرام کی ہے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور ادائیگی حقوق سے ہاتھ روکنا اور ہر طرف سے مال بٹورنا اور لڑکیوں کا زندہ دفن کرنا۔"

عن ابن عباس رضؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کانت لہ انثی فلم یئدھا ولم یھنھا ولم یؤثر ولدہ علیھا یعنی الذکور ادخلہ اللہ الجنۃ[2]

"ابن عباس رضہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ درگور نہ کرے اور نہ اس کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرے اور نہ اس پر اپنے لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔"

عن ابی سعید الخدری رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من عال ثلاث بنات فادبھن وزوجھن واحسن الیھن فلہ الجنۃ[3]

"حضرت ابو سعید الخدری رض رسول کریم صلی اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں:-

من بلی من ھذہ البنات شیئا فاحسن الیھن

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب حقوق الوالدین۔

[2] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی فضل من عال یتامی، مستدرک حاکم، جلد ۴ صفحہ ۱۷۷۔

[3] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فضل من عال یتامی ورواہ الترمذی وابن ماجۃ باختلاف یسیر۔

كن له ستراً من النار[1]

"اللہ تعالیٰ جس شخص کو ان لڑکیوں کے ذریعہ کچھ بھی آزمائش میں ڈالے اور وہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کرے تو وہ اس کے لیے جہنم سے بچاؤ کا ذریعہ ہوں گی"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے پُرسوز اور موثر انداز میں ارشاد فرمایا ہے:

الا ادلك على افضل الصدقة ابنتك مردودة اليك ليس لها كاسب غيرك ۔[2]

"کیا میں تجھے بتاؤں کہ بڑی فضیلت والا صدقہ کونسا ہے؟ اپنی اس بچی پہ احسان کرنا جو بیوہ ہونے یا طلاق دے دیئے جانے کی وجہ سے) تیری طرف لوٹا دی گئی ہو اور جس کا تیرے سوا کوئی کفیل اور بار اٹھانے والا نہ رہا ہو۔

عن انسؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من عال جاريتين حتى تدركا دخلت الجنة انا وهو كهاتين واشار باصبعيه السبابة والوسطى بابان معجلان عقوبتهما فى الدنيا البغى والعقوق۔[3]

"حضرت انسؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں جس کسی نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہوگئیں، انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا، تو

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ، مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل الاحسان الی البنات۔

[2] ابن ماجہ، ابواب الادب۔ باب برالوالد والاحسان الی البنات۔

[3] مستدرک حاکم جلد ۴ صفحہ ۱۷۷، ورواہ الترمذی غیر قولہ وبابان معجلان الخ

ہیں اور وہ اس طرح جنت میں داخل ہوں گے۔ آپؐ نے فرمایا دو راستے ایسے ہیں جن سے دنیا میں بہت جلد عذاب داخل ہوتا ہے: ظلم و تعدی اور نافرمانی"

اس حدیث کے آخری جملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بہت ہی اونچی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ ظلم کی عمر ویسے بھی بہت مختصر ہوتی ہے لیکن خاص کر ظلم کے وہ تیر جن کے ہدف اپنے ہی جگر گوشے ہوں مظلوم کے سینے میں پیوست ہونے سے پہلے ہی ظالم کی مہلت حیات ختم کر دیتے ہیں

دنیا نے عورت کو منبع معصیت اور مجسم پاپ اور گناہ سمجھ رکھا تھا، لیکن کائنات کی اس برگزیدہ ہستی نے فرمایا جس کی حرکت و ادا صحیفۂ اخلاق تھی جس نے دنیا کو تقوٰی و خدا ترسی کے آداب سکھائے ، جو پیدا ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ کائنات معصیت و فحاشی کو تہ و بالا کر دے۔

حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا النِّسَاءُ وَالطِّیبُ وَجُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ[1]

"دنیا کی چیزوں میں مجھے عورت اور خوشبو پسند ہے۔ لیکن میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

یعنی عورت سے نفرت اور صفائی و نفاست سے بیزاری، خدا ترسی کی دلیل نہیں ہے، خدا ترسی نام ہے تعلق باللہ کے استحکام کا، انابت الی اللہ اور خوف و خشیت کا۔ آدمی عورت سے پسندیدہ تعلقات رکھنے اور باذوق رہنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کا محبوب بن سکتا ہے بلکہ اس کی رضاجوئی کا یہی صحیح طریقہ ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ دنیا انسان کا مطمح نظر اور اس کی کوششوں

---

[1] نسائی کتاب عشرۃ النساء باب حب النساء۔

کام کر نہ بننے پائے۔

ایک مرتبہ ازواج مطہرات اونٹوں پر سفر کر رہی تھیں، آپ نے شتربان سے فرمایا۔

رویدا اسوقلک بالقواریر۔ [1]

"شیشوں کو ذرا سنبھال کے لے چلو۔"

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں آپ نے فرمایا۔

فانما ابنتی بضعۃ منی یریبنی ما رابہا ویؤذینی

ما اذاہا۔ [2]

"میری بچی میرا گوشت پوست ہے۔ جو چیز اس کے لیے باعث تشویش ہوگی وہ میرے لیے بھی پریشانی کا سبب ہوگی، اور جو بات اس کے لیے باعث اذیت ہوگی یقیناً اس سے مجھے بھی تکلیف پہنچے گی"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ محبوب کسے رکھتے تھے؟ جواب دیا فاطمہ رض کو [3] ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ آپ کی محبوب ترین شخصیت کون ہے؟ فرمایا عائشہ رض [4] یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ بیویوں میں حضرت عائشہ رض اور اولاد میں حضرت فاطمہ رض آپ کی منظور نظر تھیں ان احادیث سے آپ صنف نسواں کے بارے میں اسلام کے رجحان اور مزاج کو سمجھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے متبعین

---

[1] صحیح مسلم کتاب الفضائل باب رحمتہ صلی اللہ علیہ وسلم النساء الخ۔

[2] بخاری، کتاب المناقب۔ مسلم کتاب الفضائل، باب من فضائل فاطمۃ واللفظ لہ۔

[3] ترمذی، ابواب المناقب، ماجاء فی فضل فاطمۃ رض۔

[4] ایضاً من فضل عائشہ رض۔

کے اندر اس صنف کے حق میں کس قسم کے جذبات کی پرورش کرتا ہے؟

اس تعلیم نے فکر و عمل میں ایسا انقلاب پیدا کیا کہ وہ لوگ جنہیں ایک معصوم جان کو زندہ درگور کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا اور جن کی پیشانی کبھی اس سنگ دلی پر عرق آلود نہیں ہوتی تھی، اس کی چارہ گری اور پرورش کو اپنے لیے سرمایۂ حیات تصور کرنے لگے۔ جن کے ہاں اپنے ہی جگر گوشوں کو اماں نہیں ملتی تھی وہ دوسروں کی اولاد کے محافظ و نگران بن گئے اور جو عورت کے ساتھ مہر و الفت کی پرورش سے ناواقف تھے انہیں اپنے آخری لمحات حیات میں اس مظلوم طبقہ کی فکر دامنگیر رہنے لگی۔

جنگ احد کے موقعہ پر حضرت جابرؓ کے والد نے حضرت جابرؓ سے کہا صاحب زادے! شاید پیش آنے والے معرکہ میں مجھے اس دنیا سے کوچ کرنا پڑے۔ اس آخری وقت میں تمہیں اپنی لڑکیوں کے بارے میں خیر اندیشی کی وصیت کرتا ہوں۔[1]

چنانچہ باوجودیکہ حضرت جابرؓ عہد شباب سے گزر رہے تھے لیکن انہوں نے اپنی بہنوں کی نگہداشت کے خیال سے ایک بیوہ کو اپنے لیے منتخب کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان سے دریافت فرمایا کہ کسی دوشیزہ سے کیوں نہیں شادی کی؟ تو جواب دیا۔

یارسول اللہ ان ابی قتل یوم احد وترك تسع بنات کن لی تسع اخوات فکرهت ان اجمع الیهن جاریة خرقاء مثلهن ولکن امرأة تمشطهن و تقوم علیهن قال اصبت۔[2]

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۲۰۳۔

[2] بخاری کتاب المغازی، باب اذ همت طائفتان، مسلم کتاب الرضاع، باب استحباب نکاح البکر

"یا رسول اللہ! میرے والد احد کے معرکے میں شہید کر دیئے گئے اور اپنے پیچھے نو لڑکیاں چھوڑ گئے جو میری نو بہنیں ہوئیں ان کی نگہداشت کے پیش نظر میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان کے ساتھ ان ہی جیسی ایک ناتجربہ کار لڑکی کو جمع کر دوں اس لیے ایک ایسی عورت کا انتخاب کیا جو ان کی کنگھی چوٹی اور دیکھ بھال کر سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا ٹھیک کیا تم نے۔"

غور کیجیے ایک نوجوان جس کے سینہ میں جذبات کا سمندر متلاطم ہو اور جس کا نوخیز شباب اپنے مطالبات اور تقاضوں پر شدت کے ساتھ مصر ہو وہ اپنی بہنوں کی خاطر اپنے جذبات کی آگ پر پانی چھڑک دیتا ہے اور اپنی خواہشات کی آسودگی کا ایسا حل تلاش کرتا ہے جسے جوانی کی سرمستیاں بآسانی قبول نہیں کر سکتیں۔ کیا یہ کوئی معمولی ایثار ہے؟

بخاری، مسلم اور ابو داؤد وغیرہ کی روایت ہے کہ حضرت حمزہ رض کی شہادت کے بعد ان کی بیٹی کی کفالت کے تین دعویدار پیدا ہو گئے۔

ایک طرف سے حضرت علی رض چلے آئے کہ یہ میری چچا زاد بہن ہے لہذا میں اس کی پرورش کا حق دار ہوں۔

دوسری طرف حضرت جعفر رض نے دعویٰ کیا کہ میں علی رض سے زیادہ اس کی نگہداشت کا مستحق ہوں۔ کیونکہ یہی نہیں کہ وہ میرے چچا کی لڑکی ہے بلکہ اس کی خالہ بھی میرے نکاح میں ہے اس طرح دو وجہت سے مجھے اس کی پرورش کی سعادت ملنی چاہیئے۔

تیسری طرف حضرت زید رض نے مقدمہ دائر کر دیا کہ وہ تو میرے بھائی حضرت زید رض انصاری تھے، اور حضرت حمزہ رض مہاجر۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان مواخات قائم کر دی تھی، کی بچی ہے اور چچا سے زیادہ بھتیجی کی تربیت کا کسے حق پہنچتا ہے؟[1]

فکر و نظر کے اس عظیم انقلاب کی مثال تاریخ کے کسی دوسرے دور میں بھی ملتی ہے؟

ان تعلیمات میں اتنا زور اور قوت ہے کہ وہ پنجۂ جور و ستم کو توڑ کر رکھ دیتی ہیں جو شخص ان پر کامل یقین رکھتا ہو اس کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ حدود عدل و انصاف سے باہر قدم رکھے، اور عورت کو بے بس و کمزور پا کر اس پر ظلم کے تیر برسانے لگے۔

(۵) حقوق میں مساوات

اسلام نے ان ترغیبی کلمات اور اخلاقی ہدایات ہی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ اس نے عورت اور مرد دونوں کے حقوق و ضوابط کا قانونی طور پر تعین بھی کر دیا ہے اور اس کمال اعتدال اور شان توازن کے ساتھ کہ نہ عورت اپنی زیردستی کی شکایت اور نہ مرد اپنی زبردستی کا اظہار کر سکتا ہے۔

اسلام معاشرہ کو انسانی حقوق کا محافظ اور امن و امان کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک معاشرہ کا یہ فرض ہے کہ جو ہاتھ ظلم و تعدی کے لیے اٹھے اسے قلم کر دے، اور جو قدم حق و انصاف کی پامالی کے لیے بڑھے اسے کاٹ پھینکے۔ اس لیے اس نے اعلان کیا:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ (البقرہ-۱۷۹)

"اے عقل والو! تمہارے لیے قانون قصاص میں زندگی ہے۔"

شریعت کا یہ ایک کلی اصول ہے کہ قاتل سے قصاص میں اس کی جان لی جائے خواہ وہ کسی مرد کو قتل کرے یا کسی عورت کو کیونکہ ایک عورت کی جان بھی ویسے ہی محترم و معزز ہے جیسے ایک مرد کی جان ہو سکتی ہے اور جو ہاتھ ان دونوں میں سے کسی کے بھی خون سے رنگین ہو گویا خود اس نے اپنے خون کی قیمت کھو دی۔

اہل یمن کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مجموعہ قوانین تحریر کروایا تھا

اس میں اس بات کی تصریح تھی :۔

ان الرجل یقتل بالمرأۃ۔ [1]

"بلاشبہ عورت کے عوض مرد قتل کیا جائے گا۔"

بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی وغیرہ کتب صحاح کی روایت ہے کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کو اس کا سر کچل کر ہلاک کر دیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی سے اسی شکل میں قصاص لیا۔ [2]

حضرت عمرؓ سے یہاں تک ثابت ہے کہ آپ نے ایک عورت کے قصاص میں کئی ایک اشخاص کو قتل کیا جو اس کے خون میں شریک تھے۔ [3]

ابوالزناد کہتے ہیں :۔

کان من ادرکت من فقہائنا الذین ینتھی الی قولہم منہم سعید بن المسیب وعروۃ بن الزبیر والقاسم بن محمد وابوبکر بن عبد الرحمٰن و خارجۃ بن زید بن ثابت وعبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ وسلیمان بن یسار فی مشیخۃ جلۃ سواھم من نظرائھم من اھل فقہ وفضل انہم کانوا یقولون المرأۃ تقاد من الرجل عینا بعین واذنا باذن وکل شئی من الجراح علی ذالک وان قتل قتل بھا۔ [4]

---

[1] السنن الکبریٰ جلد ۸ ۲۰۔

[2] نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۰۔

[3] احکام القرآن جصاص جلد ۱ صفحہ ۱۶۲۔

[4] السنن الکبریٰ بیہقی جلد ۸ صفحہ ۸۔

"ہمارے وہ فقہاء جن سے ہماری ملاقات ہے اور جن کے اقوال فقہ میں مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، خارجہ بن زید، عبیداللہ بن عبداللہ، سلیمان بن یسار، اور ان کے علاوہ ان ہی کے ہم پایہ دیگر اصحاب فقہ و فضل شامل ہیں کہتے ہیں کہ قصاص کے معاملہ میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، عورت کی آنکھ، کان اور دوسرے کسی بھی زخم کے عوض مرد سے (اگر مرد مجرم ہے) اسی نوعیت کا بدلہ لیا جائے گا اور اگر مرد، عورت کو قتل کر دے تو اس کو بھی قتل کیا جائے گا۔"

عورت اگر اپنے کسی عزیز کے قاتل کو معاف کر دے تو کسی رشتہ دار کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے عطا کردہ پروانۂ معافی کو منسوخ کر دے۔

عن عائشۃ رض عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال علی المقتتلین ان ینحجزوا الاول فالاول وان کانت امرأۃ۔ [1]

"اگر اولیاء مقتول قاتل سے دیت لینے اور جان لینے کے بارے میں اختلاف کرنے لگیں اور کوئی قریبی رشتہ دار قاتل کی جان کو معافی عطا کر دے تو دوسرے تمام رشتہ داروں کو جان لینے سے رک جانا چاہیئے۔ معافی دہندہ خواہ عورت ہی کیوں نہ ہو۔"

یہی نہیں بلکہ اگر وہ حالتِ جنگ میں کسی دشمن کو پناہ دے تو اس کو رد نہیں کیا جا سکتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:۔

ان المرأۃ لتاخذ للقوم [2]

---

[1] ابوداؤد، کتاب الدیات باب عفو النساء عن الدم نسائی، کتاب القسامۃ، باب عفو النساء عن الدم

[2] ترمذی، ابواب السیر، باب ماجاء فی امان المرأۃ۔

"بلاشبہ عورت مسلمانوں کے فائدے کے لیے دشمن قوم کو پناہ دے سکتی ہے"

عن عائشۃ قالت ان کانت المرأۃ لتجیر علی المومنین فیجوز۔ [1]

"حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ عورت ہمارے اہل ایمان کو پناہ دے سکتی ہے اور اس کی پناہ نافذ ہوگی"

مشہور واقعہ ہے کہ فتح مکہ کے وقت ام ہانی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، یارسول اللہ! میں نے ابن ہبیرہ کو پناہ دی ہے لیکن علی رض کہتے ہیں کہ وہ اس کو قتل کر کے رہیں گے۔ آپؐ نے یہ سن کر فرمایا ہے:۔

قد اجرنا من اجرت یا ام ھانی۔ [2]

"ام ہانی! تم نے جسے پناہ دی، اسے ہماری بھی پناہ ہے"

اسی طرح حدود شریعت کے اندر رہتے ہوئے اسلام مالیات کے میدان میں عورت اور مرد کو دوڑ دھوپ کی اجازت عطا فرماتا ہے اور ان کی محنت کے صلہ کو ان کا جائز حق تسلیم کرتا ہے جس پر قانوناً کوئی بھی شخص دست درازی نہیں کر سکتا حتی کہ خاوند بھی بیوی کے مال میں تصرف کا مجاز نہیں ہے اور نہ بیوی کے لیے یہ جائز ہے کہ شوہر کی دولت میں اپنی مرضی نافذ کرے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِن فَضْلِهِ۔ (النساء۔ ۳۲)

"مردوں کو اپنی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کو اپنی کمائی کا حصہ ہے اور (دونوں) اللہ سے اس کا فضل مانگو"

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی امان المرأۃ۔

[2] بخاری، کتاب الجہاد، باب امان النساء وجوارہن۔

قانونِ وراثت کے تحت یہ کلیہ بیان ہوا:۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (النساء۔۷)

"جو کچھ ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی حصہ ہے ایک مقررہ حصہ"۔

ل؎ اسلام کے ضابطۂ وراثت کے بارے میں چونکہ بالعموم غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور سطح بین نگاہیں دھوکا کھاتی رہتی ہیں۔ اس لیے ہم یہاں جملاً ان اصولوں کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں جن پر اسلام کا قانونِ وراثت قائم ہے:۔

(۱) اس نے پہلا اصول یہ پیش کیا۔

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ۔

"ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہوگا"

اس پر عمل درآمد دو صورتوں میں ہوگا:

پہلی صورت یہ ہے کہ وارث میت سے بلاواسطہ جائز تعلق رکھتا ہو، مثلاً میاں بیوی۔

دوسری صورت یہ کہ ورثاء رشتہ کے لحاظ سے ایک درجہ کے ہوں اور میت کے سارے مال کے بحیثیت عصبہ (عصبہ ان ورثاء کو کہتے ہیں جو مستحقین حقوق کی ادائیگی کے بعد بقیہ تمام مال کے مالک ہو جائیں) وارث ہوں۔ مثلاً میت کی اولاد، بھائی، بہن وغیرہ۔

بظاہر ان دونوں صورتوں میں صنفین کے درمیان مساوات نہیں برتی گئی ہے اور مرد کے مقابلہ میں عورت کی مالی پوزیشن کمزور کر دی گئی ہے۔ لیکن اگر اسلام کے پورے خاندانی سسٹم پر غور کیا جائے تو حقیقت اس کے برعکس نظر آئے گی۔ اسلام نے عورت کی مالی حیثیت

کہ اس کی بعض فطری کمزوریوں کی بنا پر بہت زیادہ محفوظ اور مضبوط کر دیا ہے جب کہ مرد کی اقتصادی حالت ہر آن غیر یقینی اور نامستحکم ہے، وہ اگر وراثت میں عورت کا آدھا حصہ مقرر کرتا ہے تو دو طریقوں سے اس کی تلافی بھی کرتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ بیوی کو شوہر سے مہر دلواتا ہے، جس کی وہ بلا شرکت غیرے حقدار ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ شادی میں جو مال و زیور اور تحفے تحائف دیئے جاتے ہیں ان کا بھی عورت ہی کو مالک قرار دیتا ہے۔

یہاں ایک اور پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ اسلام پورے خاندان کی معاشی اور تعلیمی و تربیتی ذمہ داری اصلاً مرد پر ڈالتا ہے، بالخصوص معاشی ذمہ داری جس سے عورت بالکل مستثنیٰ ہے یہی نہیں بلکہ وہ عورت کا معاشی بار بھی شادی سے پہلے سرپرست کو اور شادی کے بعد خاوند کو اٹھانے پر مجبور کرتا ہے، ایسی صورت میں دونوں کو وراثت میں بھی مساوی حقوق دینا کس طرح قرین عقل و انصاف ہو سکتا ہے!

ان دو پہلوؤں سے قطع نظر جہاں اسلام نے محض رشتہ کا خیال کیا ہے وہاں عورت اور مرد کو مساوی درجہ دیا ہے مثلاً میت کی اولاد کی موجودگی میں والدین کے حصے یکساں ہوں گے یا اخیافی بھائی بہن (ماں جائے بہن بھائی) کہ ان کے درمیان بھی اسلام نے کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

(۲) دوسرا اصول شریعت نے یہ پیش کیا ہے :-

الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھو لاولی رجل ذکر۔[1]

"حقوق کو اصحاب حقوق تک پہنچاؤ جو کچھ باقی رہے قریبی رشتہ دار مرد کا حصہ ہوگا۔"

قانون وراثت کی یہ دفعہ اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک کہ اسلام کے نظام معاشرت کے ایک دوسرے اصول کو پیش نظر نہ رکھا جائے وہ یہ کہ اسلام نے مرد پر مالی بار ڈالنے کے ساتھ رجال خاندان کے درمیان تعاون و تناصر کے ضابطے بھی مقرر کر دیئے ہیں یہ ضابطے نہ صرف اخلاقی اہمیت کے حامل ہیں بلکہ انہیں قانونی اور

---

[1] صحیح مسلم کتاب الفرائض۔

دستوری حیثیت بھی حاصل ہے۔ اگر ایک شخص افلاس کا شکار ہو جائے تو رجال خاندان میں نسبتاً جو اس سے قریب تر ہو گا اس پر سب سے زیادہ مالی تعاون اور کفالت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

یہ موقع ان مباحث کی تفصیل کا نہیں ہے۔ کہنے کا منشا صرف یہ ہے کہ جب ایک شخص زندگی کے ہر نشیب و فراز اور ہر مصیبت میں سب سے زیادہ پشت پناہ اور سہارا ہو تو کیا عقل و فہم اور اخلاق و قانون اس بات کا تقاضا نہیں کرتے کہ ادائیگی حقوق کے بعد کم از کم بقیہ مال کا وہ وارث قرار دیا جائے! لیکن قانون وراثت میں جو نکہ اصلاً اہمیت نسب ہی کو دی گئی ہے اس لیے اس ضابطے کے تحت ضروری نہیں کہ مرد کو زیادہ ہی حصہ ملے۔ بہ عین ممکن ہے کہ ایک عورت مورث سے قریبی تعلق رکھتی ہو اور وہ اس مرد سے زیادہ حصہ پائے جو مورث کا دور کا رشتہ دار ہے۔ مثلاً فرض کیجیے ایک شخص اپنے پیچھے ایک بیوی، ایک لڑکی یا ایک بہن اور ایک چچا چھوڑ جاتا ہے تو اسلامی قانون وراثت اس کے مال متروکہ سے بیوی کو $\frac{1}{8}$ اور لڑکی یا بہن ہیں سے ہر ہو اسے $\frac{1}{2}$ اور چچا کو $\frac{3}{8}$ دلائے گا:

(۶) مشترک قانون

قدیم مذاہب عورت اور مرد کو ایک حیثیت دینے کے لیے آمادہ نہ تھے، اس لیے انہوں نے دونوں کے لیے الگ الگ قوانین زندگی تجویز کیے لیکن اسلام کی تعلیمات کا مخاطب جیسے مرد ہے ویسے عورت بھی ہے۔ اس کا پیغام "الناس" کے لیے ہے اس لیے کہ یہ "رب الناس" اور "ملک الناس" کا پیغام ہے۔ "رب الرجال" یا "ملک الرجال" کا نہیں۔ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد صرف مردوں یا عورتوں نے نہیں بلکہ "الانسان" نے اٹھایا تھا لہذا دونوں اصناف انسانی کو خدا کے دربار میں اپنی وفاداری کا ثبوت دینا ہو گا۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَ
الْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا

الْإِنسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ لِّيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

(الاحزاب۔ ٧٢-٧٣)

"ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے امانت پیش کی لیکن انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا بلاشبہ وہ بڑا ظالم و نادان تھا۔ یہ اس لیے ہوا تاکہ اللہ منافق مرد اور منافق عورتوں اور مشرک مرد اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں پر اپنی شفقت و رحمت کے ساتھ رجوع کرے اور اللہ بڑا مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا ۝ (الاحزاب۔ ٣٦)

"کسی مومن اور مومنہ کے لیے صحیح نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ کر دے تو انہیں اپنے معاملہ میں اختیار ہو، جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔"

اسلام نے یہی نہیں کہ زوجین میں سے ہر ایک کے لیے زندگی کی راہ متعین کی ہے بلکہ ایک ہی راہ اور ایک دستورِ حیات تجویز کیا ہے۔ اس نے عورت کو ذلیل و کمتر اور مرد کو بلند و برتر سمجھ کر جداگانہ قوانین نہیں وضع کیے۔ اس کی تعلیمات دونوں کو ایک ہی مرتبہ میں رکھ کر خطاب کرتی ہیں اور یکساں ہدایات دیتی ہیں۔ اس کے ہاں نوعِ انسانی نہ تو طبقات میں منقسم ہے اور نہ درجات میں، بلکہ مرد اور عورت ایک ہی محاذِ جنگ کے سپاہی ہیں۔ جن کے دائرۂ کار گو مختلف ہیں لیکن مقصدِ کار

اور نشانہ عمل ایک ہی ہے۔

اس لیے عقائد و عبادات، اخلاق و عادات، معاملات اور تعلقات میں سے کسی میں بھی عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے، الا یہ کہ خود اختلاف صنف کسی ترمیم کا تقاضا کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

انما النساء شقائق الرجال۔[1]

"عورتیں مردوں ہی کی ہم جنس ہیں"

علامہ ابن العابدین حنفی نے قوانینِ شریعت کے سارے دفتر کو کھنگال کر پچھتر کے قریب فرائض و واجبات، سنن و مستحبات اور مکروہات و ممنوعات کی ایسی فہرست پیش کی ہے جس میں شریعت نے اختلافِ صنف کی وجہ سے مرد اور عورت کے درمیان فرق کیا ہے۔[2] ان میں سے بیشتر احکام کا معاشرتی و اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے، مثلاً عورت نماز میں کہاں ہاتھ باندھے گی اور مرد کہاں؟ عورت کا کفن کتنے کپڑوں کا ہوگا اور مرد کا کتنے کپڑوں کا؟ عورت کے علاماتِ بلوغ کیا ہیں اور مرد کے کیا؟ اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل اس فہرست میں صرف چھ سات ہیں ان میں سے بیشتر کی حقیقت اور نوعیت سے انشاء اللہ اپنے مناسب مواقع پر بحث کی جائے گی۔[3]

(۷) قانونِ زوجیت

غرض یہ کہ قرآن مجید نے یہ دعویٰ کیا کہ کتاب قانون میں، اخلاق کے صحیفہ میں، اور حقوق کی فہرست میں عورت اور مرد کو ایک ہی حیثیت دی جائے، دونوں کی حرمت

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطہارۃ، باب فی الرجل یجد البلۃ فی منامہ، ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب فیمن یستیقظ ویری بللا ولا یذکر احتلاما۔

[2] الاشباہ والنظائر مطبوعہ ہند ص۲۲۵ تا ص۲۲۶۔

[3] میراث بھی ان ہی مسائل میں شامل ہے جس پر ص۵۳ کے حاشیہ میں مختصر بحث گزر چکی ہے۔

دولت کا معیار ایک ہو دونوں کے لیے ترقی و کامیابی کے مواقع یکساں ہوں دونوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی یکساں حفاظت کی جاتی ہو، کیوں؟ دنیا کے موجودہ لٹریچر میں قرآن پاک نے سب سے پہلے اس کو اٹھایا اور عقلی جواب دیا، اور پوری قوت استدلال اور نزاکت فہم کے ساتھ اس کو انسانوں کے سامنے پیش کیا۔ دنیا تحقیق و تجربہ کے صدہا مراحل سے گزرنے کے باوجود مساوات مرد وزن کی اس سے بہتر اور سائنٹیفک توجیہ نہیں کر سکی۔

اس نے کہا یہ کائنات ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت پیدا کی گئی ہے، اور انتہائی نظم و ضبط اور ہم آہنگی و یگانگت کے ساتھ اس طرح مصروف عمل ہے کہ صدیاں بیت گئیں لیکن اس نگار خانہ کی رنگینیوں اور دل فریبیوں میں شمہ برابر فرق نہ آیا۔ زمانہ کی گردشیں مسلسل اپنا کام کرتی چلی جا رہی ہیں، لیکن اس انجمن زرنگار کی تابانی اور حیرت انگیزی جوں کی توں قائم ہے۔ آخر وہ کون سی قوت ہے جو اس کائنات کو آغوشِ فنا میں جا گرنے سے روکے ہوئے ہے؟ وہ کون سا قانون ہے جو اس کے لمحات حیات کو دراز کیے چلا جا رہا ہے؟ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے کہ یہاں قانونِ زوجیت کی کار فرمائی ہے، یعنی اس عالم کی ہر شے کے اندر اپنی نوع کی بقا کا جذبہ پایا جاتا ہے اور قدرت نے اس جذبہ کی آسودگی کے لیے خود اسی کی نوع سے ایک صنف مقابل کی تخلیق کی ہے، یہ صنف مقابل اس کے جذبات و احساسات کو سوز و حرکت عطا کرتی ہے اور اسے مجبور کرتی ہے کہ بقائے نوع کا سامان کرے، اور عروس عالم کی جمال و رعنائی اور نظر فروزی میں کوئی فرق نہ آنے دے۔

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَّمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ۔ (الشوریٰ-۱۱)

"اس نے تم ہی میں سے تمہارے جوڑے پیدا کیے اور جانوروں میں بھی جوڑے پیدا کیے۔ اس طرح وہ تمہیں پھیلاتا ہے۔"

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝

(الذاریات - ۴۹)

"اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم سمجھ سکو"

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (یٰسین - ۳۶)

"پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ان چیزوں میں بھی جنہیں وہ نہیں جانتے"

ان آیات نے صراحت کر دی کہ قانونِ زوجیت اپنی وسعت میں کائنات کی ہر شے پر حاوی ہے اس سے نہ انسان مستثنیٰ ہے نہ دنیا کی کوئی دوسری چیز۔ اگر یہ نہ ہو تو تغیرات کی نیرنگی اور بازارِ حسن و جمال کی سحر آفرینی و دلربائی آناً فاناً ختم ہو جائے گی اور ہر شے سکون نا آشنا اور محروم تمنا رہ جائے گی۔ انسان کے صنفی جذبات بھی اس کی صنف مقابل کے بغیر کسی طرح سکون و اطمینان سے ہم آغوش ہو ہی نہیں سکتے، مرد کی زندگی کے بہت سے ایسے خالی گوشے ہیں جنہیں عورت کے حسین ہاتھ ہی پُر کر سکتے ہیں، وہ اس کے جبلی تقاضوں اور فطری سوالات کا جواب اور اس کے ترانۂ محبت کا ساز ہے، اسی طرح مرد کے بغیر نسائیت کی بستی سونی رہتی ہے وہ اس کی کائنات جذبات کی رونق اور اس کی بے تابیوں اور بے کلیوں کا علاج ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا کی مخلوقات میں نقص یا عیب ہے۔ یہاں کا ہر پھول بے داغ اور ہر نقش لاثانی ہے، خامۂ قدرت کی کسی بھی تحریر میں عیب اور خامی کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ قدرت نے بزمِ عالم کو اس طرح آراستہ کیا ہے کہ یہاں کا ہر نقش دوسرے نقش کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ قانونِ زوجیت بھی اسی کی ایک جامع و مکمل شکل ہے۔ بالفاظِ دیگر دنیا کی ہر شے اپنے بعض ذاتی استعدادات اور نوعی خصوصیات کے اظہار کے لیے ایک میدان کی محتاج ہے اور صنفِ مقابل یہ میدان فراہم کرتی ہے۔ یہ ایک طرح کی نسبت ہے

زوجین کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اور دونوں مساوی طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اس میں ذلت وحقارت اور عزت وسربلندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قرآن مجید نے بار بار نئے نئے اسالیب سے اس حقیقت کی توضیح کی ہے۔ ایک مقام پر کہا۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔

"وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو"

غور کیجیے کتنی لطیف تعبیر ہے۔ گویا قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ مرد کی زندگی میں بہت سے ایسے تشنہ پہلو ہیں جن کی آسودگی کا سامان عورت ہی کر سکتی ہے اور خود عورت کی زندگی کے متعدد گوشے مرد کے بغیر محتاج تکمیل رہتے ہیں۔ ایک اور مقام پر قرآن نے کہا کہ یہ رشتہ نفرت وبغض کا نہیں الفت ومحبت کا رشتہ ہے۔ اس کی ترکیب دشمنی وعداوت کے عناصر سے نہیں ہوئی ہے بلکہ اس میں محبت وچاہت تحلیل کی گئی ہے۔ یہ تعلق بغض وکینہ کی تخم ریزی کے لیے نہیں، بلکہ دل بستگی وشیفتگی کی نشوونما کے لیے وجود میں آیا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (الروم - ۲۱)

"اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔ اور اس نے تمہارے درمیان محبت ورحمت پیدا کر دی۔ بلاشبہ اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں"

یہ ہیں وہ احساسات جو اسلامی معاشرہ میں عورت کی حیثیت متعین کرتے ہیں۔ ان احساسات کے بغیر اسلامی معاشرہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

عورت کا حقیقی دائرۂ کار

اسلامی معاشرہ میں مسلمان عورت کا کیا رول ہوگا اور اس کی تگ و دو کن خطوط پر ہوگی؟ اس سوال کا جواب قرآن مجید نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے یہ دیا ہے:-

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ۔ (الاحزاب - ۳۳)

"اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور اگلے دور جاہلیت کی طرح زیب و زینت کا اظہار نہ کرتی پھرو"

پس منظر

اس فرمان کا پس منظر یہ ہے کہ ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ مدینہ کی چھوٹی سی ریاست کو اسلامی اصول و اخلاق کی جلوہ گاہ بنائیں اور جو خواب مکہ میں شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا تھا اس کو سرزمین مدینہ میں حقیقت اور واقعہ ثابت کر دکھائیں۔ لیکن اس فیصلہ کو وہ قوتیں کسی طرح برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہ تھیں جن کو شرافت و اخلاق اور صلاح و تقویٰ کے فروغ میں اپنا زوال نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی آپ نے اپنی مہم کا آغاز فرمایا ہر جہت سے فتنہ و فساد کی آندھیاں اٹھنے لگیں اور ابھی چھ سال بھی پورے گزرنے نہیں پائے تھے کہ مخالفت کا طوفان اس طرح افق مدینہ پر چھا گیا کہ رہ رہ کر شبہ ہوتا تھا کہ شاید اب حق کی شمع ہمیشہ کے لیے بجھ جائے اور دنیا تا

قیامت باطل کے قبضہ میں چلی جائے۔

فساد کے سرچشمے مدینہ کے باہر ہی نہیں تھے بلکہ اندرون مدینہ بھی نفاق اور عداوت کا الاؤ پوری شدت کے ساتھ بھڑک رہا تھا۔ منافقین انتہائی کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اخلاق اور خدا ترسی کا پودا مدینہ میں جڑ نہ پکڑنے پائے اور سارا ماحول نیکی اور تقویٰ سے اسی طرح عاری رہے جس طرح کہ خود ان کی زندگیوں کے اوراق ان پاکیزہ نقوش سے خالی ہیں۔ ان کی مفسدانہ کوششوں کا ایک بہت بڑا ہدف لوگوں کی عفت و عصمت بھی تھی کیونکہ اسلامی معاشرہ کے اس بنیادی ستون کو ڈھائے بغیر وہ اپنی ہوا و ہوس اور نفسانی خواہشات کی دنیا تعمیر نہیں کر سکتے تھے۔

اس دوہری اور فیصلہ کن کشمکش کا تصور کیجیئے! اور پھر بتائیے کہ اس نازک وقت میں دنیا کے کسی بھی دانشمند کا کیا فیصلہ ہوگا؟ غالباً یہی کہ قوم کے ایک ایک فرد کو دشمن کے مقابلہ میں کمربستہ ہو جانا چاہیئے اور اس وقت تک ہتھیار نہیں رکھنا چاہیے جب تک کہ ملک اور معاشرہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ نہ ہو جائے۔ دنیا کی اس "دانشمندانہ" رائے کے برخلاف اسلام نے ملک و ملت کے تحفظ کے نئے اصول و آئین وضع کیے۔ اس نے مرد کے متعلق تو یہ فیصلہ کیا کہ اسے ہر فتنہ کا دوبدو مقابلہ کر کے اس کا سر کچلنا چاہیے۔ لیکن دختران ملت کو ان کی ماؤں کے واسطہ سے یہ حکم دیا کہ وہ اس جنگ میں شریک تو ضرور رہیں لیکن گھروں کے حصار میں رہ کر، وہ دین و ایمان کی غارتگر قوتوں کے مقابلہ میں لگی تو رہیں لیکن اپنی سیرت و کردار اور عزت و ناموس کو گھر کی پناہ گاہ میں محفوظ رکھتے ہوئے۔

اس پس منظر کی روشنی میں قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے ریاست اور معاشرہ کے تحفظ کی ذمہ داری اصلاً مرد کے سر ڈالی ہے اور عورت کی جدوجہد کا رُخ گھر کی طرف موڑ دیا ہے۔ اس کی حقیقی پوزیشن یہ نہیں ہے کہ وہ بازار کی تاجر، دفتر کی کلرک، عدالت کی جج اور فوج کی سپاہی بنی رہے بلکہ اس کے

عمل کا حقیقی میدان گھر ہے۔

علامہ ابوبکر جصاص رح اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

وفیہ الدلالۃ علی ان النساء مامورات بلزوم البیوت منہیات عن الخروج۔ [1]

"اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ عورتیں اپنے گھروں سے چمٹی رہنے پر مامور ہیں اور ان کو باہر نکلنے سے روک دیا گیا ہے"

عورت کی مصروفیت کا احترام

اسلام نے زندگی کی تعمیر کا جو نقشہ تیار کیا ہے خواہ اس کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، خاندانی نظم سے ہو یا معاشرتی آداب سے، اقتصادی قوانین سے ہو یا اصولِ تہذیب سے، اس نے کسی بھی گوشہ میں عورت کی اس حیثیت کو مجروح ہونے نہیں دیا ہے۔

دین میں عبادات کی جیسی کچھ اہمیت ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ حقیقت میں یہ روحِ دین اور جانِ شریعت ہیں۔ ان عبادات کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے مخاطب ہیں تو افراد، لیکن ان کی ادائیگی کی صورت اجتماعی رکھی گئی ہے۔ نماز ادا ہو تو جماعت کی شکل میں، روزہ رکھیں تو سب مل کر ایک ساتھ اور ایک مہینہ میں، زکوٰۃ کی تحصیل وتقسیم کا حق ہے تو اولاً ریاست کو، فریضۂ حج انجام پا سکتا ہے تو سب کے ساتھ اور مخصوص ایام میں۔ یہ اس لیے تاکہ آدمی کے اندر اپنی تربیت اور سیرت سازی کے روپ میں انفرادیت پسندی اور اجتماعیت سے گریز کے رجحانات نہ پیدا ہونے پائیں اور اس کو ہر قدم پر یہ محسوس ہو کہ وہ ایک معاشرہ کا جزو ہے اور اس کی صلاح اور بگاڑ کا ذمہ دار ہے۔

ظاہر ہے، کوئی بھی اجتماعی کام اسی وقت انجام پاتا ہے جب کہ افراد اپنی

---

[1] احکام القرآن جلد ۳ صفحہ ۴۴۳۔

انفرادی حیثیت کو ترک کر کے اُس اجتماعی ہیئت کو اختیار کر لیں جو اس کام کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ اس کے لیے تاجر کو تجارت ترک کرنی پڑے گی، طالب علم کو تعلیم کا سلسلہ بند کرنا ہو گا، مزدور کو اپنی مزدوری سے دست کش ہونا پڑے گا غرض معاشرہ کا ایک ایک فرد اپنا مقام چھوڑنے پر مجبور ہو گا۔

لیکن شریعت کی نگاہ میں اجتماعی عبادات میں عورت کی شرکت سے زیادہ اس بات کی اہمیت ہے کہ وہ اپنے محاذ پر جمی رہے۔ اس کا کسی اجتماعی پروگرام سے الگ رہنا معاشرہ کے لیے اتنا زیادہ نقصان دہ نہیں ہے جتنا کہ اس کا اپنے مرکز کو چھوڑنا ضرر رساں ہو سکتا ہے۔ اجتماعی طریقہ پر عبادات کی ادائیگی کے ذریعہ جن فوائد کی توقع کی جاتی ہے ان کی تلافی دوسرے بے شمار طریقوں سے ممکن ہے لیکن عورت کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے جو خلا پیدا ہو جاتا ہے اس کو کسی اور ذریعہ سے بھرا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عبادات ہوں یا دیگر فرائض حیات ان کو عورت پر یا تو اجتماعی شکل میں فرض ہی نہیں کیا گیا ہے یا فرض کیا بھی گیا ہے تو ان ہی عبادات و فرائض کو جو اسے اپنے مقاصد سے غافل کرنے والے نہیں ہیں۔

عبادات کے اہم ترین جزء نماز کو لیجیے۔ مرد پر نماز جماعت کے ساتھ فرض ہے عورت پر نماز تو فرض کی گئی لیکن جماعت ضروری نہیں قرار دی گئی، مرد اگر بلا وجہ جماعت سے پیچھے رہتا ہے تو اس کو انتہائی زجر و توبیخ کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس عورت کو مختلف پہلوؤں سے ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مکان کے کسی گوشہ ہی کو اپنی عبادت گاہ بنائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:۔

خیر مساجد النساء قعر بیوتھن۔ [1]

"عورتوں کی بہترین مسجدیں ان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں"

---

[1] مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۲۹۷، مستدرک حاکم جلد ۱ صفحہ ۲۰۹۔

مشہور صحابی ابو حمید ساعدی رض کی بیوی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگیں، یا رسول اللہ! میں چاہتی ہوں کہ آپ کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھا کروں آپ کی کیا رائے ہے، حضور ص نے جواب دیا مجھے یقین ہے کہ واقعۃً تمہاری یہی خواہش ہے، لیکن جان لو اپنے مکان کی کسی تنگ کوٹھڑی میں نماز پڑھنا تمہارے لیے کشادہ کمرہ میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے، تمہاری جو نماز کمرہ میں ادا ہو وہ مکان کے وسط میں ادا کی جانے والی نماز سے افضل ہے اور وسط مکان میں پڑھی جانے والی نماز افضل ہے اس نماز سے جو تم اپنے محلہ کی کسی مسجد میں ادا کرو، اسی طرح تمہاری جو نماز اپنے محلہ کی مسجد میں ادا ہوتی ہے وہ تمہارے حق میں میری مسجد میں پڑھی جانے والی نماز سے بہتر ہے۔

حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا ابو حمید ساعدی رض کی بیوی پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے مکان کے بالکل تنگ حصہ میں نماز کی جگہ متعین کر رکھی تھی اور زندگی بھر وہیں نماز ادا کرتی رہیں۔[1]

جمعہ نہ صرف یہ کہ اجتماعیت کا مظہر ہے بلکہ وہ افرادِ ملت کو ایک دوسرے سے قریب کرنے اور دینی تعلیمات اور ہدایات سے روشناس کرانے کا بھی ایک بہترین ذریعہ ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ شریعت نے عورت کو اس اجتماعی طریق عبادت سے بھی مستثنےٰ کر دیا ہے۔

عن طارق ابن شہاب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الجمعۃ حق واجب علی کل مسلم الا اربعۃ عبد مملوک او امرأۃ او صبی او مریض۔[2]

"طارق بن شہاب رض نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں

---

[1] مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۳۷۱، الاستیعاب لابن عبد البر تذکرہ ام حمید الانصاریۃ۔

[2] ابو داؤد، باب الجمعۃ للمملوک والمرأۃ۔

کہ جمعہ ہر مسلمان پر واجب ہے سوائے چار قسم کے لوگوں کے اغلام، عورت، بچہ، اور مریض۔"

اسلامی معاشرہ پر ایک مومن کا حق زندگی میں بھی ہوتا ہے اور اس وقت بھی جب کہ وہ اس دنیا سے کوچ کر جائے۔ جس طرح معاشرہ نے لمحات حیات میں اس کو ہر ممکن راحت پہنچائی۔ اسی طرح یہ بھی اس کا فرض ہے کہ جب یہ لمحات ختم ہو جائیں تو بہتر طریقہ سے اس کو سپرد خاک کرے۔

لیکن ام عطیہ رضہ کی روایت ہے:۔

نھینا عن اتباع الجنائز ولم یعزم علینا۔ [1]

"ہمیں جنازوں کی مشایعت سے منع کیا گیا لیکن اس معاملہ میں حضورؐ نے ہم پر سختی نہیں کی۔"

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات آپ نے اس سلسلہ میں سختی بھی کی ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضورؐ کے ساتھ ایک جنازہ لیے جا رہے تھے آپ نے بعض عورتوں کو پیچھے چلتے ہوئے دیکھا تو غصہ سے پوچھا، کیا تم اسے اٹھا رہی ہو؟

عورتوں نے جواب دیا نہیں۔

آپ نے دریافت کیا، کیا تم اس کے دفن کرنے میں حصہ لوگی؟

انہوں نے کہا نہیں۔

آپ نے فرمایا جب تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ہے تو آخر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا اجر کچھ نہیں ملے گا واپس جاؤ اپنے سر وبال لے کر۔ [2]

اسلام، حق سے وفاداری کا نام ہے مسلمان وہ ہے جو اس وفاداری کا عہد

---

[1] بخاری، کتاب الجنائز، باب اتباع النساء الجنازة۔

[2] فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۱۱۸۔

کرے۔ اس عہد کے بعد یوں تو زندگی کے ہر قدم پر ایک مومن کے پیمانِ وفا کا امتحان ہوتا رہتا ہے لیکن اس امتحان کا انتہائی سخت مرحلہ اس وقت پیش آتا ہے جب کہ حق کے باغی پوری قوت کے ساتھ میدان میں آ چکے ہوں اور حق و باطل کی موت و حیات کا فیصلہ ہو رہا ہو۔ اس وقت ایک باوفا بندے کا فرض ہے کہ حق کی حفاظت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ اسلام نے ان نازک لمحات میں بھی عورت سے اس کی وفاداری کا ثبوت جہادِ جنگ پر نہیں طلب کیا ہے، بلکہ گھر کے دائرہ ہی کو اس کی آزمائش کا میدان قرار دیا اور خاوند و اولاد، اور خویش و اقارب کے ساتھ خیر خواہی اس کے ایمان کی دلیل کہی۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال علیکن بالبیت فانہ جہادکن۔ [1]

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا تم اپنے گھر میں ہی رہو کیونکہ یہی تمہارا جہاد ہے۔"

ایک صحابیہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا:۔

کتب اللہ الجہاد علی الرجال فان اصابوا اثروا وان استشہدوا کانوا احیاء عند ربہم یرزقون فما یعدل ذالک من اعمالہم۔

"اللہ تعالیٰ نے مردوں پر جہاد فرض کیا ہے اگر وہ فتحیاب ہوتے ہیں تو غنیمت پاتے ہیں اور اگر شہید ہوتے ہیں تو وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں جہاں ان کو روزی ملتی ہے، پس ہمارا کون سا عمل ان کے اس عمل کے برابر ہوگا؟"

آپؐ نے جواب دیا:۔

طاعۃ ازواجہن والمعرفۃ بحقوقہن۔ [2]

---

[1] مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۶۸۔

"اپنے شوہروں کی اطاعت اور ان کے حقوق کا پہچاننا"

لیکن خدا کی راہ میں جان و مال اور آسائش و راحت کی قربانی کے جذبہ سے کسی بھی مسلمان خاتون کا دل خالی نہیں ہو سکتا۔ شریعت نے اس جذبہ کی تسکین کا سامان تو کیا لیکن جدوجہد اور ایثار قربانی کا رُخ موڑ دیا۔ وہ اپنے سکون اور چین کے مرکز کو چھوڑے گی لیکن قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے اور قومی و اجتماعی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے نہیں، بلکہ غلامی اور وفاداری کے عہد کو تازہ کرنے کے لیے۔ وہ گھر سے باہر آئے گی لیکن گھریلو زندگی کو اجاڑنے کے ارادہ سے نہیں، بلکہ اس کو آباد کرنے کے عزم کو پختہ اور مضبوط کرنے کے خیال سے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا عورتوں پر جہاد فرض ہے؟

آپ نے اس سوال کے پیچھے کار فرما جذبات کی رعایت کرتے ہوئے اچھوتے انداز میں جواب دیا۔

نعم علیھن جھاد لا قتال فیہ الحج والعمرۃ۔[۱]

"ہاں ان پر جہاد ہے لیکن ایسا جہاد جس میں جنگ نہیں ہوتی اور وہ ہے حج، اور عمرہ"

ازواج مطہرات کی طرف سے جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کی گئی تو کبھی آپ نے جواب دیا۔

جھادکن الحج۔

"تمہارا جہاد حج ہے"

اور کبھی خدا کے گھر تک پہنچنے کے لیے جو زحمتیں برداشت کی جاتی ہیں ان کی

---

[۱] الترغیب والترہیب جلد ۲ صفحہ ۳۲۶

[۲] ابن ماجہ، ابواب المناسک، باب الحج جہاد النساء۔

عظمت و فضیلت کا احساس دلا کر ان کے جذبہ جہاد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ جب آپ کے سامنے اس قسم کی خواہش کا اظہار کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

نعم الجهاد الحج [1]

"تمہارے حق میں حج بہترین جہاد ہے۔"

عورت کی اصل پوزیشن کو باقی رکھنے کے لیے معاشی تگ و دو سے بھی اس کو نجات دی گئی۔ اس پر کسی اور کا کیا معنی خود اس کا اپنا معاشی بار بھی نہیں ڈالا گیا تاکہ اسے اپنا یا دوسروں کا پیٹ بھرنے کے لیے گھر کی حدود کو توڑنا نہ پڑے۔ اور اگر کسی بڑی مصلحت کے تحت اس کو گھر چھوڑنے کی اجازت بھی دی گئی ہے یا کسی عبادت کے اجتماعی طریقہ کو اس کے لیے مفید یا ضروری سمجھا گیا ہے تو اس کے ساتھ ایسی تدابیر بھی اختیار کی گئی ہیں جو ہر آن اس کے اندر یہ احساس تازہ رکھتی ہیں کہ اس کا حقیقی مقام وہی ہے جہاں سے وہ چلی تھی۔ گھر سے باہر نکلنے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ حدود نسوانیت سے بھی باہر ہو چکی ہے۔

مثلاً عورتوں کو مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کی اجازت حاصل ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ مردوں کے ساتھ خلط ملط ہو کر اپنے مرد ہونے کا اعلان نہیں کرتی پھریں گی، بلکہ ان کی صفیں مردوں کی صفوں سے الگ ہوں گی یہ علیحدگی اور دوری جتنی زیادہ ہو اتنی ہی شریعت میں محبوب و پسندیدہ ہے۔

عن ابی هريرة رض قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خير صفوف الرجال اولها وشرها آخرها وخير صفوف النساء آخرها وشرها اولها۔ [2]

---

[1] بخاری، کتاب الجہاد، باب جہاد النساء

[2] رواہ مسلم (کتاب الصلوٰۃ) و اصحاب السنن الاربعۃ۔

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
مردوں کی بہترین اگلی صف ہے اور بدترین صف پچھلی صف، اور عورتوں کی
بہترین صف وہ ہے جو سب سے پیچھے ہو اور ان کی بدترین صف وہ ہے
جو سب سے آگے ہو"

مردوں کی آخری اور عورتوں کی پہلی صف کی اس لیے مذمت کی گئی کہ وہ ایک دوسرے سے قریب ہوتی ہیں لیکن مردوں کی پہلی اور عورتوں کی آخری صف کی تعریف کی گئی کیونکہ ان کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ طرزِ عمل اس نظریہ کا لازمی نتیجہ ہے جو اسلام نے عورت کے متعلق اختیار کیا ہے۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ عورت کو قطعاً اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنا محورِ عمل چھوڑ کر کسی دوسرے محور میں چلی جائے بلکہ وہ اس کو معاشرہ کی مختلف مصروفیات سے فارغ کر کے صرف اسی ایک ادارے میں مشغول دیکھنا چاہتا ہے جو اس کے حوالے کیا گیا ہے۔

معاشرہ ایک وحدت ہے

لیکن جب کوئی معاشرہ فرد کو کسی اجتماعی شعبہ سے وابستہ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے تمام اداروں سے اپنا ناطہ توڑ لے بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل کی بیشتر صلاحیتیں اس پر صرف کرے کیونکہ خواہ چند افراد پر مشتمل کوئی خاندان ہو یا کسی دیہات کا پنچایتی نظام، کسی چھوٹی آبادی کی میونسپلٹی ہو یا کسی بڑے شہر کا کارپوریشن، کوئی صوبائی نظامِ حکومت ہو یا مرکزی و بالائی اقتدار یا ان کے علاوہ دیگر صنعتی، تعلیمی اور معاشی ادارے یہ بظاہر جدا جدا اور ایک دوسرے سے علیحدہ معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل یہ ایک ہی ہیئت اجتماعیہ کے مختلف اجزاء ہیں اور ہیئت اجتماعیہ ان سب کی محتاج ہے کیونکہ ان میں کا کوئی بھی ایک ادارہ معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا نہیں کرتا بلکہ ان کی تکمیل سب ہی اداروں کے تعاون سے ہوتی ہے۔ خاندان خواہ کتنا

فکری تربیت کا آغاز کرتا ہے تو مدارس اور یونیورسٹیاں اس کی ترقی میں مدد دیتی ہیں میونسپلٹی اس کے صحت کے تحفظ کا سامان کرتی ہے عدالت گاہیں اس کے حقوق و مفادات کی نگہداشت کرتی ہیں۔ اس لیے کبھی وہ علم کی طلب میں درسگاہوں کی جانب رخ کرنے پر مجبور ہوگا، کبھی اس کو ایک تاجر کی حیثیت میں بازار اور منڈی جانا ہوگا۔ کبھی وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا اور کبھی تلاش روزگار میں کھیت اور کارخانہ کی طرف دوڑے گا۔ غرض فرد کی تمدنی ضروریات پورے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ اپنی تگ و دو کسی ایک دائرہ میں محدود نہیں رکھ سکتا۔ کسی کاشتکار کے لیے یہ ناممکن ہے کہ زندگی کی وسعتوں کو اپنے محدود قطعۂ زمین میں سمیٹ لے۔ کوئی طالب علم ایسی کوئی صورت نہیں رکھتا کہ سوسائٹی کے تمام اداروں سے کٹ کر صرف تعلیم کا ہو رہے۔ کسی جج کو اس کا کمرۂ عدالت ساری دنیا سے بے نیاز نہیں کرسکتا۔ لہٰذا معاشرہ کا یہ فرض ہے کہ فرد کی متنوع ضروریات جن اجتماعی تعلقات کا تقاضا کرتی ہیں اس کو ان سے نہ روکے۔

چنانچہ اسلام نے بھی عورت کو خاندان سے متعلق تو ضرور کیا ہے لیکن اس کے فکر و عمل کی دنیا کو اسی ادارے کے اندر محصور نہیں کر دیا ہے اور نہ اس کو ان حقوق سے محروم رکھا ہے جو اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس کو اس قابل بھی بناتا ہے کہ معاشرہ میں کامیاب و بامراد زندگی بسر کرسکے۔

معاشرہ میں فرد کی کامیابی کے شرائط

سوسائٹی میں کسی فرد کے کامیاب رول ادا کرنے کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ صحیح فکر رکھتا ہو تاکہ بھلائی اور برائی اور نفع و نقصان میں بآسانی تمیز کرسکے۔ یہ صلاحیت نہ صرف فرد کے ارتقاء کے لیے ضروری ہے بلکہ معاشرہ کی تعمیر و ترقی بھی اسی پر منحصر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر فرد اور جماعت کے

درمیان کامل ہم آہنگی نہیں پیدا ہو سکتی جو ایک کو دوسرے کے لیے کارآمد و مفید بناتی ہے۔ فرد اگر اجتماعیت کے حقوق و فرائض سے پوری طرح واقف نہ ہو، وہ یہ نہ جانتا ہو کہ اس پر سوسائٹی کے کیا حقوق ہیں اور سوسائٹی کن حقوق کی ادائگی پر مجبور ہے، اسے یہ نہ معلوم ہو کہ معاشرہ کو بنانے اور سنوارنے والے عوامل کیا ہیں اور کن اسباب کے تحت وہ زوال پذیر ہوتا ہے تو ہر قدم پر اس بات کا خدشہ ہے کہ اس کے مفادات جماعت کے مفادات سے ٹکرا جائیں اور اس کی تگ و دو اس رخ پر نہ ہو جس رخ پر معاشرہ بڑھ رہا ہے۔ اس لیے ریاست کا فرض ہے کہ وہ فرد کو اس قابل بنائے کہ وہ حیات اجتماعی کے مختلف مراحل و حالات میں جو فرض بھی انجام دے رہا ہو حق و باطل اور صواب و خطا میں حدِ فاصل کھینچ سکے۔ وہ حاکم ہو تو یہ جانے کہ محکوم کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جانا چاہیے، اور محکوم ہو تو اس بات کا علم رکھتا ہو کہ اطاعت کے اصول و شرائط کیا ہیں؟ اگر وہ قاضی ہو تو قانون و انصاف کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہو اور اگر اس کو داد خواہ اور طالب عدل بننا پڑے تو وہ اس کے حصول کے طریقوں سے ناآشنا نہ ہو۔

اس صلاحیت کے ساتھ فرد کی کامیابی کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ اس کو اپنی صواب دید کے مطابق عمل کے مواقع حاصل ہوں۔ علم و فن، تجارت و زراعت، صنعت و حرفت، غرض جس راہ میں بھی وہ آگے بڑھنا چاہے کوئی چیز اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بنے۔ اور اگر اس کے اس حق پر کسی قسم کی چیرہ دستی ہو تو معاشرہ میں اتنی قوت ہونی چاہیے کہ اسے روک سکے اور اس کے حق کی نگہداشت کر سکے، ورنہ فرد اپنے بھلے اور بُرے اور نفع و نقصان کو محسوس کرتے ہوئے بھی اسی طرح ناکامی کا شکار رہے گا جس طرح نادانستہ کسی تباہی سے وہ دوچار ہو جائے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اگر ایک طرف فرد سے معاشرہ کی وفاداری کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو دوسری طرف اس کو معاشرہ کی خیر خواہی کے صحیح طریقوں پر عمل کرنے کا بھی

حق دیا جائے۔ اگر معاشرہ کے مفاد کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی اس کو اجازت نہیں دی جاتی ہے تو اس کے فائدے کے لیے کام کرنے کی اس کو آزادی ملنی چاہیئے۔ کیونکہ جس طرح فرد کی غلط روی سے معاشرہ کو نقصان پہنچتا ہے اسی طرح معاشرہ کا فساد بھی فرد کی تباہی کا سبب بنتا ہے لہٰذا جب ہم سوسائٹی کو فرد کے کردار و عمل کے جائزہ کا حق دیتے ہیں تو فرد کو بھی سوسائٹی کے احتساب اور اس کی اصلاح کا حق ملنا چاہیئے۔

یہ تین شرطیں ایسی ہیں جنہیں دنیا کا ہر جمہوری دستور تسلیم کرتا ہے کیونکہ ان ہی کی بنیاد پر فرد سوسائٹی میں اپنا رول ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ ان تینوں شرطوں کو ہم مختصر الفاظ میں تعلیم و تربیت، مواقع عمل، معاشرہ کی تعمیر و اصلاح کی آزادی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

آیئے، اب ہم دیکھیں کہ اسلامی معاشرہ عورت کے معاملہ میں ان شرائط کو پورا کرتا ہے یا نہیں؟ اور جس حد تک پورا کرتا ہے اس کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں اور ماضی میں کیا نکلے ہیں؟

عورت کی تعلیم و تربیت

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے آنے سے قبل اہل عرب بے قیدی اور آزادی کی زندگی گزار رہے تھے، زندگی کے بارے میں وہ نہ تو کوئی سنجیدہ اور ٹھوس فکر رکھتے تھے اور نہ اس بحث میں پڑنا ہی چاہتے تھے۔ ان کی ساری جدوجہد اس مادی دنیا اور اس کی آسائشوں کے لیے وقف تھی، وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس دنیا سے ماوراء بھی کچھ حقیقتیں ہیں۔ اسلام نے ان کے سامنے زندگی کا ایک ایسا فلسفہ پیش کیا جس میں اخلاقی پابندیاں تھیں، جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے ضابطے تھے۔ عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ کا تصور تھا، خدا اور اس کے رسول کا اقرار اور ان کی فرمانبرداری کی تعلیم تھی۔ اس فلسفہ کو آہستہ آہستہ جب وہ قبول کرنے لگے تو اسلام نے اس کی بنیاد پر ایک معاشرہ کی تعمیر شروع کر دی اور ابھی یہ معاشرہ تعمیر ہو ہی رہا تھا کہ خدا کا حکم نازل ہوا کہ اگر باہر کی کوئی عورت اس معاشرہ کا جزء بننا چاہے تو حسب ذیل اصول اخلاق اور قوانین کی پابندی کا عہد لیا جائے:-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (الممتحنہ-۱۲)

"اے نبی! جب مومن عورتیں ان باتوں پر بیعت کرنے کے لیے تمہارے پاس آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ نہ تو کسی کو شریک ٹھہرائیں گی، اور نہ چوری کریں گی اور نہ زنا کا ارتکاب کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ جانتے بوجھتے کسی پر بہتان باندھیں گی، نہ تمہارے کسی معروف حکم کی نافرمانی کریں گی تو تم ان سے بیعت لے لو، اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو، بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے۔"

اس آیت میں دین کے جن اصولوں کی پابندی کا عہد عورتوں سے لیا گیا ہے ان سے مرد مستثنیٰ نہیں ہیں کیونکہ ان کا تعلق جتنا خانگی زندگی سے ہے اس سے کہیں زیادہ گھر سے باہر کی زندگی سے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کے اصول و کلیات کے احترام کا مطالبہ مرد ہی سے نہیں ہے بلکہ یہی مطالبہ عورت سے بھی ہے اور اس مطالبہ کی تکمیل کی سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ وہ دین کی تعلیمات سے پوری طرح واقف ہو تاکہ وہ یہ جان سکے کہ زندگی کے مختلف حالات و مسائل میں اس کی کیا ہدایات ہیں اور وہ ان کو کس طرح حل کرتا ہے؟ چنانچہ اسی آیت میں اس سے جن باتوں کا اقرار لیا گیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ کسی معروف حکم میں رسول کی نافرمانی نہیں کرے گی۔ یہ بظاہر ایک چھوٹا سا فقرہ ہے لیکن معاشرہ کے اندر اس کو انتہائی ذمہ دار اور جواب دہ بنا دیتا ہے اور مجبور کرتا ہے کہ قدم قدم پر وہ رسول خدا کی مخالفت سے بچے اور آپ کی رضا ڈھونڈے۔ رسول اکرم ہی کے دور مبارک کا ذکر ہے کہ عورتوں کے اندر احکام دین معلوم کرنے کی ایسی تڑپ پیدا ہو گئی تھی کہ وہ شب و روز اس کے لیے بے چین رہتی تھیں اور اس تلاش و جستجو میں جو دشواریاں پیش آتیں وہ ان کو مایوس یا بددل نہ کرتیں بلکہ ہر عقدہ ان کے سمند شوق کے لیے تازیانہ کا کام دیتا۔

انصار کی عورتوں کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:۔

نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ لَمْ يَكُنْ يَمْنَعُهُنَّ

الحیاء ان یتفقھن فی الدین[1]

وہ انصار کی عورتیں بھی بہت خوب تھیں، دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے سلسلہ میں حیا اور شرم ان کے لیے رکاوٹ نہیں بنتی تھی"

اس دور کی خواتین اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کتنی گہرائی اور دقت نظر سے کرتی تھیں۔ اس کا اندازہ آپ حضرت عائشہؓ کے ان الفاظ سے کر سکتے ہیں:۔

کانت تنزل علینا الایۃ فی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنحفظ حلالھا وحرامھا وأمرھا وزاجرھا ولا نحفظھا۔[2]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک آیت نازل ہوتی تو ہم اس میں بتائے ہوئے حلال وحرام اور امر ونہی کو حفظ کر لیتے گو اس کے الفاظ کو از بر نہ کریں۔

جمعہ اور عیدین میں خواتین کی شرکت

جمعہ اور عیدین کے خطبوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو دین کی تعلیمات سے واقف کرایا جائے۔ شریعت نے عورت کے لیے ان میں شرکت کو ضروری نہیں قرار دیا، کیونکہ اس سے بعض اوقات نفع سے زیادہ ضرر کا امکان رہتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے خانگی زندگی کے متاثر ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ لیکن عام حالات میں شریعت نے عورت کو ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی ہے۔

ام عطیہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں:۔

لتخرج العواتق وذوات الخدور والحیض ویعتزل الحیض المصلی ویشھدن الخیر ودعوۃ المومنین

---

[1] مسلم، کتاب الحیض۔

[2] العقد الفرید ۲/۲۲۲۔

قالت فقلت لها آلحیض قالت نعم ألیس الحائض تشهد العرفات۔ وتشهد کذا وتشهد کذا[1]

بالغ اور پردہ نشین خواتین کو جو حالتِ ایام میں ہوں عیدگاہ چلنا چاہیئے البتہ جن عورتوں کے ایام ہوں وہ نماز کی جگہ سے الگ رہیں گی اور خیر اور مومنوں کی دعا میں شریک ہوں گی (حدیث روایت کرنے والی خاتون کہتی ہیں) میں نے اُم عطیہؓ سے کہا کیا حیض والیاں بھی شریک ہوں گی؟ انہوں نے جواب دیا ہاں! کیا وہ عرفات اور دیگر فلاں فلاں مواقع پر حاضر نہیں ہوتیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان علمی و عبادتی مجالس میں خواتین بڑے ہی ذوق و شوق کے ساتھ خاصی تعداد میں شریک ہوتی تھیں خولہ بنت قیس الجہنیہؓ حضورؐ کی بلندی آواز کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

کنت اسمع خطبة رسول اللہ یوم الجمعة وانا فی مؤخر النساء[2]

"جمعہ کے دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ اچھی طرح سنتی تھی حالانکہ میں عورتوں میں سب سے آخر میں ہوتی"

ان مواقع پر عورتوں کی شرکت کسی میلہ یا تفریحی مجلس میں شرکت کی نوعیت نہیں رکھتی تھی بلکہ وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی تھیں۔

حارثہ بن نعمان کی ایک صاحبزادی فرماتی ہیں:۔

فاحفظت ق الا من فی رسول اللہ یخطب بہا کل جمعة[3]

---

[1] بخاری کتاب العیدین۔ باب اذا لم یکن للمرأة جلباب۔

[2] طبقات ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۲۱۷۔

[3] مسلم، کتاب الجمعة۔ ابوداؤد کتاب الصلوٰة، باب الرجل یخطب علی قوس۔

"میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہی سے سن کر سورۂ ق یاد کی ہے جسے آپ ہر جمعہ کو لوگوں کے تذکیر کے لیے خطبہ میں پڑھتے تھے۔"

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کی تعلیم و تذکیر کا اس درجہ خیال رہتا تھا کہ اگر کسی وقت آپ محسوس فرماتے کہ آپ اپنی بات ان کے گوش گزار نہیں کر سکے ہیں تو دوبارہ ان کے قریب پہنچ کر وعظ و تلقین فرماتے۔ ایک عید کے موقع کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ فرماتے ہیں:۔

فظن انه لم یسمع النساء فوعظهن وامرهن بالصدقة[1]

"آپ کو خیال ہوا کہ آپ عورتوں کو اپنی بات نہیں سنا سکے ہیں تو آپ نے دوبارہ ان کو نصیحت کی اور صدقہ و خیرات کا حکم دیا۔"

اس سلسلہ میں ابن جریج رحؒ نے عطاء تابعی سے دریافت کیا:۔

أترى حقا على الامام ذالك ویذکرهن۔

"کیا آپ کے خیال میں امام پر عورتوں کی تذکیر ضروری ہے؟"

انہوں نے جواب دیا:۔

انه لحق علیهم وما لهم لا یفعلونه[2]

"بلاشبہ یہ ان پر لازم ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ وہ اس کا التزام نہ کریں۔"

اسلام نے عورت کے اندر علم کی جو پیاس پیدا کر دی تھی اس کی تسکین ان چند عام ذرائع سے نہیں ہو رہی تھی، اس لیے کبھی کبھی حضورؐ ان کو استفادہ کے لیے علیحدہ مواقع بھی عطا فرماتے تھے۔ حضرت ابو سعید خدری رضؓ کی روایت ہے:۔

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب عظة الامام النساء و تعلیمهن۔

[2] بخاری، کتاب العیدین، باب موعظة الامام النساء یوم العید۔

قال النساء للنبی ﷺ غلبنا علیک الرجال فاجعل لنا یوما من نفسک فوعدھن یوما لقیھن فیہ فوعظھن و امرھن [1]

"عورتوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ کے دربار میں ہمیشہ مردوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اس وجہ سے ہم استفادہ نہیں کر پاتیں، لہذا آپ ہمارے لیے الگ ایک دن مقرر کیجیے۔ چنانچہ آپ ایک دن متعین کر کے ان کے پاس تشریف لے گئے اور وعظ و نصیحت فرمائی اور انہیں نیک کاموں کا حکم دیا۔"

اس نوعیت کا ایک واقعہ حضرت حذیفہ رض کی بہن سے بھی منقول ہے:

قالت خطبنا رسول اللہ ﷺ فقال یا معشر النساء اما لکن فی الفضۃ ما تحلین اما انہ لیس منکن امراۃ تحلی ذھبا تظھرہ الا عذبت بہ [2]

"کہتی ہیں حضور ﷺ نے ہم لوگوں کو خطاب کر کے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔ اے گروہ خواتین تمہیں چاندی کے زیورات میں رغبت کیوں نہیں ہے کہ اس کو استعمال نہیں کرتی ہو۔ سن لو تم میں سے جو عورت بھی سونے کے زیورات پہن کر نمود و نمائش کرتی پھرے گی اس کو عذاب دیا جائیگا۔"

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم و تذکیر کی اس خدمت پر اپنے کسی نمائندہ کو مامور فرماتے۔

عن ام عطیۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما قدم المدینۃ جمع الانصار فی بیت فارسل

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب ہل یجعل للنساء یوم علی حدۃ۔

[2] مسند احمد جلد ۶ ص ۔

الینا عمر بن الخطاب فقام علی الباب فسلم علینا فرددنا علیہ السلام ثم قال انا رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیکن وامرنا بالعیدین ان نخرج فیہما الحیض والعتق ولا جمعۃ علینا ونہانا عن اتباع الجنائز۔[1]

"ام عطیہ رض کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ہم انصار کی عورتوں کو ایک گھر میں جمع کیا اور ہمارے پاس عمر بن خطاب کو نصیحت کے لیے بھیجا۔ انہوں نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر سلام کیا۔ ہم نے سلام کا جواب دیا اس کے بعد انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی حیثیت سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ چنانچہ حضرت عمر رض کے واسطے سے یہ معلوم ہوا کہ حضور نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم عیدین میں نوجوان اور حیض والی خواتین کو بھی عیدگاہ لے چلیں اور یہ کہ ہم پر جمعہ فرض نہیں ہے اور یہ کہ آپ نے ہمیں جنازوں کے پیچھے چلنے سے منع کیا ہے۔"

ماں باپ اور خاوند کو ہدایت

عورت کی تعلیم گاہ اور تربیت کا مقام اس کا اپنا گھر ہے۔ اس لیے شریعت نے والدین اور شوہر کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اس کو حق و باطل میں تمیز کرنا سکھائیں اور اس کو غلط روی سے بچائیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا

(التحریم-۶)

---

[1] ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب خروج النساء فی العید۔ نسائی، کتاب الحیض والاستحاضۃ باب شہود الحیض العیدین ودعوۃ المسلمین۔

"اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے "اہل" کو جہنم کی آگ سے بچاؤ"
اس کا ذریعہ سوائے تعلیم و تربیت کے اور کوئی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ "اہل" سے مراد اصلاً بیوی ہی ہوتی ہے۔

مالک بن حویرث رضہ کہتے ہیں کہ ہم چند نوجوان حضورؐ کی خدمت میں دین سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے بیس دن رہے۔ جب آپ نے محسوس کیا کہ ہمیں گھر جانے کی جلدی ہے، تو فرمایا۔

ارجعوا الی اھلیکم فاقیموا فیھم وعلموھم ومروھم [1]

"جاؤ اپنی بیوی بچوں کی طرف اور ان ہی میں رہو اور ان کو دین کی باتیں سکھاؤ اور ان پر عمل کا حکم دو"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کوفہ والوں کو لکھتے ہیں:۔

علموا نساءکم سورۃ النور [2]

"اپنی بیویوں کو سورۂ نور کی تعلیم دو"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فکری و عملی اعتبار سے اس پس افتادہ صنف کو آگے بڑھانے کی مختلف پہلوؤں سے ترغیب دلائی اور اس سلسلہ میں بے پایاں ثواب کی بشارت سنائی ہے۔

آپ کا فرمان ہے:۔

من عال ثلاث بنات فادبھن وزوجھن واحسن الیھن فلہ الجنۃ [3]

"جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی، ان کو ادب اور سلیقہ سکھایا، ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کے لیے

---

[1] بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافرین الخ
[2] تفسیر قرطبی جلد ۱۲ صفحہ ۱۵۵۔
[3] ابوداؤد کتاب الادب، باب فضل من عال یتامیٰ۔

جنت ہے۔"

اس کا تعلق والدین سے ہے۔ شوہر کے متعلق آپ نے فرمایا:

ثلاثۃ لھم اجران رجل کانت عندہ امۃ فادبھا فاحسن تادیبھا وعلم فاحسن تعلیمھا ثم اعتقھا فتزوجھا[1]

"تین قسم کے آدمی ہیں جن کو دوگنا اجر ملے گا۔ ان میں سے ایک وہ شخص بھی ہے جس کے پاس کوئی باندی ہو وہ اس کو ادب سکھائے اور اچھا ادب سکھائے، تعلیم دے اور بہتر تعلیم دے، پھر اس کو آزاد کر کے اس سے شادی کر لے۔"

اس حدیث کی رو سے ایک ثواب کا مستحق وہ شخص بھی ہوگا جو آزاد بیوی کی تعلیم و تربیت میں کوشاں ہے۔ کیونکہ وہ حدیث کے ایک پہلو کی تکمیل کر رہا ہے۔ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کا نکاح ایک ایسے شخص سے کرا دیا جو مفلس و نادار تھا، لیکن قرآن کی چند سورتوں کا عالم تھا اور اس سے کہا کہ مہر کے عوض اپنی بیوی کو بھی چند سورتیں سکھا دو۔[2]

گویا آپ نے عورت کو یہ حق دیا کہ دولت علم کے عوض مال کی شکل میں حاصل ہونے والے سرمایہ سے دست بردار ہو جائے۔

بعض اوقات آپ نے مردوں کو قرآن مجید کے خاص خاص حصوں کی طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنی بیویوں کو ان کی تعلیم دیں۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں میں ایمانیات اور اصول دین سے بحث کی گئی ہے۔ ان کے متعلق آپ نے فرمایا:

ان اللہ ختم سورۃ البقرۃ بآیتین اعطیتھما من کنزہ الذی تحت العرش فتعلموھن وعلموھن

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل امتہ واھلہ۔

[2] بخاری، کتاب النکاح، باب تزویج المعسر۔ مسلم، کتاب النکاح۔

نساء کرام

"بلاشبہ اللہ نے سورۂ بقرہ کو ایسی دو آیتوں پر ختم کیا ہے جو مجھ کو اس مخصوص خزانہ سے دی گئی ہیں جو عرش کے نیچے ہے۔ پس تم خود بھی اس کو سیکھو اور اپنی بیویوں کو بھی سکھاؤ"[1]

خود حضورؐ اس کی کوشش فرماتے کہ آپ کے حلقۂ اثر میں رہنے والی خواتین دین کی بنیادی تعلیمات سے بے خبر نہ رہیں۔ آپؐ کی ایک صاحبزادی فرماتی ہیں۔

ان النبی کان یعلمہا فیقول قولی حین تصبحین سبحان اللہ وبحمدہ ولا قوۃ الا باللہ ما شاء اللہ کان وما لم یشا لم یکن اعلم ان اللہ علی کل شیء قدیر وان اللہ قد احاط بکل شیء علما[2]

"کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تعلیم دیتے تھے فرماتے جب تو صبح کرے تو یہ کہہ، پاکی ہے اللہ کی اور اس کی تعریف (بھلائی کی) قوت اسی کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا۔ یہ بات تو جان لے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے"۔

کتابت کی تعلیم

آپؐ نے صرف اتنی بات کافی نہیں سمجھی کہ عورت دین کے اصول و مبادی سے واقف ہو جائے، بلکہ آپ نے اس کے لیے کتابی تعلیم کو بھی ضروری خیال فرمایا تاکہ اس کے علم کا ذریعہ صرف کان ہی نہیں بلکہ آنکھ بھی ہو اور اس کے خیالات کے محافظ دماغ کے ساتھ کتاب کے اوراق بھی رہیں۔ شفاء بنت عبد اللہؓ کہتی

---

[1] دارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فضل اول سورۃ البقرۃ وآیۃ الکرسی

[2] ابوداؤد، کتاب الادب، باب ما یقول اذا اصبح۔

یوں کہ ایک دن میں حضرت حفصہ رضہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی آپ نے فرمایا۔

الا تعلمین ہذہ رقیۃ النملۃ کما علمتیہا الکتابۃ [1]

"جس طرح تم نے ان کو کتابت سکھائی ہے کیا اسی طرح ان کو مرض نملہ کی دعا نہیں سکھاؤ گی"

اس سے معلوم ہوا کہ وہ پہلے کتابت سکھا چکی تھیں۔

عورت کی تعلیم کی قانونی حیثیت

یہ ارشادات محض ترغیبی اور اخلاقی نوعیت نہیں رکھتے ہیں بلکہ ان ہی کے پیچھے ضابطہ اور قانون کی زبان بول رہی ہے۔ آٹھویں صدی کے مشہور مالکی عالم علامہ ابن الحاج رہ لکھتے ہیں:۔

فلو طلبت المرأۃ حقہا فی امر دینہا من زوجہا
ورفعتہ الی الحاکم وطالبتہ بالتعلیم لامر دینہا
لان ذالک لہا اما بنفسہ او بواسطۃ اذنہ لہا فی
الخروج الی ذالک لوجب علی الحاکم جبرہ علی ذالک
کما یجبرہ علی حقوقہا الدنیویۃ اذ ان حقوق الدین
آکد واولیٰ [2]

"اگر عورت دین کے معاملہ میں اپنا حق شوہر سے طلب کرے اور حاکم کے پاس اس کا مرافعہ کردے اور اس سے دینی تعلیم کا تقاضا کرے۔ کیونکہ اس کا یہ حق ہے کہ یا تو شوہر خود ہی اس کو تعلیم دے یا اس کو گھر سے باہر جاکر تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے۔۔۔۔۔۔ تو حاکم پر ضروری ہے کہ وہ شوہر کو اس مطالبہ کی تکمیل پر مجبور کرے جس طرح وہ دنیوی حقوق کے

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الرقی۔ مسند امام احمد جلد ۶ صفحہ ۳۷۲۔

[2] المدخل لابن الحاج جلد ۱ صفحہ ۲۷۶۔

سلسلہ میں کوتاہی ہے، کیونکہ دینی حقوق زیادہ مؤکد اور زیادہ اہم ہیں۔

امام فخر الدین حسن بن منصور حنفی المتوفی ۲۹۵ھ نے اپنے مشہور فتاویٰ میں کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے کہ عورت پر دین کا جاننا کب فرض ہوتا ہے اور کب سنت و استحباب کے درجہ میں رہتا ہے اور اس معاملہ میں وہ کس حد تک شوہر کے حکم کی پابند ہے اور کہاں اس کو شوہر کی مخالفت کا حق ہے؛ فرماتے ہیں:-

وإذا أرادت المرأة أن تخرج إلى مجلس العلم بغير إذن الزوج لم يكن لها ذالك فإن وقعت لها نازلة فسألت زوجها وهو عالم فأخبرها بذالك ليس لها أن تخرج بغير إذنه وإن كان الزوج عن السوال كان لها أن تخرج بغير إذنه لأن طلب العلم فيما يحتاج إليه فرض على كل مسلم ومسلمة فيقدم على حق الزوج وإن لم يقع لها نازلة و أرادت أن تخرج إلى مجلس العلم لتعلم مسائل الصلوٰة والوضوء فإن كان الزوج يحفظ تلك المسائل ويذكر لها ذالك ليس لها أن تخرج بغير إذنه فإن كان الزوج لا يحفظ المسائل فالأولى له أن يأذن لها بالخروج فإن لم يأذن فلا شيء عليه[1]

"اگر عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کسی علمی مجلس میں شریک ہونا چاہے تو اس کو اس کا حق نہیں ہے لیکن جب کوئی مسئلہ اس پر آن پڑے تو وہ اپنے شوہر سے دریافت کرے گی۔ اب اگر شوہر عالم ہو اور وہ خود ہی اسے مسئلہ بتا دے یا جاہل ہو اور دوسروں سے تحقیق کر کے اس کو اطلاع دیدے تو اس کو شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں جانا چاہیئے لیکن اگر شوہر تحقیق کر کے اس کو نہ بتائے تو وہ بلا اجازت بھی کسی علمی مجلس میں جا کر دریافت

---

[1] فتاویٰ قاضی خان المطبوعۃ علی فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۴۴۳۔

کرسکتی ہے کیونکہ طلب علم مسلمان مرد اور عورت دونوں پر فرض ہو جاتا ہے جب کہ وہ اس کے محتاج ہوں اس لیے ایسی حالت میں طلب علم کو شوہر کے حق پر مقدم رکھا جائے گا۔ اگر عورت کو کوئی متعین مسئلہ تو در پیش نہ ہو لیکن وہ نماز اور وضو وغیرہ کے مسائل سیکھنے کے لیے کسی علمی مجلس میں شریک ہونا چاہے۔ اگر شوہر ان مسائل کو جانتا ہو اور وہ اسے سکھا بھی رہا ہو تو اسے گھر سے نہیں نکلنا چاہیئے جب تک شوہر اس کو اجازت نہ دے۔ اگر خود شوہر کو ان مسائل کا علم نہیں ہے تو بہتر یہ ہے کہ وہ اس کو علمی مجلسوں میں شرکت کی اجازت دے (اور کوئی مصلحت مانع ہو تو شوہر کو اس کا بھی حق ہے کہ) وہ اس کو باہر جانے کی اجازت نہ دے اور اس سے شوہر پر کوئی الزام نہیں آئے گا"

تعلیمی سہولتیں

اسلامی تعلیمات کے گہرے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ شریعت عورت کو علم کے استفادہ و افادہ میں تمام معاشرتی سہولتیں بہم پہنچانا چاہتی ہے تاکہ اس کے فکری ارتقاء میں ماحول کوئی رکاوٹ نہ بننے پائے۔

یہ حدیث گزر چکی ہے کہ جو شخص اپنی باندی کو تعلیم و تربیت دے گا اور پھر اس کو آزاد کر کے شادی کرے گا تو اس کو دو اجر ہیں۔ اس حدیث پر غور کیجیئے! آپ نے لونڈی کی صرف تعلیم و تربیت ہی پر یہ بشارت نہیں دی ہے بلکہ اس کے استحقاق کے لیے ضروری قرار دیا کہ اس کے پاؤں سے غلامی کی زنجیر کاٹ دی جائے جو اس کو آزادانہ تگ و دو کی اجازت نہیں دیتی۔

فکری تربیت

آدمی کے ذہنی ارتقاء میں ماحول کی موافقت اور تعلیمی سہولتوں سے کہیں زیادہ خود اس کی اپنی کوششوں کا دخل ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک اپنی فکری صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے اور اپنی معلومات سے نئے نئے نتائج اخذ کرتے اور نئی نئی

حقیقتوں کے دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شریعت نے جہاں عورت کے فکری معیار کو بلند کرنے کے لیے خارج میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں وہاں اس کے ذہن و فکر کی اندرونی صلاحیتوں کو بھی ابھارنے کی سعی کی ہے تاکہ قدرت نے خود اس کے اندر فکر و نظر کی جتنی قوتیں رکھی ہیں ان سے وہ فائدہ اٹھا سکے۔

قرآن مجید ازواج مطہرات کو بعض معاشرتی احکام دینے کے بعد کہتا ہے:۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ۔ (الاحزاب - ۳۴)

"اور یاد کرو اللہ کی ان آیات کو جن کی تلاوت تمہارے گھروں میں ہوتی ہے اور حکمت کو"

یعنی ذرا سوچو تو سہی کہ جس حکمت کے شب و روز تمہارے گھروں میں چرچے ہوتے ہیں اس کا کیا ٹھکانا ہے! خدا پر ایمان اور محاسبۂ آخرت کا یقین کس طرز زندگی کا مطالبہ کرتا ہے؟

احادیث میں اس قسم کی کوششیں بہت ہی واضح انداز میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو واقعات درج کرتے ہیں۔

ایک عورت نے حضور ؐ سے دریافت کیا کہ میری ماں نے حج کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن موت نے اس کو اس کی مہلت نہ دی، کیا میں اس کی جانب سے حج کر سکتی ہوں؟

آپ ؐ نے جواب دیا حجی عنہا أرأیت لو کان علی امک دین أکنت قاضیۃ اقضوا اللہ فاللہ احق بالوفاء[1]

ہاں اس کی جانب سے حج کر، غور کر اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تو اس کو ادا نہ کرتی۔

---

[1] بخاری، ابواب العمرۃ، باب الحج والنذر عن المیت الخ

پس اللہ کے جن احکام کو ادا نہیں کیا گیا ہے ان کو ادا کرو کیونکہ اللہ تعالٰے بندوں سے کہیں زیادہ اس کا مستحق ہے کہ اس کا قرض پورا کیا جائے۔

حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ نے دریافت کیا۔ اگر عورت خواب میں جنسی لذت محسوس کرے تو کیا اس پر غسل واجب ہو جاتا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا۔ ہاں! بشرطیکہ اس کو احتلام ہو۔ اس پر ام سلمہؓ نے پوچھا۔ کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ (یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ عورت کو اس کی نوبت بہت کم آتی ہے) آپ نے فرمایا۔

نعم فیم یشبہا ولدہا

"ہاں پھر کیسے بچہ اس سے مشابہ ہوتا ہے!"

غور کیجیے! اس ایک جملے کے ذریعہ حضورؐ نے ام سلمہؓ کے ذہن کو کتنے مسائل کی طرف موڑ دیا۔

دَورِ صحابہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ نے انفرادی طور پر ان خواتین کی فکری و عملی اصلاح کے لیے کیا کچھ کیا، جن کی ذمہ داری شریعت کی طرف سے ان پر ڈالی گئی تھی، اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے البتہ ذیل کے واقعہ سے اس کا ایک ہلکا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک مرتبہ کہا کہ جو عورتیں مصنوعی بال گوندھتی ہیں، بچے گدواتی ہیں اور دانتوں کو گھس کر خوبصورت بناتی ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہے۔ یہ سن کر ایک خاتون نے کہا کہ یہ سب کچھ آپ کی بیوی بھی تو کرتی ہیں۔ عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا جاؤ پہلے دیکھ آؤ اور پھر بتاؤ۔ چنانچہ وہ عورت آپ کے گھر گئی، لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ ابن مسعودؓ نے کہا، اگر میری بیوی ان

۱۔ بخاری، کتاب العلم، باب الحیاء فی العلم۔ مسلم، کتاب الحیض باب وجوب الغسل علی المرأۃ بخروج المنی منہا۔

خلاف شرع اعمال کا ارتکاب کرتی تو کبھی میرے حقد میں نہیں رہ سکتی تھی [۱]

اسی طرح صحابہ کرام عمومی انداز میں اصلاح معاشرہ کی جو جدوجہد کرتے تھے اس میں ان کے پیش نظر مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ہوتی تھیں۔

عائذہ نامی ایک خاتون عبداللہ بن مسعودؓ ہی کی ایک تقریر کا ذکر کرتی ہیں:۔

رایت ابن مسعود یوصی الرجال والنساء ویقول من ادرک منکم امرأۃ او رجل فالسمت الاول [۲]

"میں نے عبداللہ بن مسعود رضؓ کو دیکھا کہ وہ مردوں اور عورتوں کو نصیحت کر رہے۔ آپ فرما رہے تھے تم میں سے جو بھی خواہ وہ مرد ہو یا عورت فتنوں کا زمانہ پائے تو حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں کے طریقہ پر چلا رہے۔"

نتائج

اس مسلسل کوشش اور پیہم توجہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ کل تک عورت جو علم و ادب سے ناآشنا محض تھی، آج اس کی نگہبان و محافظ بن گئی اور دنیا جو فکر و ادب میں جس کا کوئی وجود نہیں تھا وہ آفتاب علم و ہدایت بن کر چمکنے لگی۔

حضرت عائشہ رضؓ کو دیکھیے کہ ان کے شاگرد خاص عروہ بن زبیرؓ ان کے وسعت علم کا اظہار کن الفاظ میں کرتے ہیں؟

ما رأیت احدا من الناس اعلم بالقرآن ولا فریضۃ ولا بحلال وحرام ولا بشعر ولا بحدیث العرب ولا النسب من عائشۃ [۳]

"میں نے حضرت عائشہ رضؓ سے زیادہ قرآن اور فرائض، حلال و

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب تحریم فعل الواصلۃ الخ

[۲] مقدمہ سنن الدارمی باب فی کراہیۃ اخذ الرای۔

[۳] تذکرۃ الحفاظ جلد ا صفحہ ۲۷۔

حرام، شعروادب، اہل عرب کی تاریخ اور ان کے حسب نسب کو جاننے
والا کسی کو نہیں پایا۔"

عروہ بن زبیرؓ کو عربی کلام پر بڑا عبور تھا۔ اس معاملہ میں ان کی تعریف کی
گئی تو کہا کہ حضرت عائشہ رضؓ کے مقابلہ میں شاعری سے میری واقفیت کوئی حقیقت
نہیں رکھتی وہ تو بات بات پر اشعار سے استدلال کرتی تھیں ؎

موسٰی بن طلحہ کہتے ہیں:-

ما رأیت احداً افصح من عائشۃ ؎

"میں نے حضرت عائشہ رضؓ سے زیادہ کسی کو فصیح نہیں دیکھا۔"

لوگوں کو حضرت عائشہ رضؓ کی واقفیت شعروادب سے کہیں زیادہ ان کی طبی
معلومات پر حیرت ہوتی تھی۔

ابن ابی ملیکہ رحؒ نے آپ سے کہا آپ کی شاعری پر ہمیں تعجب نہیں ہوتا
کیونکہ آپ ابوبکر صدیق رضؓ کی بیٹی ہیں جن کی فصاحت و بلاغت مانی ہوئی تھی،
لیکن طب کہاں سے آپ نے سیکھ لی؟

جواب دیا کہ حضور صلعم کو جب کوئی مرض لاحق ہوتا تو باہر سے حاضر خدمت
ہونے والے وفود اس کا علاج بتلاتے اور میں اس کو یاد رکھتی ؎

آپ کی حساب دانی کا یہ حال تھا کہ اکابر صحابہ آپ سے میراث کے مسائل
دریافت فرماتے ؎

حضرت عائشہ رضؓ کے تلامذہ میں ایک عمرہ بنت عبدالرحمٰن بھی ہیں جن کا تذکرہ

۱؎ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ جلد ۴ صفحہ ۳۴۸

۲؎ ترمذی، ابواب المناقب۔ مستدرک جلد ۴ صفحہ ۱۱

۳؎ مستدرک جلد ۴ صفحہ ۱۱

۴؎ ایضاً۔

ابن عماد حنبلی نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

الفقیھۃ الفاضلۃ عمرۃ بنت عبد الرحمٰن الانصاریۃ نشأت فی حجر عائشۃ فاکثرت الروایۃ منھا وھی العدل الضابطۃ لما یؤخذ منھا[1]

"فقہ و فضیلت رکھنے والی عمرہ بنت عبد الرحمٰن جن کی پرورش حضرت عائشہ رضہ کی گود میں ہوئی اور جنہوں نے حضرت عائشہ رضہ سے بہت زیادہ روایات کیں قابلِ اعتبار، ضبط اور حافظہ کی مالک اور ایسی کہ جن کی روایات قبول کی جاتی ہیں"

ان کے متعلق ابن حبان رح فرماتے ہیں:۔

کانت من اعلم الناس بحدیث عائشۃ[2]

"حضرت عائشہ رضہ کی روایات کی سب سے زیادہ جاننے والی تھیں"

دورِ تابعین کے نامور محدث اور فقیہ قاسم بن محمد نے امام زہری رح سے کہا کہ میں تمہارے اندر علم کی تشنگی محسوس کرتا ہوں۔ کیا میں تم کو ایک علم سے بھرے ہوئے برتن کی نشان دہی نہ کروں؟

زہری رح نے جواب دیا۔ ہاں ضرور۔

کہا جاؤ عمرہ بنت عبد الرحمٰن کی مجلس کو نہ چھوڑو کیونکہ وہ حضرت عائشہ رضہ کی پروردہ ہیں (اس لیے ان کے علم کی سب سے بڑی وارث بھی ہیں)

امام زہری رح فرماتے ہیں کہ ان کے حسبِ مشورہ میں عمرہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ واقعۃً علم کا نہ ختم ہونے والا سمندر ہیں[3]

---

[1] شذرات الذہب جلد ۱ صفحہ ۱۱۴۔

[2] تہذیب التہذیب جلد ۱۲ صفحہ ۴۳۹

[3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۱۰۶۔

حضرت ام سلمہ رض کے متعلق حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:-

کانت ام سلمۃ موصوفۃ بالجمال البارع والعقل البالغ والرأی الصائب [1]

"ام سلمہؓ انتہائی حسن کے ساتھ ساتھ پختہ عقل اور درستیٔ رائے سے بھی متصف تھیں"

ام سلمہ رض کی صاحبزادی حضرت زینبؓ بقول علامہ ابن عبد البرؒ "کانت من افقہ اہل زمانہا" [2] اپنے زمانہ کی بہت بڑی فقیہ تھیں۔

ابو رافع صائغ کہتے ہیں:-

کنت اذا ذکرت امرأۃ فقیھۃ بالمدینۃ ذکرت زینب بنت ابی سلمۃ [3]

"جب میں مدینہ کی کسی فقیہ عورت کا ذکر کرتا ہوں تو فوراً زینب بنت ابی سلمہ یاد آجاتی ہیں۔"

ام سلمہؓ کی ایک باندی ام الحسن نامی تھیں۔ ان کی صلاحیتوں کا یہ عالم تھا کہ عورتوں کو باقاعدہ وعظ و تبلیغ کیا کرتی تھیں [4]

ام المومنین حضرت صفیہؓ کے متعلق امام نوویؒ کا قول ہے:-

کانت عاقلۃ من عقلاء النساء [5]

"صاحب عقل و دانش خواتین میں سے تھیں"

---

[1] الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ جلد ۴ صفحہ ۴۵۹

[2] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرہ زینب بنت ابی سلمہ۔

[3] الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ جلد ۴ صفحہ ۳۱۷۔

[4] طبقات ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۳۵۴

[5] تہذیب الاسماء واللغات جلد ۲ صفحہ ۳۴۹

حضرت ابو درداءؓ کی بیوی امّ درداءؓ کے علم و فضل کا پایہ اتنا اونچا تھا کہ امام بخاری رحمہ نے ان کے عمل سے اپنی کتاب صحیح بخاری میں استدلال کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

کانت امّ الدرداء تجلس فی صلاتھا جلسۃ الرجل وکانت فقیھۃ[1]

"امّ درداء تشہد میں اسی طرح بیٹھتی تھیں جس طرح مرد بیٹھتا ہے اور وہ فقیہ تھیں۔ (اس لیے ان کا عمل قابل حجت ہے)۔"

ان کے متعلق علامہ ابن عبد البر رحمہ نے لکھا ہے:-

کانت من فضلاء النساء وعقلائھن وذوات الرأی منھن مع العبادۃ والنسك[2]

"عقل و فضیلت اور رائے و تدبیر رکھنے والی عورتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، اس کے ساتھ عبادت گزار اور متقی بھی تھیں۔"

امام نووی رحمہ نے تو ان کے فقہ و فہم پر سب کو متفق بتایا ہے۔

واتفقوا علی وصفھا بالفقہ والعقل والفھم والجلالۃ[3]

"لوگوں نے ان کی فقہ و عقل اور فہم و بزرگی پر اتفاق کیا ہے۔"

فاطمہ بنت قیسؓ کے تفقہ اور علم کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے ایک فقہی مسئلہ پر عرصہ تک بحث کرتی رہیں لیکن وہ ان کی رائے نہیں بدل سکے۔ اس سے بھی آگے یہ کہ امت کے بہت سے ائمہ

---

[1] بخاری، کتاب الاذان، باب سنۃ الجلوس فی التشہد۔

[2] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، تذکرۃ امّ الدرداء

[3] تہذیب الاسماء والصفات جلد ۲ صفحہ ۳۶۰

نے ان ہی کی رائے کو ترجیح دی ہے۔
امام نوویؒ نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے:۔

کانت من المھاجرات الاول ذات عقل وافر وکمال[1]

"وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے ابتدائی دور میں ہجرت کی تھی اور انتہائی عقل وکمال کی مالک تھیں"

حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ بڑے اونچے درجہ کی صحابیہ تھیں جن کی زندگی کا ذکر حافظ ابن حجرؒ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

ومناقبھا کثیرۃ شھیرۃ[2]

"ان کے فضائل ومناقب بہت زیادہ ہیں اور کافی مشہور ہیں"۔

امام نوویؒ شہادت دیتے ہیں:۔

کانت من فاضلات الصحابیات[3]

"علم وفضل رکھنے والی صحابیات میں سے ایک تھیں"

اسی قسم کی شہادت امام نووی رحؒ نے ام عطیہ کے بارے میں بھی دی ہے فرماتے ہیں:۔

وھی من فاضلات الصحابیات والغازیات منھن مع رسول اللہ[4]

"ان کا شمار فضیلت وبزرگی رکھنے والی اور حضور کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے والی صحابیات میں ہوتا ہے"

---

[1] تہذیب الاسماء والصفات جلد ۲ صفحہ ۳۶۳
[2] تہذیب التہذیب جلد ۱۲ صفحہ ۴۷۳
[3] تہذیب الاسماء والصفات جلد ۲ صفحہ ۳۶۳
[4] تہذیب الاسماء والصفات جلد ۲ صفحہ ۳۶۴

ام عطیہ رض سے احادیث روایت کرنے والوں میں حفصہ بنت سیرین ؒ بھی ہیں۔ یہ بارہ سال کی عمر ہی میں قرآن کی تعلیم سے فارغ ہو چکی تھیں[1] یہ بصرہ ہی کے ایک مشہور قاضی اور فقیہ ایاس بن معاویہ رحمہ کہتے ہیں

ما ادرکت احدا افضّله علی حفصة[2]

"میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں پایا جسے حفصہ بنت سیرین پر فضیلت دے سکوں"

تابعین کے امام سعید بن مسیبؒ نے اپنی لڑکی کا عقد اپنے ہی ایک شاگرد سے کرا دیا تھا۔ شادی کے دوسرے دن وہ حلقۂ درس میں شریک ہونے کی تیاری کرنے لگے تو صاحبزادی نے کہا۔

اجلس اعلّمك علم سعید۔

"تشریف رکھیے سعید بن مسیب جو تعلیم آپ کو دے سکتے ہیں وہ میں نہیں دے دوں"[3]

اسی طرح امام مالکؒ کی صاحبزادی کے علم و فضل کا یہ حال بیان کیا جاتا ہے کہ طالب علم اگر موطا پڑھتے ہوئے کہیں لغزش کھاتا تو وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتیں۔ امام موصوف کو ان کے علم پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ شخص سے کہتے:۔

ارجع فالغلط معك[4]

"دہراؤ تم غلطی کر رہے ہو"

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۱۲ صفحہ ۴۰۹

[2] ایضاً صفحہ ۴۰۹

[3] المدخل لابن الحاج، جلد ۱ صفحہ ۱۲

[4] ایضاً۔

کسی دور کے علمی و فکری ارتقا کا صحیح اندازہ چند نامور ہستیوں کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے غیر معروف اشخاص بلکہ عوام کی ذہنی سطح کے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بعد ہی ہم اس زمانہ کے عام معیار کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوں گے، اسی لیے ہم نے اوپر کے صفحات میں ان خواتین کے تذکرہ کے ساتھ جو اسلامی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں ایسی خواتین کا بھی ذکر کیا ہے جن کی ایک سوانح نگار کی نظر میں کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ اب ہم مزید ایسی ہی دو ایک خواتین کا ذکر کرنا چاہتے ہیں تاکہ عورت کو فکر کی بلندی عطا کرنے میں اسلام نے جو سعی کی ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکے۔

ام ورقہ بنت نوفل ایک صحابیہ گزری ہیں، ان کے متعلق مروی ہے۔

كانت قد قرأت القرآن وامرها ان تؤم اهل دارها [1]

"وہ قرآن پڑھی ہوئی تھیں، حضورؐ نے ان کو اپنے گھر والوں کی امامت کا حکم دیا تھا"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک مرتبہ ایک مسئلہ بیان فرمایا تو ام یعقوب نامی بنو اسد کی ایک عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔

لقد قرأت ما بين لوحي المصحف فما وجدته [2]

"مصحف کی دونوں دفتیوں کے درمیان جو کچھ ہے (یعنی پورا قرآن) میں پڑھ چکی ہوں لیکن آپ کا بیان کردہ مسئلہ کہیں نہیں دیکھا۔"

مشہور مالکی امام اشہبؒ نے ایک مرتبہ ایک لونڈی سے سبزی خریدی! اس زمانہ کا رواج یہ تھا کہ سبزی کی قیمت رقم کی شکل میں ادا کرنے کے بجائے سبزی فروش کو روٹی دے دی جاتی تھی۔ اشہبؒ کے پاس اس وقت روٹی نہیں

---

[1] ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ النساء۔

[2] مسلم کتاب اللباس والزینۃ، باب تحریم الواصلۃ الخ۔ بخاری، کتاب اللباس، باب المتنمصات۔

تھی، انہوں نے لونڈی سے کہا شام کو جب روٹی نان بائی کے ہاں سے آجائے تو آگر لے جانا، اس نے کہا جناب یہ تو ناجائز ہے۔ کیونکہ شریعت نے کھانے پینے کی چیزوں میں دست بدست تبادلہ کا حکم دیا ہے۔[1]

تحریر کا رواج

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں میں پڑھنے کی طرح لکھنا بھی عام ہو چکا تھا اور وہ تحریر کے اصول و آداب سے اس حد تک واقف ہو چکی تھیں کہ ان کے لیے خط و کتابت کرنے اور مختلف مسائل معاملات کو قلمبند کرنے میں کوئی زحمت نہیں پیش آتی تھی۔ اس کا اندازہ ذیل کے دو واقعات سے کیا جاسکتا ہے:۔

ربیع بنت معوذؓ کہتی ہیں کہ ہم چند عورتوں نے اسماء بنت مخرمہؓ سے عطر خریدا۔ جب انہوں نے عطر ہماری شیشیوں میں بھر دیا تو کہا۔

اکتبن لی علیکن حقی۔[2]

"تمہارے ذمہ جو واجب الادا رقم ہے وہ مجھے لکھواؤ"

عائشہؓ بنت طلحہؓ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بھانجی تھیں، حضرت عائشہؓ سے تعلق اور ان کے علم و فضل کی بناء پر مختلف علاقوں سے لوگ ان کو خطوط اور ہدایا روانہ کرتے تھے، حضرت عائشہؓ نے ان خطوط اور تحفوں کا ذکر کیا تو فرمایا خطوط کا جواب بھی دو اور ہدیہ کے عوض ہدیہ بھی بھیجو۔[3]

خواتین کی علمی خدمات

عورتوں کی اس قابلیت سے سوسائٹی کو کیا فائدہ پہنچا اور ان کی صلاحیتوں

---

[1] المدخل لابن الحاج، جلد ۱ صفحہ ۲۱۵

[2] طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۲۲۰

[3] الادب المفرد، باب الکتابۃ الی النساء وجوابہن۔

نے دین وملت کے کئی گوشوں کو تب و تاب بخشی والی سوالات کا جواب تاریخ کے صفحات پر دیتے ہیں کہ زندگی کے ہر میدان میں ان کے نقوش فہم و بصیرت نے جھلکی کا کام دیا ہے۔ اور وہ مردوں کے دوش بدوش امت کی ہدایت کا فریضہ انجام دیتی رہی ہیں۔

امام ابن قیم فرماتے ہیں:-

والذین حفظت عنهم الفتوى من اصحاب رسول الله مائة ونيف وثلاثون نفسا مابين رجل وامرأة۔

"رسول اللہ کے صحابہ میں جن لوگوں کے فتاویٰ محفوظ ہیں ان کی تعداد ایک سو تیس سے کچھ زائد ہے، اس میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔"

ان میں بھی سات اشخاص ایسے ہیں جن کے فتاویٰ کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ بقول علامہ ابن حزم ان میں سے ہر ایک کے فتووں کو اکٹھا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، ان سات اشخاص حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ جیسی ہستیوں کے ساتھ حضرت عائشہؓ بھی شامل ہیں۔ مفتیین صحابہ کی دوسری صف میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ وغیرہم کے دوش بدوش حضرت ام سلمہؓ بھی موجود ہیں ان میں سے ہر ایک کے فتاویٰ کے ذریعہ ایک رسالہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔

تیسرا گروہ ان اصحاب پر مشتمل ہے جنہوں نے بہت کم فتوے دیئے ہیں ان میں حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، ابوذرؓ اور ابوعبیدہؓ وغیرہم کے ساتھ ام عطیہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت صفیہؓ، لیلیٰ بنت قائفؓ، اسماء بنت ابی بکرؓ، ام شریکؓ، خولہ بنت تویتؓ، ام درداءؓ، عاتکہ بنت زیدؓ، سہلہ بنت سہیلؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت فاطمہؓ، فاطمہ بنت قیسؓ، ام سلمہؓ، زینب بنت ام سلمہؓ، ام ایمنؓ، ام یوسفؓ وغیرہ کا بھی شمار ہوتا ہے۔[1]

---

[1] اعلام الموقعین جلد ا صفحہ ۱۱ تا ۱۱۔

مختلف عقدہ ہائے حیات کو لے کر ان کی طرف چھوٹوں نے بھی رجوع کیا اور بڑوں نے بھی، مردوں نے بھی اور عورتوں نے بھی، اصحاب قرب و جوار نے بھی اور دور دور رہنے والوں نے بھی، اور ان خواتین امت کی دینی سمجھ بوجھ اور بصیرت و دانائی نے ان گرہوں کو کھولا اور راہ حق واضح کی۔

حضرت عائشہ رض کی مرجعیت کا اندازہ عائشہ بنت طلحہ کی اس تصریح سے کیا جا سکتا ہے:۔

کان الناس یأتونها من کل مصر [1]

"حضرت عائشہ رض کے پاس ہر شہر سے لوگ آیا کرتے تھے"

ظاہر ہے کہ لوگ دُور دُور سے محض رسمی ملاقات کے لیے تو حاضر نہیں ہوتے ہوں گے بلکہ اس کا مقصد زیادہ تر علمی استفادہ ہی رہتا ہوگا۔

حدیث کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہ رض نے حضرت عمر رض، عبداللہ بن عمر رض اور حضرت ابو ہریرہ رض جیسے وسیع النظر اصحاب کی بعض بعض آراء اجتہادات پر تنقید کر کے ان کے ذہن و فکر کو صحیح رُخ کی طرف موڑا ہے۔

صحابہ میں جو بڑے بڑے حفاظ حدیث تھے ان میں حضرت عائشہ بھی ہیں۔ آپ کی روایات کی تعداد دو ہزار دو سو دس ہے۔ حضرت انس رض کے علاوہ کسی اور صحابی کی روایات اتنی نہیں ہیں [2]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال، خوشی و ناخوشی سے اس وسیع واقفیت کا نتیجہ تھا کہ اکابر صحابہ تک مسائل دریافت کرنے کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔

---

[1] الادب المفرد، باب الکتابۃ الی النساء و جوابہن۔

[2] شذرات الذہب، جلد اصفہ

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضہ جیسے فقیہ و عالم صحابی حضرت عائشہ کے علم و واقفیت کے متعلق اپنا اور اپنے جیسے دوسرے ساتھیوں کا تجربہ بیان کرتے ہیں۔

ما اشکل علینا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث قط فسألنا عائشۃ الا وجدنا عندہا منہ علما[1]

"ہم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی کسی حدیث کے معاملہ میں کوئی مشکل پیش آئی اور ہم نے اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضہ سے دریافت کیا تو دیکھا کہ ان کو اس کے متعلق علم ضرور ہے۔"

فقیہ مدینہ عروہ بن زبیر اور مشہور محدث قاسم بن محمد کے متعلق ابن عماد حنبلی نے لکھا ہے:۔

وکانا من الآخذین عن عائشۃ الذین لا یکادون یتجاوزون قولہا المتفقہین بہا[2]

"یہ ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے حضرت عائشہ رضہ سے اخذ و استفادہ کیا اور جو ان کے اقوال سے کبھی تجاوز نہیں کرتے تھے اور ان ہی کے اندر رہ کر مسائل کا استنباط کرتے تھے۔"

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:۔

وقد حفظت عنہ شیئا کثیراً وعاشت بعدہ قریباً من خمسین سنۃ فاکثر الناس الاخذ عنہا ونقلوا عنہا من الاحکام والآداب شیئا کثیراً حتی قیل

---

[1] ترمذی، ابواب المناقب، باب فضل عائشہ رضہ۔

[2] شذرات الذہب، جلد ۱ صفحہ ۱۲۲۔

ان ربع الاحکام الشرعیۃ منقول عنہا رضی اللہ عنہا [1]

"حضرت عائشہ رض نے حضور سے بہت سی باتیں یاد رکھیں اور
آپ کے بعد تقریباً پچاس سال زندہ رہیں اور لوگوں نے ان سے بہت
زیادہ اخذ و استفادہ کیا اور بہت سے احکام و آداب ان سے نقل کیے
حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ شریعت کے ایک چوتھائی احکام آپ سے منقول ہیں"

حافظ ابن حجر رح نے ایک دوسرے مقام پر حضرت عائشہ رض سے حدیث کا استفادہ کرنے والے اٹھاسی افراد کے نام شمار کرنے کے بعد لکھ دیا ہے یعنی ان کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد نے آپ سے روایت کی ہے[2] ان میں عمرو بن العاص رض، ابو موسیٰ اشعری رض اور عبداللہ زبیر رض جیسے اصحاب سیاست بھی ہیں، اور ابو ہریرہ رض، ابن عباس رض اور ابن عمر رض جیسے محدث و فقیہ بھی۔ اس میں سرخیل تابعین سعید بن مسیب رح بھی ہیں اور علقمہ بن قیس جیسے نامور فقیہ بھی۔ ان میں آزاد اور غلام بھی ہیں اور مرد اور عورت بھی۔

حضرت صفیہ رض کے علم سے امت کو کتنا فائدہ پہنچا، اس کا اندازہ صہیرہ بنت جیفر کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہتی ہیں ہم چند خواتین حج سے فراغت کے بعد مدینہ گئیں اور حضرت صفیہ رض کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ دیکھا کہ وہاں پہلے ہی سے کوفہ کی کچھ عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ہم نے ان سے زن و شوہر سے متعلق مختلف مسائل اور حیض و نبیذ کے احکام دریافت کیے[3]

پتا نہیں اس طرح کتنے علاقوں کے لوگوں نے کتنے مسائل میں ان سے رہنمائی حاصل کی ہوگی۔

---

[1] فتح الباری، جلد ۷ صفحہ ۸۲، ۸۱

[2] تہذیب التہذیب، جلد ۱۲ صفحہ ۴۳۳

[3] مسند احمد، جلد ۶ صفحہ ۳۳۷۔

حضرت ام سلمہؓ سے احادیث روایت کرنے والے ۳۲ افراد کے نام بنام ذکر کے بعد حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ان کے علاوہ اور بھی لوگ ہیں جنہوں نے ان سے روایات لی ہیں؛ ان میں صحابہ اور نامور تابعین دونوں ہی شامل ہیں۔[1]

مروان کو ایک مسئلہ معلوم کرنا تھا، کہتا ہے:۔

کیف نسأل احدا عن شیئ وفینا ازواج النبیؐ۔

"جب ہمارے اندر ازواج مطہرات موجود ہیں تو کسی دوسرے سے کیوں اور کس لیے دریافت کریں"

چنانچہ اس نے حضرت ام سلمہؓ سے استفسار کرایا تو انہوں نے اس کی مشکل حل کی۔[2]

صحابہ کرامؓ کے علمی اختلافات اور الجھنوں کے رفع کرنے میں ازواج مطہراتؓ کے علم دین نے بڑی مدد دی ہے۔

امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں:۔

وقد کانت الصحابة یختلفون فی الشیء فتروی لهم احدی امهات المؤمنین عن النبیؐ فیاخذون به ویرجعون الیه ویترکون ما عندهم له۔[3]

"صحابہ کرامؓ کے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہوتا اور امہات المؤمنین میں سے کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں کوئی حدیث بیان کرتیں تو وہ اس کو فوراً قبول کر لیتے اور اپنے تمام اختلافات کو چھوڑ کر اس طرف رجوع کرتے۔"

---

[1] تہذیب التہذیب، جلد ۱۲، صفحہ ۴۵۶۔

[2] مسند احمد، جلد ۶، صفحہ ۳۲۲

[3] زاد المعاد، جلد ۴، صفحہ ۲۲۱

ربیع بنت معوذ سے مسائل دریافت کرنے کے لیے کبھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ حاضر ہوتے ہیں اور کبھی عبداللہ بن عمرؓ۔ ان سے احادیث روایت کرنے والوں میں مدینہ کے مشہور فقیہ سلیمان بن یسار بھی ہیں اور عمار بن یاسرؓ کے پوتے ابوعبیدہ، عبادہ بن ولید اور ابن عمرؓ کے غلام نافع رح جیسے ارباب علم وفضل بھی۔[1]

فاطمہ بنت قیسؓ سے قاسم بن محمدؒ، سعید بن المسیبؒ، عروہ بن زبیرؒ، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور شعبی جیسے فضلائے وقت نے حدیث میں اخذ و استفادہ کیا ہے۔[2]

ام عطیہؓ کے متعلق علامہ ابن عبدالبر رح لکھتے ہیں:۔

وشهدت غسل ابنة رسول الله وحكت ذالك فاتقنت وحديثها اصل فى غسل الميت وكان جماعة من الصحابة وعلماء التابعين بالبصرة ياخذون عنها غسل الميت ولها عن النبى احاديث روى عنها انس بن مالك ومحمد بن سيرين وحفصة بنت سيرين[3]

"یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے غسل میں شریک تھیں اور انہوں نے اس کو بیان کیا ہے اور بہت عمدگی سے بیان کیا ہے اور میت کے غسل کے سلسلہ میں ان کی حدیث اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ صحابہ اور علمائے تابعین بصرہ میں ان سے غسل میت سیکھتے تھے اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں جنہیں انس بن مالک، محمد بن سیرین اور حفصہ بنت سیرین نے روایت کیا ہے۔"

---

[1] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرہ ربیع بنت معوذ۔

[2] تہذیب التہذیب، جلد ۱۲ صفحہ ۴۴۴

[3] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب۔

عمرو بنت عبدالرحمن رض کی روایات حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کی نگاہ میں اس قدر اہمیت رکھتی تھیں کہ آپ نے ابوبکر بن محمد بن حزم کو حکم دیا کہ ان کو قلمبند کریں۔ عمرو بنت عبدالرحمن رض کی خدمت میں ابوبکر بن حزم ہی نہیں بلکہ امام زہری رح اور یحییٰ بن سعید رح جیسے یگانہ ہائے عصر کو استفادہ کے لیے حاضر ہونا پڑا ہے۔[1]

حضرت سعد بن وقاص کی صاحبزادی عائشہ رض کے حلقہ تلامذہ میں امام مالک رح، ایوب سختیانی اور حکم بن عتیبہ جیسے فقہاء و محدثین نظر آتے ہیں۔[2]

امام شافعی رح نے حضرت حسن رض کی پوتی سیدہ نفیسہ کی خدمت میں حاضر ہو کر علم حدیث حاصل کیا ہے۔[3]

ان چند اشارات کے ذریعہ دورِ اوّل کی خواتین کی علمی خدمات کا محض ایک مجمل سا نقشہ سامنے آسکتا ہے۔ تاریخ نے کسی دور اور کسی طبقہ کے تمام کاموں کا پوری طرح نہ تو کبھی احاطہ کیا ہے اور نہ کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسلامی تاریخ نے جو کچھ مواد چھوڑا ہے اگر اسی کی مدد سے ان خواتین کے علمی اور فکری کارناموں کی تفصیل فراہم کی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۳۵۳

[2] تہذیب التہذیب جلد ۱۲ صفحہ ۴۳۶

[3] وفیات الاعیان لابن خلکان، جلد ۲ صفحہ ۱۲۹

عورت میدانِ عمل میں

اسلام نے عورت کی جدوجہد کو صرف علم و فکر کے میدان تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس کی پرواز عمل کے لیے اس سے وسیع تر فضا مہیا کی ہے۔ وہ جس طرح علم و ادب کی راہ میں پیش قدمی کر سکتی ہے اسی طرح زراعت اور تجارت میں بھی ترقی کرنے کا حق رکھتی ہے، اس کو مختلف پیشوں اور صنعتوں کے اپنانے اور بہت سی ملی و اجتماعی خدمات کے انجام دینے کی بھی اجازت ہے۔ اجازت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی سعی و عمل کو برداشت یا گوارا کر لیا گیا ہے۔ بلکہ زندگی و حرکت کے جو داعیات اس کے اندر اٹھتے رہتے ہیں ان کو دبانے اور مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ ان کی تکمیل کی اس کو دعوت دی گئی ہے۔

اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبادہ بن صامت رضؓ کی بیوی ام حرام رضؓ کے گھر آرام فرما رہے تھے کہ اچانک مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے۔ ام حرام رضؓ نے وجہ مسرت دریافت کی تو بتایا کہ خواب میں مجھے میری امت کے وہ بلند مرتبہ افراد دکھائے گئے جو خدا کی راہ میں جہاد کے لیے سمندر کا سفر کریں گے، جس کا اجر اتنا بڑا ہے کہ وہ جنت میں بادشاہوں کی طرح تخت پر متمکن ہوں گے۔ ام حرام رضؓ نے حضورؐ سے درخواست کی دعا کیجیے اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان لوگوں میں داخل فرما دے۔ آپؐ نے اس سعادت مند گروہ میں ان کی شمولیت کی دعا کی۔ پھر آپ لیٹ گئے اور دوبارہ اُٹھے تو اس وقت بھی

مسرت و شادمانی کے وہی آثار نمایاں تھے۔ ام حرام رضہ نے سبب معلوم کیا تو وہی پہلا سبب بتایا۔ ام حرام رضہ نے اس مرتبہ بھی دعا کی درخواست کی تو فرمایا پریشان کیوں ہو، تمہارا شمار سابقین میں ہے۔"[1]

غور کیجیے! جہاد اور وہ بھی سمندر پار کر کے۔ زندگی کا سب سے زیادہ صبر آزما اور ایثار و قربانی کا طالب عمل، اس میں عورت کی شرکت کی حضور دعا فرما رہے ہیں۔ حالانکہ جہاد اس پر فرض نہیں ہے۔ اس سے اسلام کے مزاج اور رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ عورت اجتماعی سرگرمیوں سے بالکل کنارہ کش رہے اور اپنے دائرہ سے باہر کبھی کوئی کام انجام ہی نہ دے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کامیاب سماجی جدوجہد جن صفات کا تقاضا کرتی ہے، مثلاً جفاکشی، سادگی اور استقلال وغیرہ، فطری طور پر عورت کے اندر ان کی کمی ہوتی ہے۔ اور یہ صفات پیدا بھی اسی وقت ہوتی ہیں جب کہ انسان کو مخالف قوتوں سے تصادم اور کشمکش کرنی پڑے۔ لیکن چونکہ عورت عائلی زندگی سے تعلق کی بنا پر کشمکش سے دور رہتی ہے اس لیے مشکل ہی سے اس کے اندر یہ صفات پیدا ہو پاتی ہیں بلکہ اس کے برعکس گھر کی پرسکون زندگی اس کے اندر بڑی آسانی سے تکلف و تصنع، عیش و راحت، نازک طبعی اور غیر مستقل مزاجی جیسی خصوصیات ابھار دیتی ہے۔ اسلام نے کوشش کی ہے کہ یہ مذموم صفات اس کے اندر راہ نہ پانے پائیں اور وہ اس قابل ہو سکے کہ زندگی کے شدائد کا استقلال کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ اسی غرض سے شریعت نے اس کو پرمشقت اور سادہ زندگی کی تعلیم دی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو طبقوں کے متعلق فرمایا کہ وہ جہنمی ہیں جن سے ایک یہ ہے:-

ونساءٌ کاسیاتٌ عاریاتٌ ممیلاتٌ مائلاتٌ رؤوسهن

---

[1] بخاری، کتاب الجہاد، باب غزوۃ المرأۃ البحر۔

کاسیۃ العنت المائلۃ لا یدخلن الجنۃ ولا یجدن ریحہا وان ریحہا لتوجد من مسیرۃ کذا وکذا ؎

"وہ عورتیں جو لباس پہننے کے باوجود عریاں رہتی ہیں جو شک بنک کر چلتی ہیں اور جو اونٹ کے کوہان کی طرح اپنے مونڈھوں کو ہلا ہلا کر ناز و ادا کا اظہار کرتی ہیں وہ جنت میں داخل نہیں ہونگی بلکہ اس کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکیں گی، حالانکہ جنت کی مہک دُور دُور تک پھیلی ہوگی۔"

حضرت معاویہؓ نے ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے مصنوعی بالوں کی ایک لٹ اپنے ہاتھ میں لے کر مدینہ والوں سے سوال کیا۔

این علماءکم سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینھی عن مثل ھذا ویقول انما ھلکت بنو اسرائیل حین اتخذ ھذا نساؤھم ؎

"کہاں ہیں تمہارے علماء (کیوں وہ اس پر تنقید نہیں کرتے؟) میں نے اس کے استعمال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کرتے ہوئے سُنا ہے۔ آپؐ نے فرمایا بنو اسرائیل اس وقت تباہ ہوئے جب کہ ان کی عورتوں نے اسے اختیار کیا۔"

یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ عورت کے ایک عمل سے پوری قوم تباہ ہو جائے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا یہ نہیں ہے کہ یہ عمل ان کی تباہی کا واحد ذریعہ بنا تھا بلکہ آپ ایک متعین عمل کے ذریعہ اس ذہن و مزاج کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو افراد کو تیزی کے ساتھ ہلاکت و بربادی کی طرف لیے چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی قوم سادگی کے بجائے تصنع اور تکلف کی عادی اور جفاکشی کے

؎ مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب النساء الکاسیات الخ

؎ بخاری کتاب اللباس، باب الوصل فی الشعر، مسلم، کتاب اللباس والزینۃ۔

بجائے عیش و راحت کی طالب بن جائے تو کشمکش حیات میں وہ کبھی ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔

شریعت، ان ہی اسباب تباہی سے عورت کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے تاکہ زندگی کے کارزار میں اس کو نامرادیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض پورے کر سکے۔

جابر بن عبداللہ رضؓ کہتے ہیں کہ میری خالہ کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی (طلاق کے بعد ان کو عدت کے دن گھر ہی میں گذارنے چاہیئے تھے لیکن انہوں نے عدت کے دوران ہی میں) اپنے کھجور کے چند پیڑ کاٹنے اور فروخت کرنے کا ارادہ کیا تو ایک صاحب نے سختی سے منع کیا (کہ اس مدت میں گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے) یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں استفسار کے لیے گئیں تو آپ نے جواب دیا:

اخرجی فجدی نخلک لعلک ان تصدقی منہ او تفعلی خیرا۔[1]

(دیکھیں جاؤ اور اپنے کھجور کے درخت کاٹو اور فروخت کرو) اس رقم سے بہت ممکن ہے تو صدقہ وخیرات یا کوئی بھلائی کا کام کرسکو (اس طرح یہ تمہارے لیے اجر آخرت کا سبب ہوگا)"

ان الفاظ کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ کی خالہ کو انسانیت کی بہی خواہی اور فلاح و بہبود پر اکسایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت عورت کو اس قابل دیکھنا چاہتی ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی خدمت کر سکے اور اس کے ہاتھوں بھلے کام انجام پائیں۔

گھر سے باہر سعی و جہد کی اجازت

اس حدیث سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ پاکیزہ مقاصد کے حصول

---

[1] ابوداؤد کتاب الطلاق باب فی المبتوتۃ تخرج بالنہار رواہ مسلم وابن ماجۃ ایضاً۔

اور امورِ خیر کی تکمیل کے لیے عورت گھر سے باہر نکل سکتی ہے اور یہ کہ دورِ اوّل کی خواتین ضرورت پر بازار اور کھیت وغیرہ آیا جایا کرتی تھیں کیونکہ اگر پہلے سے کوئی عمومی ممانعت ہوتی تو حضرت جابرؓ کی خالہ کھیت جانے کا قصد ہی کیوں کرتیں اور بحث بھی یہ نہ چھڑتی کہ فلاں مخصوص حالت میں ان کا گھر سے نکلنا جائز ہے یا نہیں؟

بعض دوسری روایات سے یہ بات اور واضح ہو گئی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا احکامِ حجاب کے نازل ہونے کے بعد کا واقعہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سودہؓ کو باہر دیکھ کر تنقید کی تو وہ خاموشی سے گھر واپس چلی آئیں اور حضورؐ سے اس کا تذکرہ کیا۔ اس کے فوراً بعد آپ پر نزولِ وحی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپؐ نے فرمایا۔

انّہ اذن لکم تخرجن لحاجتکن [1]

"بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی ضروریات کے لیے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔"

اس کی عملی سرگرمیوں نے تو اس امر کے قطعی اور یقینی شواہد فراہم کر دیئے ہیں کہ اس نے امورِ خانہ داری کے علاوہ دوسری بہت سی مصروفیات، اندرونِ خانہ و بیرونِ خانہ جاری رکھیں اور اسلامی معاشرہ کبھی ان میں حائل نہیں ہوا۔

کاشت کاری

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی خالہ کا واقعہ کھیتی باڑی کے کاموں سے ان کے تعلق کا پتہ دیتا ہے جس کا ذکر ابھی گزر چکا ہے۔

سہل بن سعدؓ ایک اور خاتون کا ذکر کرتے ہیں جن کی اپنی کھیتی تھی، اور وہ پانی کی نالیوں کے اطراف چقندر کی کاشت کیا کرتی تھیں۔ جمعہ کے دن سہل بن سعدؓ اور

---

[1] بخاری، کتاب التفسیر سورۃ الاحزاب، باب قولہ لا تدخلوا بیوت النبی الخ۔ مسند احمد جلد ۶ ص ۵۶

بعض دیگر صحابہ ان سے ملاقات کے لیے جاتے تو وہ چقندر اور آٹے سے تیار کردہ حلوہ ان کو کھلاتیں۔[1]

حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی اسماء اپنا ابتدائی حال بیان کرتی ہیں کہ حضرت زبیرؓ سے میرا بیاہ ہو چکا تھا لیکن ان کے پاس ایک پانی لادنے والے اونٹ اور ایک گھوڑے کے سوا نہ تو کسی قسم کا کوئی مال تھا نہ خادم، اور نہ کوئی دوسری چیز۔ میں خود ہی ان کے گھوڑے کو چارہ دیتی، پانی پلاتی اور اس کا ڈول بھرتی، گھر کا کام کاج بھی مجھ ہی کو کرنا پڑتا تھا (چنانچہ) مجھے خود ہی آٹا گوندھنا اور روٹی پکانا پڑتی۔ میں روٹی اچھی نہیں پکا سکتی تھی۔ پڑوس میں انصار کی کچھ عورتیں تھیں جو اپنی دوستی میں بڑی مخلص ثابت ہوئیں، وہ میری روٹی پکا دیا کرتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیرؓ کو میرے مکان سے دو میل کے فاصلہ پر ایک زمین کاشت کرنے اور فائدہ اٹھانے کے لیے دے رکھی تھی۔ میں اس زمین سے کھجور کی گٹھلیوں کی ٹوکری سر پر لیے آ رہی تھی کہ راستہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے مجھے بلایا تاکہ اپنی سواری کے پیچھے بٹھا لیں۔ لیکن چونکہ آپ کے ساتھ انصار کے بعض افراد بھی تھے، اس لیے مجھے مردوں کے ساتھ چلنے میں شرم محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی حضرت زبیرؓ بھی یاد آ گئے کہ وہ انتہائی غیور انسان ہیں، اس کو پسند نہیں کریں گے۔ چنانچہ میں پس و پیش کرنے لگی تو حضورؐ نے بھانپ لیا اور آگے بڑھ گئے۔[2]

تجارت

خواتین کی تعلیم و تربیت اور اس کے نتائج کے تحت ایک سبزی فروش باندی کا تذکرہ آ چکا ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الجمعہ، باب قول اللہ تعالٰی فاذا قضیت الصلوٰۃ الخ

[2] بخاری، کتاب النکاح، باب الغیرۃ۔

قیلہؓ نامی ایک صحابیہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "انی امراۃ ابیع واشتری" میں ایک ایسی عورت ہوں جو مختلف چیزوں کو بیچتی اور خریدتی رہتی ہوں (یعنی تاجرہ ہوں) اور پھر آپ سے خرید و فروخت سے متعلق مسائل دریافت کیے۔[1]

حضرت عمرؓ کے دور خلافت کا واقعہ ہے کہ اسماء بنت مخرمہؓ کو ان کے لڑکے عبداللہ بن ابی ربیعہ یمن سے عطر روانہ کرتے تھے اور وہ اس کا کاروبار کرتی تھیں۔[2]

عمرہ بنت طبیخ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ اپنی لونڈی کے ساتھ بازار جاکر میں نے مچھلی خریدی اور اس کو جھوے میں رکھا (لیکن چونکہ جھولا چھوٹا تھا) اس لیے مچھلی کا سر اور دُم باہر نکل رہی تھی۔ حضرت علیؓ کا ادھر سے گذر ہوا تو دیکھ کر پوچھا کتنے میں خریدی ہے؟ یہ تو بہت بڑی بھی ہے اور نفیس بھی۔ اس سے گھر کے سب لوگ سیر ہوکر کھا سکتے ہیں۔[3]

صنعت وحرفت

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی صنعت وحرفت سے واقف تھیں اس کے ذریعہ اپنے اور اپنے خاوند اور بچوں کے اخراجات بھی پورے کرتی تھیں ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا:۔

انی امراۃ ذات صنعۃ ابیع منہا ولیس لی ولا لزوجی ولا لولدی شیئ۔

"میں ایک کاریگر عورت ہوں، چیزیں تیار کرکے فروخت کرتی ہوں (اس طرح میں تو کما سکتی ہوں لیکن) میرے شوہر اور بچوں کا کوئی ذریعہ آمدنی

---

[1] طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۲۲۸

[2] طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۲۲۰، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرہ ربیع بنت معوذ

[3] طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۲۱۳

نہیں ہے اس لیے) ان کے پاس کچھ نہیں ہے"

اور دریافت کیا کہ کیا وہ ان پر خرچ کر سکتی ہیں؟ آپؐ نے جواب دیا، ہاں!

تم کو اس کا اجر ملے گا۱؎

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ابن سعد نے ذکر کیا ہے۔ خولہ بنت ثعلبہؓ سے ان کے شوہر نے ایک مرتبہ غیر ارادی طور پر کہہ دیا کہ آج سے تمہاری حیثیت میری ماں کی سی ہے۔ بعد میں دونوں مسئلہ دریافت کرنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، چونکہ اس وقت تک اس مسئلہ میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا اس لیے آپؐ نے شوہر کو حکم دیا کہ ابھی جانے تک تم اپنی بیوی سے الگ رہو یہ سن کر بیوی نے کہا:

یا رسول اللہ مالہ من شیء وما ینفق علیہ انا لہ

"اللہ کے رسول! ان کے پاس تو خرچ کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، میں ہی ان پر خرچ کرتی ہوں (پھر وہ مجھ سے الگ رہ کر کس طرح زندگی گزار سکتے ہیں!)۲؎

حقوق کی حفاظت

اسلامی معاشرہ نے عورت کو جو حقوق و مراعات عطا کیے ہیں ان سے اس نے فائدہ بھی اٹھایا ہے اور جہاں کہیں دیکھا کہ اس کے حقوق تلف کیے جا رہے ہیں یا اس پر کسی قسم کی زیادتی ہو رہی ہے تو اس نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے پوری بصیرت کے ساتھ جد و جہد بھی کی ہے اور اسلامی قانون نے ایسے تمام مواقع پر اس کو کامیاب بنایا ہے۔

ایک صاحب نے اپنی لڑکی کا نکاح ایک مالدار شخص سے کر دیا لیکن لڑکی اس کو پسند نہیں کر رہی تھی، اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا

۱؎ ایضاً صفحہ ۲۱۲، والمعنی موجود فی الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ۔ جلد ۴ صفحہ ۳۰۱

۲؎ طبقات ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۲۷۴

ان ابی زوجنی ابن اخیہ لیرفع بی خسیسہ

"میرے والد نے میری شادی اپنے ایک دولتمند بھتیجے سے کر دی ہے تاکہ مجھ کو پھنسا کر اپنی کشمکش کا سامان کریں۔"

آپ نے فرمایا اگر تجھ کو یہ عقد پسند نہیں ہے تو تو آزاد ہے۔ اس نے کہا۔

قد اجزت ما صنع ابی ولکن اردت ان تعلم النساء ان لیس للآباء من الامر شیئ [1]

"میرے والد نے جو اقدام کیا ہے میں اس کو بحال کرتی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ عورتوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان کی مرضی کے خلاف باپوں کو ان کے نکاح کا حق نہیں ہے"

یہ گویا ایک عورت کا اپنے باپ کی زیادتی کے خلاف کامیاب احتجاج تھا۔ بریرہ رض ایک لونڈی تھیں جن کا نکاح مغیث نامی ایک غلام سے ہوا تھا۔ ایک عرصہ بعد بریرہ رض آزاد ہو گئیں تو انہوں نے مغیث رض کے نکاح میں رہنے سے انکار کر دیا کیونکہ اصولِ شریعت کے تحت آزاد عورت کا غلام کے عقد میں رہنا ضروری نہیں ہے۔ لیکن مغیث رض بریرہ رض سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ بریرہ رض کے اس فیصلہ کے بعد زار و قطار روتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے دوڑتے پھرتے تھے۔ رحمتِ عالم نے یہ منظر دیکھ کر بریرہ رض سے کہا۔

یا بریرۃ اتقی اللہ فانہ زوجک و ابو ولدک۔

"بریرہ! خدا سے ڈرو اور اس کی محبت و بے قراری کا خیال کرو وہ کل تک تیرا شوہر رہا ہے اور اس سے تجھے اولاد بھی ہو چکی ہے"

بریرہ رض نے دریافت کیا "اتامرنی بذالک" کیا آپ مجھے اس کی بیوی بنے

---

[1] مسند احمد، جلد ۶ صفحہ ۱۳۶۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب، من زوج ابنتہ وہی کارہۃ۔

رہنے کا حکم دے رہے ہیں!

آپ نے جواب دیا "لا انما انا شافع" نہیں میں اس کا کیسے حکم دے سکتا ہوں ایسی تو تم سے سفارش کر رہا ہوں۔

اس نے کہا "فلا حاجة لی فیہ" تو مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے[1]۔

غور کیجئے! اسلامی حکومت کی لونڈی، ایک تو یہ کہ اس نازک فرق کو اچھی طرح سمجھتی تھی جو نبی کے حکم اور سفارش کے درمیان ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ اس کو مکمل یقین تھا کہ وہ صحیح طریقہ پر اپنے حق کے لیے جو سعی کرے گی، قانون اس کو ناکام نہیں ہونے دے گا۔

دورِ رسالت میں خواتین، نماز میں شرکت کے لیے مسجد میں آتی تھیں۔ لیکن بعض اسباب کے تحت حضرت عمرؓ نے محسوس کیا کہ گھروں سے باہر ان کی آمد و رفت مناسب نہیں ہے۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اس کی اجازت حاصل تھی اس لیے قانوناً کوئی پابندی بھی لگانا نہیں چاہتے تھے۔ خود حضرت عمرؓ کی بیوی عاتکہؓ اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر جماعت میں شریک ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا: "واللہ انک لتعلمین انی ما احب هذا" قسم خدا کی تم جانتی ہو کہ تمہارا یہ فعل مجھے پسند نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود تم اس سے باز نہیں آتیں۔

انہوں نے جواب دیا: "واللہ لا انتھی حتی تنہانی" واللہ! جب تک آپ مجھے مسجد جانے سے حکماً نہیں روکیں گے میں رکوں گی نہیں۔

روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کی زندگی بھر اپنا طریقہ نہیں چھوڑا جس دن مسجد میں حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا، اس دن بھی وہ وہاں موجود تھیں[2]۔

---

[1] بخاری، کتاب الطلاق، باب شفاعۃ النبی فی زوج بریرۃ۔ ابوداؤد، کتاب الطلاق باب فی مملوکۃ تعتق الخ۔

[2] بخاری، کتاب الجمعۃ، باب ہل علی من لم یشہد الجمعۃ غسل الخ مع فتح الباری، جلد ۲ صفحہ ۲۹۱۔

بالفاظ دیگر عائشہ رض حضرت عمر رض سے یہ کہہ رہی ہیں کہ بحیثیت ایک شوہر کے آپ کو یہ حق ہے کہ مجھے گھر سے باہر جانے کی مجھے اجازت نہ دیں اور مجھ پر اس کی اتباع بھی ضروری ہو گی۔ لیکن جہاں تک آپ کی خواہش کا تعلق ہے میں اس کی پابند نہیں ہوں۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ عائشہ رض کا یہ عمل قابل ستائش تھا یا نہیں؟ اس وقت جس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے وہ ہے ایک عورت کا اپنے معمولی سے حق پر اصرار اور اس کی کامیابی۔ عائشہ رض شریعت کی ایک رعایت سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں لیکن اسے بہتر نہ سمجھنے کے باوجود حضرت عمر رض کو یہ گوارا نہیں کہ ان کو زبردستی اس سے محروم کر دیں۔ حالانکہ آپ عائشہ رض کے شوہر اور اس سے بھی آگے یہ کہ خلیفہ وقت تھے، اس لیے آپ کو بجا طور پر اس کا حق تھا کہ بیوی کے جس عمل کو خلاف مصلحت دیکھیں اس پر قدغن لگا دیں۔ اس معمولی سے واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کے حقوق کا کتنا اور کہاں تک احترام کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی ازواج مطہرات نے ایک مرتبہ بہتر اور خوشحال زندگی کا مطالبہ کیا۔ چونکہ یہ مطالبہ ان کی حیثیت سے فروتر اور خود آپ جس طرز زندگی کو اپنائے ہوئے تھے اس کے منافی تھا اس لیے آپ کو سخت صدمہ ہوا اور آپ نے ازواج سے ایک مہینہ تک قطع تعلق کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی اطلاع جب حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض کو ملی تو بے حد پریشان ہوئے اور اپنی صاحبزادیوں حضرت عائشہ رض اور حضرت حفصہ رض کو سختی اور نرمی ہر طرح سے سمجھایا کہ تمہارا یہ تقاضا صحیح نہیں ہے، اس کے بعد دیگر ازواج مطہرات کو بھی سمجھانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ حضرت ام سلمہ رض کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا:-

ما لكما ولنا هاهنا رسول الله اعلى بامرنا لعيننا ولو اراد ان ينهانا لنهانا فمن نسأل اذا لم نسأل رسول الله صلى الله عليه وسلم هل نبيد خل بينكما وبين اهليكما احد؟ فما تكلفكما هذا[1]

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۸ ص ۱۲۹ صحیح مسلم کتاب الطلاق، وردا ابن سعد کی (باقی صفحہ ۱۳۲ پر)

"آپ حضرات کا یہاں کیا کام ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے حالات سے بخوبی واقف ہیں، اگر آپ ہمیں منع کرنا چاہیں تو منع کر سکتے ہیں (پھر ہم مطالبہ نہیں کریں گے) اگر ہم رسول اللہؐ سے مطالبہ نہ کریں تو کس سے کریں! کیا آپ حضرات اور آپ کی بیویوں کے معاملات میں بھی کوئی شخص مداخلت کرتا ہے! آپ تشریف لے جائیں، ہم آپ کو اس کی تکلیف نہیں دے رہے ہیں۔

دیکھئے! خاوند اور بیوی کے تعلقات کے درمیان حضرت ام سلمہؓ بڑے سے بڑے آدمی کی مداخلت کو بھی گوارا نہیں کر رہی ہیں اور شوہر سے جائز راحت و آسائش کے مطالبہ کا ہر عورت کو حق دینا چاہتی ہیں۔

اجتماعی مفاد کے لیے کوشش

ان واقعات سے یہ استدلال تو صحیح ہوگا کہ اسلامی معاشرہ عورت پر ظلم و زیادتی کو بہرے کانوں سے نہیں سنتا اور اندھی آنکھوں سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ اس کے حقوق کا پاسبان و محافظ ہوتا ہے اور عدل و انصاف کے لیے اس کی ہر صدا کا جواب دینا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ چودہ سو سال قبل کی اسلامی ریاست میں جسے ہم نمونتہً پیش کرتے ہیں، عورت کو ہر وقت ایک ظالم حریف سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور اس نے اپنی زندگی اس کے جور و ستم کے مٹانے میں لگا دی۔ کیونکہ یہ ایسا نتیجہ ہے جس سے اسلامی تاریخ انکار کرتی ہے۔ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ اپنے مفاد کے لیے جنگ اسلامی معاشرہ کے مزاج کے خلاف ہے۔ وہ ایک دوسرے سے برسرپیکار اور متضاد طبقات اور گروہوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۱ سے) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف حضرت عمرؓ نے حضرت ام سلمہؓ سے ملاقات کی تھی لیکن چونکہ مذکورہ بالا روایت میں حضرت ابوبکرؓ کا بھی ذکر ہے اور ساتھ ہی اس سے ام سلمہؓ کا جواب واضح طور پر سامنے آتا ہے اس لیے ہم نے اسی کو درج کیا ہے۔

بجائے ایسے افراد کا مجموعہ تھا جن کے درمیان الفت و محبت کا رشتہ قائم تھا۔ اس کے خلاف اگر کوئی واقعہ ملتا ہے تو اسے کسی کو ضرر رسانی کی بالارادہ کوشش نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ اس کی حیثیت اتفاقی حادثہ اور غیر شعوری لغزش سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی۔ اس کا ثبوت ہمیں ان بے شمار خدمات سے ملتا ہے جو خواتین نے معاشرہ کے مفاد اور اس کے بقاء و تحفظ کے لیے انجام دی ہیں۔ ان خدمات کے پیچھے شخصی منفعت کے بجائے جماعت کی خیر خواہی اور اس کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ کار فرما رہا ہے۔ اس کا ثبوت آپ کو آئندہ باب میں ملے گا۔

اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں عورت کا حصّہ

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان خواتین نے اپنے دین کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ اس کے لیے انہوں نے قریب ترین تعلقات اور رشتوں پر چھری پھیر دی۔ خاندان اور قبیلہ سے جنگ مول لی مصیبتیں سہیں، گھر بار چھوڑا، غرض یہ کہ مفاد دین سے ان کا جو بھی مفاد ٹکرایا اسے ٹھکرانے میں انہوں نے کوئی تامل اور پس و پیش نہیں کیا اور آخری وقت تک اپنے رب سے وفاداری کا جو عہد کیا تھا اس پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔

مسلمان خواتین کی قربانیاں

مکہ کے ابتدائی دور میں جن سعادت مند اور باہمت نفوس نے ایمان قبول کیا تھا ان میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا خاندان بھی تھا۔ ان کی والدہ ابوحذیفہ بن مغیرہ کی باندی تھیں، ان کو دین سے پھیرنے کے لیے ہر طرح کی اذیت دی جاتی تھی یہاں تک کہ ابوجہل نے اس جرم حق کی پاداش میں نیزہ مار کر ان کو شہید کر دیا لیکن ان کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ یہ پہلی شہادت تھی جو حضورؐ کے پیغام پر لبیک کہنے کے نتیجہ میں کسی کو نصیب ہوئی۔ [1]

حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ بنت خطاب ایمان لے آئیں تو حضرت عمرؓ نے ان کو اس قدر زدوکوب کیا کہ لہولہان ہو گئیں لیکن اس کے باوجود اپنے موقف

---

[1] طبقات ابن سعد، جلد ۸ ص ۱۹۳۔

سے جو عہد وفا باندھا اس میں کوئی کمزوری نہ آنے پائی۔ حضرت عمرؓ کی سختی کے جواب میں کہتی ہیں:۔

یا ابن الخطاب ما کنت صانعًا فاصنعہ فانی قد اسلمت۔

"ابن خطاب! میں تو ایمان قبول کر چکی اب جو چاہو کر گزرو میں اس سے پھر نہیں سکتی۔"

حضرت عمرؓ نے قرآن کو ہاتھ میں لینا چاہا تو کہا:۔

وحتّٰی لعنلك یا ابن الخطاب انت لا تغتسل من الجنابۃ وھذا لایمسہ الا المطھرون[1]

"ابن خطاب! اس کو رکھ دو کیونکہ تم جنابت سے پاکی نہیں حاصل کرتے اور یہ وہ کتاب ہے جس کو پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔"

ابو سفیان کے ایمان لانے سے قبل کا واقعہ ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوئے تو اپنی بیٹی ام المومنین ام حبیبہؓ سے بھی ملنے گئے۔ گھر میں ذات اقدس کا بستر بچھا ہوا تھا وہ اس پر بیٹھنے لگے تو بیٹی نے فوراً اس کو تہہ کر دیا۔ باپ کے لیے یہ حرکت سخت تعجب خیز تھی۔

پوچھا کیا تم نے اس کو میرے شایانِ شان نہ سمجھ کر اٹھا دیا یا مجھے اس قابل نہ سمجھا کہ اس پر بیٹھوں۔

بیٹی نے جواب دیا۔ یہ رسولِ خدا کا بستر ہے اور آپ مشرک اور نجس ہیں۔ میں اس مقدس بستر پر آپ کو بٹھا کر اس کو پلید کرنا نہیں چاہتی[2]

---

[1] مستدرک حاکم، جلد ۴ صفحہ ۵۹ تا ۶۰۔ امام ذہبی نے اس روایت کی سند جرح کی ہے لیکن مختلف محدثین و مؤرخین نے اس واقعہ کو کئی ایک سندوں سے نقل کیا ہے۔ بعض حوالے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیے ہیں ملاحظہ ہو الاصابہ فی تمییز الصحابہ، جلد ۴ صفحہ ۲۸۱۔

[2] طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۷۰۔

قرآن مجید کا حکم ہے کہ خدا کے دشمنوں اور مخالفین سے اہل ایمان کو کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ ایک مرتبہ حضرت اسماء رضہ کی مشرک والدہ قتیلہ بنت عبدالعزیٰ تحفے تحائف لیے ہوئے مکہ سے مدینہ ان کے گھر آئیں۔ حضرت اسماءؓ نے ماں کے تحفوں کو قبول کرنے بلکہ ان کو اندر آنے کی اجازت دینے سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھوایا کہ کیا میں ان کو اپنے گھر ٹھہرا سکتی ہوں؟ اور یہ کہ وہ مجھ سے مدد اور ہمدردی کی توقع رکھتی ہیں کیا ان کے ساتھ تعاون اور حسن سلوک میرے لیے جائز ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا ہاں! تمہارے لیے یہ دونوں باتیں جائز ہیں لہ

رقیقہ بنت ابی صیفی رضہ نے مکہ کے نازک ترین دور میں صدائے حق پر لبیک کہی تھی۔ قریش نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنایا تو انہوں نے ہی آپ کو قبل از وقت متنبہ کیا کہ آپ پر شبخون مارنے کا فیصلہ ہو چکا ہے (لہٰذا آپ اپنی حفاظت کا سامان فرما لیجیے) چنانچہ آپ راتوں رات مکہ سے مدینہ ہجرت فرما گئے۔

یہ ایمان لا چکی تھیں لیکن ان کے لڑکے مخرمہ ابھی حالت کفر ہی پر قائم تھے۔ اپنی اولاد ہونے کی وجہ سے مومن ماں نے بیٹے کی اس کی بے دینی روش کو ہنسی خوشی برداشت نہیں کیا بلکہ ماں کی مامتا پر ہمیشہ جذبات ایمانی غالب رہے اور مخرمہ کے ساتھ انتہائی سخت روش روا رکھی لہ

جن لوگوں نے حضرت عائشہ رضہ پر افترا پردازی میں حصہ لیا ان میں مسطح بن اثاثہ بھی تھے۔ ان کی ماں کے ایمانی تقاضوں نے اس کی اجازت نہ دی کہ بیٹے

لہ بخاری، کتاب، باب صلۃ الوالد المشرک، طبقات، جلد ۸، صفحہ ۱۸۲۔ امام بخاری اور ابن سعد میں سے ہر ایک نے واقعہ کا صرف ایک ایک پہلو بیان کیا ہے ہم نے دونوں کی روایات کو سامنے رکھا ہے

لہ طبقات ابن سعد، جلد ۸، صفحہ ۱۷۹۔

کی اس غلط حرکت کو گوارا کر لیں یا کم از کم تاویل و توجیہ کے پردوں میں اس کو چھپا دیں۔ ابن سعد نے لکھا ہے:-

كانت من اشد الناس على مسطح حين تكلم مع اهل الافك فى عائشة رض [1]

"مسطح نے جب حضرت عائشہؓ پر افتراپردازی کرنے والوں کے ساتھ تہمت باندھنے میں حصہ لیا تو یہ ان پر اور تمام لوگوں سے زیادہ سخت تھیں"

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت ان کے اس غیر شرعی اور ناروا عمل پر پیچ و تاب کھاتیں اور غم و غصہ کا اظہار کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے ساتھ باہر سے گھر آرہی تھیں کہ پیر میں چادر الجھ گئی تو ایک دم وہی اندرونی جذبات ابھر آئے اور بیٹے کو بد دعا دینے لگیں۔ حضرت عائشہؓ کو اس وقت تک مسطح کی اس حرکت کا علم نہیں تھا اس لیے وہ مدافعت کرنے لگیں، تو انہوں نے ان افواہوں کا ذکر کیا جو مدینہ کی فضا میں گشت کر رہی تھیں [2]

جنگی خدمات

اس سے پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ شریعت نے ریاست کے دفاع اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری عورت پر نہیں ڈالی ہے لیکن اس کے باوجود خدا کے دین کو سربلند دیکھنے کی تمنا اس کو دشمن کے خلاف محاذ جنگ پر لے آتی اور مردوں کے ساتھ وہ بھی کفر کا علم سرنگوں کرنے میں حصہ لیتی۔

ایک انصاری صحابیہ ام عمارہ رض نے جنگ احد میں مردوں کی سی ثبات قدمی اور بیباکی کا مظاہرہ کیا۔ سعد بن ربیع کی صاحبزادی ام سعد نے ان سے اس کارنامہ کے متعلق دریافت کیا تو تفصیل سے بتایا کہ میں صبح سویرے ہی مجاہدین کی خدمت کے لیے میدان کارزار میں پہنچ گئی تھی۔ ابتدا میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا لیکن بعد

---

[1] طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۱۶۱

[2] بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافک۔

میں جب فتح و نصرت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو ان میں افراتفری اور انتشار پھیل گیا۔ اس وقت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ کر آپ کی مدافعت میں تیر اور تلوار چلانے لگی۔ یہاں تک کہ دشمن کی ضرب مجھ پر آن پڑی۔ ام سعد کہتی ہیں کہ میں نے ان کے کندھے پر بہت ہی گہرے زخم کا نشان دیکھا اور پوچھا۔ کس نے آپ پر اتنا سخت حملہ کیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا ابن قمئہ نے! خدا اسے غارت کرے، جب مسلمان شکست کھا کر حضور کے پاس سے بھاگ کھڑے ہوئے تو یہ چلاتا ہوا آیا، بتاؤ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہے؟ اگر وہ اس جنگ میں بچ گیا تو میری نجات نہیں یہ میری ہلاکت اور موت ہے۔ یہ سن کر میں اور مصعب بن عمیرؓ اور چند دوسرے اصحاب لے جو آپ کے ساتھ جمے ہوئے تھے اس کا سامنا کیا۔ اس مقابلہ میں اس نے مجھ پر یہ وار کیا جس کا نشان تم دیکھ رہی ہو۔ میں نے بھی تلوار سے کئی ایک حملے اس پر کیے لیکن دشمن خدا دو دو زرہیں پہنے ہوئے تھا۔ ؎

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں انہوں نے جس ہمت اور پامردی کا ثبوت دیا اس کی شہادت خود آپ نے ان الفاظ میں دی ہے۔

وما التفتّ یمینا ولا شمالا الّا وانا اراھا تقاتل دونی۔

"دائیں بائیں جس طرف بھی میں نے رخ کیا اُم عمارہ کو اپنی مدافعت میں لڑتے دیکھا۔"

ان کے صاحبزادہ کو ایک شخص نے گھائل کر دیا۔ جب اس کا ادھر سے گزر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ ام عمارہ! یہ ہے تمہارے بیٹے کو زخمی کرنے والا اور یہ اس پر ٹوٹ پڑیں اور اتنی زور سے تلوار چلائی کہ وہ وہیں گر پڑا۔ حضور مسکراتے ہوئے فرمایا، ام عمارہ! تم نے اپنے بیٹے کا بدلہ لے لیا۔ خود کہتی ہیں،

؎ سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۱۳۹، طبقات ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۳۰۱

اس کے بعد ہم اس پر مسلسل تیر برسانے لگے یہاں تک کہ اس کو ختم کر کے چھوڑا۔ یہ دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے تجھ کو اس پر غلبہ عطا کیا اور تیری آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی اور تیرے لڑکے کا بدلہ تجھ کو دکھایا۔

ایک اور واقعہ بیان کرتی ہیں کہ ایک شہسوار آگے بڑھتے ہوئے آیا اور مجھ پر وار کیا میں نے ڈھال پر اس کو روک کر ناکام بنا دیا جب وہ پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگا تو میں نے اُس کے گھوڑے پر حملہ کر کے اس کے پیر کاٹ دیئے اور وہ پشت کے بل گر پڑا۔ حضورؐ اس کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔ آپؐ نے میرے لڑکے کو آواز دی، امّ عمارہ کے بیٹے! جاؤ اپنی ماں کی مدد کرو۔ چنانچہ وہ دوڑا ہوا آیا اور اس کی مدد سے میں نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس دن ان کے بھاؤ اور ثابت قدمی کو دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا۔

لمقام نسیبة بنت کعب الیوم خیر من مقام فلان وفلان۔

"آج نسیبہ بنت کعب (امّ عمارہ) کی ثابت قدمی اور استقلال فلاں اور فلاں سے بہتر ہے"

ذرا اس جرأت اور ہمت کو دیکھیے کہ بدن پر تیر سے اور شمشیر کے، ایک دو نہیں، بارہ زخم آچکے ہیں اور ابن قمئہ نے جو وار کیا تھا وہ اتنا گہرا تھا کہ اس کے بھرنے ہی میں ایک سال لگ گیا لیکن اس کے باوجود حضورؐ نے احد کے فوراً ہی بعد مشرکین کے مقابلے کے لیے حمراء الاسد نامی مقام کی طرف چلنے کا حکم دیا تو یہ کمربستہ ہو گئیں لیکن کافی خون نکلنے کی وجہ سے اس قدر کمزور ہو چکی تھیں کہ مجبوراً نہیں چل سکیں اور مدینہ لوٹ گئیں۔ حضورؐ حمراء الاسد سے واپس ہوئے تو قبل اس کے کہ گھر تشریف لے جاتے ان کی مزاج پرسی کرائی، جب خیریت معلوم ہوئی تو بہت مسرور ہوئے۔

احد کے علاوہ انہوں نے خیبر، حنین اور یمامہ کی جنگ میں بھی شرکت کی تھی۔

یمامہ کے دن لڑتے لڑتے ان کا ہاتھ شہید ہو گیا اور اس کے علاوہ تلوار اور نیزوں کے بارہ زخم ان پر دیکھے گئے [1]

رومیوں سے مسلمانوں کی جنگ میں عکرمہ بن ابو جہل کی بیوی اُمّ حکیم رضی اللہ عنہا بھی شریک تھیں۔ اجنادین کی لڑائی میں عکرمہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے، چند دن بعد مرج صفر نامی ایک مقام پر ان کا نکاح خالد بن سعید رضی اللہ عنہ سے ہو گیا۔ نکاح کے دوسرے دن خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے دعوتِ ولیمہ کی، ابھی لوگ دعوت سے فارغ ہونے بھی نہ پائے تھے کہ رومیوں نے صف بندی شروع کر دی۔ جب گھمسان کا رن پڑا تو اُمّ حکیم جن پر ابھی تک عروسی کے آثار نمایاں تھے اپنے خیمے کا ایک ڈنڈا لے کر میدان میں کود پڑیں اور دشمن کے سات افراد کو اس روز موت کے گھاٹ اتار دیا [2]

اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کے ہاتھ سے جنگ یرموک میں نو رومیوں کو موت کا پیالہ پینا پڑا [3]

ایک انصاری خاتون اُمّ حارث کی ثابت قدمی اور شجاعت دیکھیے کہ جنگ حنین میں اسلامی فوج کے قدم میدان سے اکھڑ چکے ہیں لیکن چند باہمت نفوس کے ساتھ پہاڑ کی طرح جمی ہوئی ہیں [4]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ اُمّ سلیم خنجر لیے ہوئے احد میں آئی تھیں۔ حنین میں بھی ان کے پاس خنجر تھا۔ اس طرح مسلح ہو کر آنے کا مقصد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا تو

---

[1] ان تمام تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۳۰۱ تا ۳۰۴۔ یمامہ میں شرکت کا ذکر ابن عبدالبر نے بھی الاستیعاب میں کیا ہے۔

[2] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرہ اُمّ حکیم۔

[3] الاصابہ فی تمییز الصحابہ، جلد ۴ صفحہ ۲۳۵

[4] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرہ اُمّ حارث رضی اللہ عنہا۔

[5] طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۳۱۱

جواب دیا:۔

اتخذتہ ان دنا منی احد من المشرکین بقرت

بہ بطنہ[1]

"میں نے اس کو اس لیے ساتھ رکھا ہے تاکہ اگر کوئی مشرک قریب

ہو تو اس سے اس کا پیٹ چاک کر دوں"

رومیوں سے جہاد میں شہرت رکھنے والی نامور شخصیت حبیب بن سلمہ سے ان کی بیوی نے ایک جنگ کے موقع پر دریافت کیا۔ بتائیے! کل آپ کہاں ہونگے؟ جواب دیا یا تو دشمن کی صفوں کے اندر یا جنت میں۔ انشاء اللہ۔ جواب سن کر بیوی نے بھی پورے عزم کے ساتھ کہا ان دونوں جگہوں میں سے جہاں بھی آپ ہوں گے، مجھے توقع ہے کہ میرا مقام بھی وہی ہوگا[2]

غزوہ خندق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو ایک قلعہ میں کر چھوڑا تھا تاکہ وہ محفوظ رہ سکیں۔ لیکن اس کے باوجود یہود تاک لگائے مسلسل قلعہ کے گرد چکر لگا رہے تھے، چنانچہ بالآخر ایک یہودی موقع پا کر قلعہ پر چڑھ ہی گیا۔ حضور کی پھوپھی حضرت صفیہ رض قلعہ کے اندر موجود تھیں، وہ آگے بڑھیں اور اس بد باطن کا سر قلم کر کے نیچے، جہاں دوسرے فتنہ باز موجود تھے، پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر وہ بالکل حیران اور ششدر رہ گئے اور کہنے لگے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آتنا غافل نہیں ہے کہ عورتوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دے قلعہ میں یقیناً ایسے جری اور شجاع ہیں جو ہمارے ہر ارادہ کو ناکام بنا سکتے ہیں[3]

دشمنانِ دین کو ناکام بنانے میں عورت نے جتنا براہِ راست حصہ لیا ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب الجہاد، باب غزوۃ النساء مع الرجال۔

[2] البیان والتبیین، جلد ۲ صفحہ ۔

[3] مستدرک حاکم، جلد ۴ صفحہ ۵۱۔

اس سے کہیں زیادہ وہ بالواسطہ باطل کی قوتوں کا مقابلہ کرتی رہی ہے۔ اگر اس نے میدانِ جنگ پر تیر نہیں چلائے ہیں تو دشمن پر ناوک فگنی کرنے والے ہاتھوں کو ناوک فراہم کیے ہیں۔ اگر اس نے تلوار نہیں اٹھائی ہے تو تیغ زنوں کو تیغ زنی کے قابل بنایا ہے، خدا کی راہ میں لڑنے والے زخمی ہوتے تو یہ ان کا مرہم بن جاتی وہ گر پڑتے تو یہ ان کا سہارا ہوتی، وہ بھوکے اور پیاسے ہوتے تو یہ ان کے لیے کھانا اور پانی لیے دوڑتی۔

ربیع بنت معوذ کا بیان ہے:-

كنا نغزوا مع النبي صلى الله عليه وسلم فنسقي القوم ونخدمهم ونرد القتلى والجرحى الى المدينة[1]

"ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جہاد پر جاتی تھیں اور ہماری خدمات یہ ہوتی تھیں کہ مجاہدین کو پانی پلاتیں، ان کی خدمت کرتیں اور جنگ میں کام آنے والوں اور زخمی ہونے والوں کو مدینہ لوٹاتیں"

ایک اور صحابیہ جو حضور کے ساتھ چھ غزوات میں شریک ہوئی تھیں بیان کرتی ہیں:-

كنا نداوي الكلمى ونقوم على المرضى[2]

"ہم زخمیوں کی مرہم پٹی اور بیماروں کا علاج معالجہ اور ان کی تیمارداری کرتی تھیں"

ام عطیہ رض اپنے متعلق فرماتی ہیں:-

غزوت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم سبع غزوات اخلفهم في رحالهم فاصنع لهم الطعام

---

[1] بخاری، کتاب الجہاد، باب رد النساء الجرحی والقتلیٰ

[2] مسند احمد جلد ۵ ص ۸۴ - کتاب الحیض، باب شہود الحائض العیدین۔

واداوی الجرحیٰ واقوم علی المرضیٰ [1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں نے سات غزوات میں شرکت کی، وہاں میں مجاہدین کے سامان کی نگہداشت کرتی ان کے لیے کھانا تیار کرتی، زخمیوں کا علاج اور بیماروں کی تیمارداری کرتی۔

احد کے مجروح مجاہدین کی مرہم پٹی اور خدمت کے لیے بہت سی صحابیاتؓ جنگ کے بعد مدینہ سے گئی تھیں، طبرانی کی روایت ہے:۔

لما کان یوم احد وانصرف المشرکون خرج النساء الی الصحابۃ یعینونھم فکانت فاطمۃ فی من خرج [2]

"جس دن احد کی جنگ ہوئی (اور جنگ کے بعد) مشرکین واپس ہو گئے تو خواتین صحابہ کی معاونت کے لیے روانہ ہوئیں۔ حضرت فاطمہؓ بھی انہی میں تھیں۔"

چنانچہ حضورؐ اس دن زخمی ہوئے تو حضرت فاطمہؓ نے زخم چٹائی کی راکھ سے بھرا تھا [3]

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ جنگ احد میں حضرت عائشہؓ و ام سلیمؓ نے بھی مجاہدین کی خدمت کی تھی۔

لقد رأیت عائشۃ بنت ابی بکر وام سلیم وانھما لمشمرتان اری خدم سوقھما تنقلان القرب علی متونھما ثم تفرغانہ فی افواہ القوم ثم ترجعان فتملانھما ثم

---

[1] مسلم کتاب الجہاد والسیر باب النساء الغازیات الخ مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۸۴ واللفظ لمسلم۔

[2] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۲۸۹۔

[3] بخاری، کتاب المغازی غزوۃ احد باب ما اصاب النبیؐ من الجراح یوم احد۔

تجیشان تفرغانہ فی افواہ القوم[۱]

"میں نے عائشہؓ بنت ابی بکرؓ اور ام سلیمؓ کو کمربستہ دلوگوں کی خدمت کرتے ہوئے) دیکھا وہ اس قدر تیزی سے دوڑ دھوپ کر رہی تھیں کہ میں نے ان کی پنڈلیوں پر کے پازیب دیکھے، وہ اپنی پشت پر پانی سے بھرے ہوئے مشک لاد لاد کر لاتی تھیں اور مجاہدین کو پلاتیں پھر واپس جاتیں اور بھر کر لاتیں اور مجاہدین کی تشنگی دور کرتیں"

ایک انصاری خاتون ام سلیطؓ کے متعلق حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:-

انھا کانت تزفرلنا القرب یوم احد[۲]

"احد کے دن وہ ہمارے لیے پانی سے بھرے ہوئے مشک اٹھا کر لاتی تھیں"

حمنہ بنت جحشؓ نے بھی اس دن یہ خدمت انجام دی ہے۔ ابن سعد نے لکھا ہے:-

وقد کانت حضرت احداً تسقی العطش وتداوی الجرحی[۳]

"احد میں موجود تھیں پیاسوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کا علاج کرتیں"

ایمن کے حالات میں بھی اسی قسم کی روایت نقل کی ہے:-

وقد حضرت ام ایمن احداً وکانت تسقی الماء وتداوی الجرحی وشھدت خیبر مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[۴]

۱۔ بخاری، کتاب المغازی غزوۃ احد باب اذ ھمت طائفتان الخ، مسلم کتاب الجہاد والسیر۔

۲۔ بخاری، کتاب الجہاد، باب حمل النساء القرب

۳۔ الطبقات الکبیر جلد ۸ صفحہ ۱۷۵۔

۴۔ ایضاً صفحہ ۱۶۳۔

"وہ احد میں شریک تھیں اور پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمت انجام دے رہی تھیں حضورؐ کے ساتھ خیبر میں بھی وہ گئی تھیں۔"

ام عمارہؓ کے تذکرہ میں بیان کیا ہے:۔

خرجت معهم بشن لها في اول النهار تريد ان تسقي الجرحي (وقال ابنه) ومعها عصائب في حقوبها قد اعدتها للجراح فربطت جرحي[1]

"زخمیوں کی مدد کرنے اور ان کو پانی پلانے کے ارادے سے مجاہدین کے ساتھ وہ سویرے ہی میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گئی تھیں۔ ان کے صاحب زادے کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ پٹیاں تھیں جو مجروحین کی مرہم پٹی کے لیے انہوں نے تیار کر رکھی تھیں چنانچہ انہوں نے میرے زخم کو بھی ایک پٹی سے باندھا۔"

جنگ خیبر کے سلسلہ میں مورخ ابن اسحاق نے صراحت کی ہے۔

وقد شهد خيبر مع رسول الله نساء من نساء المسلمين[2]

"خیبر میں حضورؐ کے ساتھ مسلمان خواتین میں سے بہت سی خواتین نے شرکت کی۔"

حشرج بن زیاد کی دادی اور پانچ اور عورتیں بھی اس جنگ میں گئی تھیں انہوں نے حضورؐ سے آنے کا مقصد ان الفاظ میں ظاہر کیا:۔

یا رسول الله خرجنا نغزل الشعر ونعين به في سبيل الله ومعنا دواء للجرحي ونناول السهام ونسقي السويق[3]

---

[1] طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۳۰۱ تا ۳۰۲۔

[2] سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲ صفحہ ۳۴۹۔

[3] ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی المرأۃ والعبد یحذیان۔

"اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم اس لیے آئی ہیں کہ سوت تیں گی اور اس
کے ذریعہ اللہ کی راہ میں مدد کریں گی، ہمارے پاس زخمیوں کے لیے دوا ہے
ہم تیر اندازوں کو تیر فراہم کریں گی اور ضرورت پر مجاہدین کو ستو گھول کر پلائیں گی"[1]
خیبر ہی میں ابو رافع کی بیوی، سلمیٰ، قبیلہ اشہل کی ایک خاتون ام عامرؓ، ایک
انصاری عورت ام خلادؓ اور کعیبہ[2] بنت سعد کی شرکت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

اس سے اہم تر بات یہ ہے کہ وہ کسی خارجی دباؤ کے تحت یہ خدمات انجام
نہیں دیتی تھیں بلکہ مجاہدین دین کی رفاقت اور تعاون کو اپنے لیے باعث عزت
سمجھ کر خود ہی پیش کش کرتی تھیں۔ اسی جنگ خیبر کا واقعہ ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم روانہ ہونے لگے تو قبیلہ غفار کی چند عورتوں نے آکر عرض کیا:۔

انا نرید یا رسول اللہ ان نخرج معک الی وجھک
ھذا فنداوی الجرحیٰ ونعین المسلمین بما استطعنا[3]

"اے اللہ کے رسول ﷺ! اس مبارک سفر میں جس پر آپ جا رہے ہیں ہم
بھی آپ کے ساتھ چلنا چاہتی ہیں تاکہ زخمیوں کا علاج کریں اور اپنے بس بھر
مسلمانوں کی مدد کریں"

بعض بعض خواتین میدان جنگ سے باہر بھی یہ خدمات انجام دیتی تھیں مثلاً
رفیدہ نامی قبیلہ اسلم کی عورت کے متعلق مؤرخین نے لکھا ہے کہ:۔

کانت امرأۃ تداوی الجرحیٰ وتحتسب بنفسہا علیٰ

---

1. الاستیعاب فی اسماء الاصحاب۔
2. طبقات ابن سعد، جلد ۸، صفحہ ۲۲۴۔
3. ایضاً صفحہ ۲۳۔
4. ایضاً صفحہ ۲۱۳۔
5. طبقات ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۲۱۳، ابن ہشام، جلد ۳ صفحہ ۲۵۹۔

خدامتہ من کانت بہ ضیعۃ من المسلمین۔

"زخمی ہونے والوں کی وہ مرہم پٹی کرتی تھیں اور جو مسلمان محتاج خدمت ہوتا کہ اگر اس کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہ ہو تو ہلاک ہو جائے۔ ثواب کے خیال سے یہ اس کی خدمت کرتیں"

چنانچہ مسجد نبوی میں ان کا خیمہ تھا۔ حضرت سعد بن معاذ جنگ خندق میں مجروح ہوئے تو حضورؐ نے ان کو رفیدہ ہی کے خیمہ میں منتقل کر دیا تھا، تاکہ آپ بآسانی ان کی عیادت کر سکیں[1]۔

دین کی مدافعت اور اس کی ترغیب

دین کی مدافعت خواتین جس طرح شمشیر و سناں کے ذریعہ کرتی رہی ہیں اسی طرح زبان و بیان سے بھی انہوں نے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔ حق کی نصرت و حمایت میں نیزہ اور تلوار بھی بلند کیا ہے، اور زبان کی قوت بھی صرف کی ہے۔ اُن کی پُر جوش خطابت و تقریر نے بہت سوں کے لیے اللہ کی راہ میں مرنا اور جینا اور اپنی ہر متاع حیات کا لٹانا آسان بنا دیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی اروٰی بنت عبد المطلب کے متعلق ابن عبد البر نے لکھا ہے:۔

وکانت بعد تعضد النبیؐ بلسانھا وتحض ابنھا علی نصرتہ والقیام بامرہ[2]

"ایمان لانے کے بعد وہ حضورؐ کی معاونت کرتی تھیں اور اپنے لڑکے کو

---

[1] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، تذکرۂ رفیدہ، امام بخاری نے الادب المفرد میں باب کیف اصبحت، صفحہ ۱۴۲-۱۴۳ کے تحت اس کا ذکر کیا ہے۔ طبقات ابن سعد میں بجائے رفیدہ کے کعیبہ نام آیا ہے، جلد ۸ صفحہ ۲۱۳۔

[2] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرۂ اروٰی بنت عبد المطلب۔

آپ کی مدد کرنے اور آپ کے مقصد کو بڑھانے کی کوشش کرنے پر آمادہ تھیں۔"

ان کے لڑکے طلیبؓ کہ کے ابتدائی دور ہی میں ایمان لا چکے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہ کے ساتھ جن میں طلیبؓ بھی شامل تھے نماز ادا کر رہے تھے کہ ابوجہل، ابولہب، عقبہ اور بعض دوسرے سفہاء اچانک آپ پر بول بیٹھے اور زبان درازی شروع کر دی۔ صحابہ بھی پورے زور سے اظہارِ ایمان اور اپنی مدافعت کرنے لگے۔ طلیبؓ نے تو آگے بڑھ کر ابوجہل کو بڑی طرح زخمی کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرکین نے ان کو پکڑ کر باندھ دیا۔ بعض لوگ یہ خبر لے کر اروی بنت عبدالمطلب کے پاس پہنچے اور کہا ذرا اپنے بیٹے کی "حماقت" تو دیکھو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگ کر لوگوں کے جور و ستم کا نشانہ بن گیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔

خیر ایام طلیب یوم ینصاب عن ابن خاله وقد جاء بالحق من عند الله تعالیٰ[1]

"جس دن طلیب اپنے ماموں کے لڑکے کی مدافعت میں کھڑا ہو وہ اس کی زندگی کا بہترین دن ہے کیونکہ وہ خدا کی جانب سے حق لے کر آیا ہے (لہٰذا اس کی مدافعت حق کی مدافعت ہوگی)۔"

عبداللہ بن زیدؓ احد کے دن مجروح ہو گئے تو ان کی والدہ امِ عمارہؓ نے مرہم پٹی کی اور بجائے اس کے کہ لختِ جگر کو تکلیف میں دیکھ کر آرام لینے اور ستانے کا مشورہ دیتیں حکم دیا۔

انهض بني تضارب القوم[2]

"بیٹے اٹھو اور تلوار لے کر اس (مشرک) قوم پر ٹوٹ پڑو۔"

ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ نے شہدائے احد کے خلاف اشعار کہے تو ہند

---

[1] مستدرک، جلد ۴ صفحہ ۵۲۔

[2] طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۲۳۲

بنت اثاثہ رضہ نے ان کا شعر ہی میں ترکی بہ ترکی جواب دیا۔[1]

حضرت خنساء اپنے چار بیٹوں کے ساتھ جنگ قادسیہ میں شریک ہوئی تھیں۔ ان چاروں کو آغاز شب ہی میں جمع کر کے کہا۔ اے میرے بچو! تم نے برضا و رغبت ایمان قبول کیا اور کسی کے دباؤ کے بغیر ہجرت کی قسم بخدا جس طرح تمہاری ماں ایک ہے اسی طرح تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ کیونکہ تمہاری ماں نے نہ تو تمہارے باپ کے ساتھ کوئی خیانت کی نہ تمہارے ننہال کو رسوا کیا نہ تمہارے حسب کو بٹہ لگایا اور نہ تمہارے نسب کو غبار آلود کیا یعنی تم ایک شریف اور باعفت ماں کے بطن سے پیدا ہوئے ہو اس لیے تمہارے اعمال بھی شریفوں کے سے اور ارفع و اعلیٰ ہونے چاہئیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ خدا نے کفار سے جنگ کے عوض کس قدر ثواب تیار کر رکھا ہے خوب سمجھ لو! اس فنا ہونے والی دنیا سے دار البقا بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (آل عمران — ۲۰۰)

"اے ایمان والو! ثابت قدم رہو، اور ثابت قدمی میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرو۔ حق کی راہ میں جمے رہو اور اللہ سے ڈرو شاید تم فلاح پاؤ۔"

اگر اللہ نے چاہا اور تم نے سلامتی سے صبح کی تو پوری بصیرت کے ساتھ اور خدائے تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہوئے دشمن کے مقابلہ میں نکل جاؤ اور جب گھمسان کا رن پڑے اور جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں تو تم اس کی بھٹی میں بلا خوف و خطر کود پڑو جس وقت دشمن کا لشکر پورے جوش اور جذبے سے لڑائی میں مصروف ہو تو تمہارے حملوں کا نشانہ اس کا سردار ہے اس طرح تم غنیمت اور جنت میں شرف و مرتبہ کے مستحق ہو کر لوٹو گے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام، جلد ۲ صفحہ ۴۲، ۴۴

ماں کی زبان سے یہ پُرعزیمت تقریر سُن کر چاروں لڑکے رجز پڑھتے ہوئے سربکف عرصۂ پیکار میں آ نکلے اور پھر ان کو خاک و خون میں غلطاں ہی دیکھا جا سکا۔[1]

جس زمانہ میں حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا محاصرہ کر رکھا تھا ان کے تقریباً دس ہزار ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ کر حجاج کے ساتھ جا ملے۔ یہاں تک کہ ان کے دو لڑکے حمزہ اور خبیب بھی پناہ کے طالب ہو کر حجاج کے پاس چلے گئے۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے جا کر اپنی والدہ اسماء بنت ابی بکرؓ سے اپنی بے بسی کا تذکرہ کیا کہ اور تو اور میری اپنی اولاد تک نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اب میرے ساتھ گنے چنے چند افراد رہ گئے ہیں جو حجاج کے مقابلہ میں دیر تک ٹھہر نہیں سکتے۔ اگر میں اب بھی حجاج کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں تو دنیا کی جو نعمت چاہوں مل سکتی ہے۔ بتائیے آپ کی کیا رائے ہے؟ ماں نے جواب دیا:

یا بنی انت اعلم بنفسك ان كنت تعلم انك على حق وتدعوا الى حق فاصبر عليه فقد قتل عليه اصحابك ولا تمكن من رقبتك يلعب بها غلمان بني امية وان كنت تعلم انك انما اردت الدنيا فلبئس العبد انت اهلكت نفسك و اهلكت من قتل معك وان كنت على حق فما وهن الدين والی كم خلودك في الدنيا۔

"بیٹا تم اپنے آپ کو سب سے بہتر جانتے ہو اگر تم واقعتاً خود کو حق پر سمجھتے ہو اور حق ہی کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہو تو صبر کے ساتھ کام لو دیکھو کہ تمہارے بہت سے ساتھیوں نے دشمن کے مقابلہ میں لڑتے لڑتے جان دے دی۔ لہٰذا اپنی گردن کو کھلونا بنا کر بنی امیہ کے لونڈوں کے حوالے نہ کرو کہ وہ اس سے کھیلتے رہیں۔ لیکن اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ سارا کھیل تم نے

---

[1] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرہ خنساء بنت عمرو بن شرید۔

دنیا کے لیے کھیلا ہے تو تم دنیا کے بدترین انسان ہو کیوں کہ اس طرح تم خود ہلاک ہو گئے اور اپنے ساتھ جان دینے والوں کو بھی ناحق ہلاک کیا۔ اگر تم حق پر ہو تو اس کے لیے جان دینا اچھا ہے کیونکہ جب اس زندگی کو ختم ہونا ہی ہے تو کیوں نہ اللہ کی راہ میں ختم ہو، دین کو کمزور کرنے سے تمہیں زندگی تو نصیب نہیں ہو جائے گی۔"

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ماں کے جذبات کی تائید کی اور حجاج کے مقابلہ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔[1]

اظہارِ حق

خواتین نے اپنوں ہی کو حق پر ثابت قدم رکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ معاشرہ میں جہاں کہیں ان کو بگاڑ نظر آیا اس کو بدلنے اور اس کی جگہ خیر و صلاح کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتی رہی ہیں۔ سمراء بنت نہیکؓ کے متعلق ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے:۔

كانت تمر في الأسواق وتأمر بالمعروف وتنهى عن المنكر وتضرب الناس على ذالك بسوط كان معها۔[2]

"وہ بازاروں میں گھوم پھر کر بھلائی کا حکم دیتیں اور برائی سے روکتی تھیں ان کے ہاتھ میں ایک کوڑا ہوتا تھا جس سے وہ لوگوں کو منکر کے ارتکاب پر مارتی تھیں۔"

اس معاملہ میں خواتینِ امت نے نہ تو رعایا کی پروا کی اور نہ فرماں رواؤں اور حاکموں کی، ان کے ایمانی جذبات نے جس طرح دین کے کھلے دشمنوں کا مقابلہ کیا ہے اسی طرح دین کے نام لیواؤں کے فسادِ فکر و عمل کو بھی برداشت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کلمۂ حق کے اظہار میں نہ تو باطل کی بڑی سے بڑی قوت ان کے لیے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ، جلد ۸ ص۳۴۔

[2] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرہ سمراء بنت نہیکؓ۔

مانع بنی اور جابر و سخت گیر حکام کی زیادتی اور سختی۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو سولی دینے کے بعد حجاج ان کی والدہ اسماءؓ کے پاس گیا اور کہا آپ کے صاحب زادے نے خدا کے گھر میں بے دینی اور الحاد پھیلایا جس کی سزا خدا نے اس کو دردناک عذاب کی شکل میں چکھائی ہے۔ حضرت اسماءؓ نے کہا:

کذبت کان برا بالوالدین صوا ما قوا ما واللہ لقد اخبرنا رسول اللہ انہ سیخرج من ثقیف کذابان الآخر منہما شر من الاول وھو مبیر[۱]

"تم نے جھوٹ کہا وہ بے دین نہیں تھا، وہ تو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا، روزے دار اور تہجد گزار تھا۔ حقیقتاً تم نے اس پر ظلم و زیادتی کی ہے، قسم خدا کی حضورؐ نے ہم سے کہا تھا کہ قبیلہ ثقیف سے دو جھوٹے پیدا ہوں گے، اس میں بھی دوسرا پہلے سے بدتر ہوگا کیونکہ وہ ہلاکت و تباہی مچائے گا۔ (ثقیف کے پہلے جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کو تو دیکھ چکے اور دوسرے تم ہو)۔"

سمیہ نامی ایک کنیز تھی جس سے دور جاہلیت میں اس کے آقا بیسوائی کراتے تھے۔ حضرت معاویہ کا جابر و ظالم گورنر زیاد اسی کا لڑکا تھا۔ عموماً جیسے بیسواؤں کی اولاد کے حسب و نسب کا کوئی علم نہیں ہوتا ہے اسی طرح زیاد کے سلسلہ پدری کا بھی کوئی پتہ نہیں تھا اور وہ نامعلوم النسب ہی مشہور تھا۔ حضرت معاویہؓ کے سامنے ایک شخص نے شہادت دی کہ ایک مرتبہ جاہلیت میں ابوسفیانؓ کی سمیہ کے ساتھ خلوت ہوگئی تو اس کے نتیجہ میں یہ پیدا ہوا۔ اس شہادت کی بنا پر حضرت معاویہؓ نے اس کو ابوسفیانؓ کی اولاد اور اپنا بھائی قرار دے لیا۔ زیاد اس سے بہت خوش

---

[۱] مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۳۵۱۔

ہوا اور چاہ رہا تھا کہ اکابر امت سے بھی اس کی تصدیق ہو جائے چنانچہ حضرت عائشہؓ کو اس نے ایک خط لکھا جس کا سرنامہ یہ تھا "ابوسفیان کے لڑکے زیاد کی جانب سے ام المومنین عائشہؓ کے نام" حضرت عائشہؓ اس غیر اسلامی فعل کی کیسے تائید کر سکتی تھیں۔ انہوں نے نہ تو حضرت معاویہؓ کے فیصلہ کا کوئی احترام کیا اور نہ زیاد جیسے سخت گیر اور جابر پیشہ گورنر کی کوئی پروا کی۔ اور جواب کا آغاز ان کلمات سے کیا۔ "ام المومنین عائشہ کی طرف سے نامعلوم باپ کے لڑکے زیاد کے نام"[۱]

اعیان حکومت کو نصیحت اور اس کے نتائج

تنقید یا تائید اسی وقت سود مند ہوتی ہے جب کہ اس کے پیچھے خلوص اور خیر خواہی کے جذبات کارفرما ہوں کسی کے عمل پر گرفت کی جائے یا اس کی تائید اور حمایت، دونوں کو ذاتی نفع و غرض سے پاک ہونا چاہیئے ورنہ نہ تو تائید کا کوئی فائدہ ہوتا ہے اور نہ تردید کا۔ مسلمان خواتین نے جو کچھ کہا اور کیا ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر خالص دین اور ریاست کے مفاد کے لیے کہا اور کیا۔

دین کے نفع و ضرر کا پاس و لحاظ، اس کے لیے ہر طرح کی قربانی اور شدید ترین جاں گسل مواقع پر استقامت مسلمان عورت کی یہ ایسی صفات تھیں جنہوں نے اس کے خلوص اور وفاداری کو ہر شک و شبہ سے بالاتر کر دیا اور کوئی بھی شخص اس کو دین اور ارباب دین کی بدخواہ اور غدار نہیں ثابت کر سکا۔ اس نے فرد اور جماعت کے مفاد کے لیے جو بھی اقدام کیا اس کو ذاتی غرض اور نفسانی خواہش پر محمول نہیں کیا

۱؎ طبری جلد ۵ ص ۔ طبقات ابن سعد جلد القسم الاول ص اور تاریخ ابن عساکر جلد ۵ ص ۴۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ایک حاجتمند کی سفارش میں زیاد کو خط لکھا تو اس کو ابوسفیان کا لڑکا لکھا تھا لیکن اوپر کی تفصیل ہم نے علامہ ابن اثیر کی کتاب تاریخ کامل جلد ۳ ص ۲۱۴ سے نقل کی ہے جنہوں نے ان واقعات کو نقد و تبصرہ کے بعد زیادہ منقح شکل میں پیش کیا ہے۔ زمانہ حال کے مصری مورخ شیخ محمد خضری نے بھی ابن اثیر کی تحقیق ہی کو اپنی کتاب "محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ" جلد ۲ ص ۱۱۲ میں درج کیا ہے۔

گیا بلکہ مخلصانہ جدوجہد سمجھ کر اس کا خیر مقدم کیا گیا، عام افراد تو کیا فرمانروایانِ ریاست تک نے اس کی تنقید اور نصیحت کو عزت کی نگاہ سے دیکھا اور اس سے استفادہ کیا ہے۔

حضرت معاویہ رضؓ نے حضرت عائشہ رضؓ کو لکھا کہ مجھے ایک مختصر سی نصیحت لکھیے جسے میں ہمیشہ اپنے سامنے رکھ سکوں تو حضرت عائشہؓ نے انتہائی موثر اور ایک حاکم وقت کو رہنمائی کا کام دینے والا حضورؐ کا یہ ارشاد لکھ کر بھیجا۔

من التمس رضی اللہ بسخط الناس کفاہ اللہ مؤنۃ الناس ومن التمس رضی الناس بسخط اللہ وکلہ اللہ الی الناس[1]

"جو شخص لوگوں کو ناخوش کر کے اللہ کی رضا تلاش کرے (لوگ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ) اللہ تعالیٰ اس کو انسانوں کے شر سے بچا لیتا ہے لیکن جو شخص اللہ کو خفا کر کے لوگوں کی رضا ڈھونڈے تو اللہ اس کو ان ہی کے حوالے کر دیتا ہے (اور وہ جس طرح چاہتے ہیں اس پر حکومت کرتے ہیں)"

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضؓ کہیں جا رہے راستہ میں خولہ بنت ثعلبہ سے ملاقات ہو گئی وہ وہیں حضرت عمر رضؓ کو نصیحت کرنے لگیں۔

عمر! ایک زمانہ تھا جب کہ میں نے تم کو عکاظ کے میلہ میں دیکھا تھا کہ تم بچوں کو ڈنڈا لیے ڈراتے دھمکاتے پھرتے تھے۔ اس وقت تم بہت چھوٹے تھے اور اسی کم سنی کی وجہ سے لوگ تم کو عمیر کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کے بعد بہت جلد تم جوان ہو گئے اور لوگ تم کو عمر کہنے لگے۔ اس پر بھی کچھ زیادہ عرصہ گزرنے نہیں پایا کہ اب تم امیرالمومنین کہلائے جانے لگے ہو۔ سوچو! خدا نے تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور رعایا کے ساتھ اپنی فطری سختی روا نہ رکھو بلکہ رعایا کے معاملہ میں خدا سے ڈرتے

---

[1] ترمذی، ابواب الزہد، باب بغیر عنوان۔

رہو۔ یہ بات ذہن نشین کر لو کہ جس شخص کو خدا کے عذاب کا خوف ہوگا وہ قیامت کو دور نہیں سمجھ سکتا، اور جس کو موت کا کھٹکا لگا ہو وہ لا ابالی زندگی نہیں گزار سکتا بلکہ اس کو نیکیوں کے ہاتھ سے چھوٹ جانے کا ہر وقت خدشہ رہے گا۔

حضرت عمرؓ کے ساتھ اس وقت جارود عبدی بھی تھے انہوں نے خولہؓ سے کہا تم نے تو امیر المؤمنین پر ضرورت سے زیادہ نصیحت شروع کر دی حضرت عمرؓ نے ٹوکا اور کہا انہیں کہنے دو، کیا تمہیں نہیں معلوم، یہ خولہ بنت ثعلبہؓ ہیں[1]

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے فرمایا، مہر کی مقدار کم رکھو تو ایک عورت نے تردید کرتے ہوئے کہا آپ کو اس کی تبلیغ کا حق نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ "اگر تم اپنی عورتوں کو مہر میں ایک ڈھیر مال بھی دے دو تو اس سے ایک حبہ بھی نہ لو" اس سے معلوم ہوا کہ مہر کی کوئی حد نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا ایک عورت نے عمرؓ سے بحث کی اور غالب رہی[2]

اس قسم کی تنقیدیں بعض اوقات بہت ہی نتیجہ خیز اور فرد اور جماعت کے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی ہیں۔

سودہ بنت عمارہ نے جنگ صفین میں حضرت معاویہؓ کے خلاف حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد واقعہ ہے کہ یہ حضرت معاویہؓ کے پاس گئیں۔ پہلے تو ماضی میں جو کچھ ہوا اس پر معافی چاہی۔ پھر کہا امیر المؤمنین آپ لوگوں کے سردار اور ان کے معاملات کے ذمہ دار و نگہبان ہیں۔ اس لیے ان کے جو حقوق اللہ تعالیٰ نے آپ پر فرض کیے ہیں ان کے متعلق وہ آپ سے ضرور پوچھے گا۔ ہم پر ایسے گورنر متعین ہو کر آتے ہیں جو آپ کے غلبہ و اقتدار کو مستقل اور وسیع کرنے کے ساتھ ہم کو کھیتی کی طرح کاٹ پھینکتے اور گایوں کی طرح روند ڈالتے ہیں۔ یہ ہمارے حقوق کو

---

[1] الاستیعاب لابن عبدالبر تذکرہ خولہ بنت ثعلبہؓ۔

[2] فتح الباری، جلد ۹ صفحہ ۱۹۱

ٹھیک سے ادا نہیں کرتے۔ ہم کو خراب سے خراب ترچیز کھلاتے ہیں اور بڑی سے بڑی اور نفیس سے نفیس شے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ دیکھیے، ابن ارطاۃ حاکم بن کر آیا تو اس نے ہمارے قبیلے کے افراد کا خون بہانا شروع کر دیا اور میرا مال چھین لیا۔ آپ کی اطاعت ہم پر فرض ہے ورنہ ہمارے اندر اتنا کس بل اور بچاؤ کی قوت ہے کہ ہر ظلم کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کو معزول کر دیں تو ہم آپ کے مشکور رہیں گے ورنہ ہم آپ کو بھی دیکھیں گے۔ حضرت معاویہ رضؓ نے کہا کیا تو مجھے اپنی قوم کے ذریعہ دھمکی دے رہی ہے؟ قسم خدا کی میں نے تو ارادہ کیا ہے کہ تجھ کو کانٹوں بھری سواری پر بٹھا کر اسی کے پاس لوٹاؤں تاکہ وہ اپنا فیصلہ تجھ پر نافذ کرے۔ اس پر سودہ خاموش ہو گئیں۔ پھر کچھ دیر بعد دو شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے :-

اللہ تعالیٰ اس روح پر رحمت نازل فرمائے جس کو ایک قبر نے اپنے آغوش میں لے لیا ہے اور جس کے ساتھ عدل و انصاف بھی دفن ہو چکا ہے، اس نے حق کے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ اس کے عوض دولت دنیا نہیں حاصل کرے گا، اس طرح حق اور ایمان اس میں جمع ہو گئے تھے۔

حضرت معاویہ رضؓ نے پوچھا وہ کون! کہا علی بن ابی طالبؓ۔ حضرت معاویہ رضؓ نے فرمایا: تجھ پر اس عدل و انصاف کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ اس نے جواب دیا میں یہ بلا دلیل نہیں کہہ رہی ہوں میرے پاس ان کے انصاف کا ثبوت موجود ہے۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں ان کے ایک محصل صدقات کی شکایت لے کر پہنچی۔ وہ اس وقت کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو محبت بھرے انداز میں پوچھا، کیا تمہاری کوئی ضرورت ہے؟ میں نے محصل کی زیادتی بیان کی تو رونے لگے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اے اللہ! تو جانتا ہے میں نے اپنے گورنروں کو تیری مخلوق پر ظلم و ستم ڈھانے اور تیرے حقوق کو چھوڑ بیٹھنے کا حکم نہیں دیا اس کے فوراً بعد جیب سے چمڑے کا ایک ٹکڑا نکالا، اور اس پر اس کی معزولی کا حکم لکھ بھیجا۔ اس میں کسی قسم کی تاخیر روا نہ رکھی۔ لہٰذا آپ کی حکومت کو بھی

ایسے ہی عدل پرور ہونا چاہیئے کہ کسی بھی شخص پر کسی قسم کا ظلم نہ ہونے پائے)۔

حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ اس کے ساتھ عدل و انصاف کیا جائے۔ اس نے پوچھا کیا انصاف میرے ہی ساتھ مخصوص ہے یا میری قوم بھی اس کے ساتھ شریک ہے۔ حضرت معاویہ رضؓ نے کہا! تمہیں اپنے علاوہ دوسروں سے کیا مطلب؟ اس نے کہا انصاف ہو تو سب کے ساتھ ہو ورنہ یہ بہت ہی مذموم بات ہوگی کہ ایک کے ساتھ انصاف کیا جائے اور دوسروں پر جور و ظلم روا رکھا جائے۔ اگر آپ میرے کل قبیلہ کے ساتھ عدل نہیں کر سکتے تو مجھے بھی انصاف کی کوئی ضرورت نہیں۔ میری قوم جس خستہ حالت میں پڑی ہوئی ہے میں بھی پڑی رہوں گی۔

حضرت معاویہ رضؓ نے کہا! ابن ابی طالبؓ نے تم کو جری بنا دیا ہے۔ پھر ماتحتوں کو حکم دیا کہ گورنر کو لکھ دو کہ اس کے مطالبات پورے کیے جائیں۔[1]

اسی طرح عکرشہ بنت اطرش بھی حضرت معاویہؓ کے دربار میں ان کے گورنروں کی شکایت لے کر پہنچیں اور بے باکانہ کہا کہ "اس سے پہلے ہمارے اغنیاء سے زکوٰۃ لی جاتی اور ہمارے غریبوں میں تقسیم کر دی جاتی۔ لیکن اب نہ تو شکستہ حال کی شکستگی دور ہوتی ہے اور نہ محتاج کی محتاجی رفع کی جاتی ہے اگر یہ سب کچھ آپ کے ایماء اور مشورے سے ہو رہا ہے تو آپ جیسے شخص سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ تنبیہ ہوتے ہی فوراً چونک اٹھیں گے اور توبہ کریں گے، اور اگر اس میں آپ کی رائے اور مشورہ کو دخل نہیں ہے بلکہ گورنروں کی اپنی طرف سے ظلم و زیادتی ہے تو یہ بھی آپ جیسی ذمہ دار شخصیت کے منافی ہے کہ عہدہ و امانت داروں کو چھوڑ کر خائنوں سے تعاون حاصل کرے اور ظالموں کو خدمات پر مامور کر دے۔ حضرت معاویہ رضؓ نے معذرت کی کہ کبھی کبھی ایسے خراب حالات سے ہم کو سابقہ پڑتا ہے کہ قانون پر عمل کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس نے کہا سبحان اللہ! آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔

---

[1] العقد الفرید، جلد ا صفحہ ۲۱۲۔

اس دانائے غیب نے ہم پر کوئی ایسا فرض متعین ہی نہیں کیا ہے جس پر عمل سے دوسروں کو ضرر پہنچے۔

بالآخر حضرت معاویہ رضہ نے اس قبیلہ کی زکوٰۃ کو اسی کے افراد کے اندر تقسیم کرنے اور اس کے ساتھ عدل و انصاف کیے جانے کا فرمان جاری کیا۔[۱]

اس جرأت و ہمت کو دیکھیے کہ کس طرح دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بےخوف ہو کر حق کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس دین پر وہ ایمان رکھتی ہے جس نظریۂ حیات کو وہ درست اور صحیح سمجھتی ہے، اور جس روشنی سے وہ کفر و باطل کی ظلمتوں میں رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ ناممکن ہے کہ وہ باطل کی تاریک شب کو اس پر قبضہ جمانے کی اجازت دے۔ اگر وہ اس کی اجازت دیتی ہے تو اپنے دین و ایمان کی موت کا اعلان کرتی ہے اس عزم و ارادے کا انکار کرتی ہے جس عزم کا اس کا ایمان تقاضا کرتا ہے اس وفاداری اور خیر خواہی سے منہ موڑتی ہے جس کا اس نے اپنے مولا سے، اپنے معاشرے سے اور خود اپنے ضمیر سے عہد کیا تھا اس لیے وہ مجبور ہے کہ سوسائٹی میں باطل کے جراثیم کو پنپنے اور دین و ایمان کی غارتگر قوتوں کو قدم جمانے کا موقع نہ دے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ وہ عملاً بھی شر پسند اور حق دشمن افکار و کردار سے ہمیشہ چوکس رہی اور ان کا مقابلہ کرتی اور زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل میں اگر کسی پر اعتماد کیا ہو تو پوری بصیرت اور آگہی کے بعد کیا، ایسا نہیں ہوا کہ آنکھیں میچ کر ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہو بلکہ رہزن و رہبر کے درمیان فرق کرنے کے بعد ساتھ دینے یا رد دینے کا اس نے فیصلہ کیا ہے۔

حضرت ابوبکر رضہ نے حج میں قبیلہ احمس کی ایک عورت کو دیکھا کہ وہ بالکل بول ہی نہیں رہی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس نے حج کے دوران خاموش رہنے

---

[۱] العقد الفرید، جلد ۱ صفحہ ۲۱۲۔

کی نذر مان رکھی ہے۔ حضرت ابو بکر رضؓ نے اس سے کہا کہ یہ تو کوئی ثواب کا کام نہیں ہے بلکہ جاہلانہ حرکت ہے۔ لہٰذا اس نذر کو توڑ اور ضرورت پر بات کر۔ اس نے دریافت کیا آپ کون ہیں؟ حضرت ابو بکر رضؓ نے جواب دیا، میں مہاجرین میں کا ایک فرد ہوں۔ اس نے دوبارہ سوال کیا کون سے مہاجر؟ کہا مہاجرین قریش کے کس قبیلہ کے؟ حضرت ابو بکر رضؓ نے کہا تم تو بڑی سوال کرنے والی نکلیں۔ میں ابو بکر رضؓ ہوں۔ اس نے کہا اچھا تو آپ ہمارے لیے ہیں بتائیے جاہلیت کے بعد ہم کو جو راہ راست نصیب ہوئی ہے اکب تک ہم اس پر قائم رہیں گے؟ کہا جب تک تمہارے امام اس پر قائم رہیں۔ اس نے پوچھا۔ امام سے کس قسم کے لوگ مراد ہیں؟ حضرت ابو بکر رضؓ نے کہا۔ اسے اللہ کی بندی! کیا تیری قوم میں ایسے سردار نہیں گزرے جن کے احکام تیرے لیے واجب الاتباع ہوتے، وہ فرمان دیتے تو تم اس کی فوراً تعمیل و اطاعت کرتے؟ اس نے کہا ہاں! حضرت ابو بکر رضؓ نے جواب دیا وہی تو اب بھی لوگوں کے سردار اور امام ہیں[1]

حضرت ابو بکر رضؓ نے مسئلہ بتایا تو یہ عورت اس کو قبول کرنے سے پہلے یہ تحقیق کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ کون میری رہنمائی کر رہا ہے؟ کیا اس کی فہم و بصیرت اور سیرت و کردار اس قابل ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے؟ کیا اس کی ہدایت سے میں راہ صواب پا سکتی ہوں؟ جب اسے پتہ چلتا ہے کہ وقت کا خلیفہ اس سے ہم کلام ہے تو فوراً اس کا ذہن مسائل سیاست کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ اس کھوج و فکر میں لگ جاتی ہے کہ جس دورِ سعادت سے وہ گزر رہی ہے کیا اس سے وہ ہمیشہ بہرہ ور ہوتی رہے گی یا کوئی وقت ایسا بھی آنے والا ہے جب کہ یہ دولت اس سے چھین جائے گی؟

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ عام مسلمان خواتین تک کو کس قدر دین کے بقا و تحفظ کی فکر دامن گیر رہتی تھی اور ان کو اسلام اور اس کے اصول عدل و مساوات پر قائم شدہ

---

[1] بخاری، کتاب المناقب، باب ایام الجاہلیۃ۔

ریاست کی سربلندی و پائیداری سے کتنی دلچسپی تھی! پھر یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ دین اور اقدارِ دین کے فروغ و زوال اور تباہی اور ترقی سے کنارہ کش رہیں گی یا اس سے اغماض برتیں گی!

تنقید و احتساب

بنو امیہ کے آغازِ خلافت کا ذکر ہے کہ حضرت معاویہؓ کے گورنر اپنے خطبوں میں حضرت علیؓ اور ان کے حامیوں پر لعن طعن کرتے تھے۔ ان کی اس روش پر کوفہ کے ایک صحابی حجر بن عدی رضؓ برملا تنقید فرماتے اور ساتھ ہی حضرت علیؓ اور ان کے اعوان و انصار کی مدح و توصیف کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ کے گورنروں نے ان کی زبان بندی کی ہر چند کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس حجر بن عدیؓ کے ہم خیال اور مویدین میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت معاویہ رضؓ نے حجرؓ اور ان کے بعض ساتھیوں کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے اور جب یہ گرفتار کر کے ان کے پاس لائے گئے تو ان کے قتل کا فیصلہ کر دیا۔ حضرت عائشہ رضؓ کو اس کا علم ہوا تو فوراً عبدالرحمٰن بن حارث کو حضرت معاویہ رضؓ کے پاس بھیجا کہ وہ اس اقدام سے باز آجائیں لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی حجرؓ اور ان کے سات ساتھی شہید کیے جاچکے تھے۔ اس پر حضرت عائشہؓ بے حد خفا ہوئیں اور حضرت معاویہؓ سے سختی سے باز پرس کی۔ عبدالملک بن نوفل روایت کرتے ہیں کہ وہ یہاں تک کہتی تھیں :-

لولا انا لم نغير شيئاً الا آلت بنا الامور الى اشد مما كنا فيه لغيرنا قتل حجر[1]

"کسی معاملہ کے ہمارے بدلنے سے موجودہ حالات سے بھی زیادہ سخت حالات کے پیدا ہوجانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم حجر کے قتل کے فیصلہ کو بدل کر رکھ دیتے"

---

[1] تاریخ الرسل والملوک طبری، جلد ۲، صلا؟

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں :-

"لولا یغلبنا سفھاؤنا لکان لی ولمعاویۃ فی قتل حجر شأن"[1]

"اگر سفہاء کے غلبہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو حجر کے قتل کے سلسلے میں میرا اور معاویہ کا معاملہ کچھ اور ہی ہوتا"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکابر صحابہ، فتنہ و فساد کے خدشہ سے بعض غیر شرعی امور کو انجام پاتے ہوئے دیکھنے کے باوجود انگیز کر گئے، اسی طرح حضرت عائشہؓ نے بھی اس معاملہ میں بربنائے مصلحت سکوت اختیار کیا ورنہ وہ کوئی سخت قدم اٹھانا چاہتی تھیں۔

حج کے زمانہ میں حضرت معاویہؓ نے حضرت عائشہؓ سے ملاقات کی تو تہدید آمیز انداز میں پوچھا :-

"یا معاویۃ قتلت حجرا واصحابہ وفعلت الذی فعلت اما خشیت ان اخبأ لک رجلا یقتلک"

"معاویہ! تم نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کیا اور وہ سب کچھ کیا جو کرنا چاہا۔ کیا تمہیں اس بات کا خوف نہیں ہوا کہ میں بھی کسی شخص کو پوشیدہ طور پر تمہارے قتل پر لگا سکتی ہوں؟"

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے معذرت کرتے کرتے بڑی مشکلوں سے ان کی خفگی کو ختم کیا تھا۔[2]

رائے اور مشورہ کا حق اور اس سے استفادہ

یہ تاریخی شہادتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلامی معاشرہ کے سود و زیان اور

---

[1] البدایہ والنہایہ، جلد ۸، ص۵۵

[2] البدایہ والنہایہ، جلد ۸، ص۵۵

نفع وضرر سے مسلمان عورت کسی تماشائی کی طرح غیر متعلق نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ معاشرہ کے بناؤ اور بگاڑ اور اصلاح و فساد سے اس کا بہت ہی گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے۔ معاشرہ کا نقصان اس کا اپنا نقصان اور معاشرہ کا فائدہ اس کا اپنا فائدہ ہے۔ وہ معاشرہ کو خیر کی بنیادوں پر قائم رکھنے میں مدد دے گی تو لازماً شر کی راہ پر چلنے کی مخالفت اور مزاحمت بھی کرے گی۔ بھلائیوں کا خیر مقدم کرے گی تو برائیوں پر احتجاج بھی کرے گی۔ یہ اس کا فطری حق ہے جو اجتماعی زندگی نے اس کو عطا کیا ہے۔ شریعت اس کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے اور زندگی کے مختلف معاملات میں خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی اس کو اپنے جذبات و احساسات، رائے اور خیال اور پسند و ناپسند کے اظہار کی اجازت عطا کرتی ہے۔ یہ اظہار اپنے حدود کے اندر زبان و بیان، تحریر و انشاء غرض جس ذریعہ سے بھی ہو شریعت اس پر کوئی قدغن نہیں لگاتی۔

جہاں تک اس کے ذاتی مسائل کا تعلق ہے، مثلاً نکاح، خلع وغیرہ تو ان کے متعلق شریعت نے صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ کوئی بھی شخص اس پر اپنا فیصلہ لاد نہیں سکتا، جو بھی اقدام کیا جائے گا اس کی رضا اور خوشی کے بعد کیا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لا تنکح الایم حتّٰی تستأمر ولا تنکح البکر حتّٰی تستأذن[۱]

"شادی شدہ عورت کا نکاح (بیوگی یا طلاق کے بعد) اس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس سے مشورہ نہ لیا جائے۔ اور دوشیزہ کا نکاح بھی اس کی اجازت لیے بغیر نہیں کیا جائے گا۔"

ایک دوسری روایت ہے:-

لا تنکح الیتامٰی حتّٰی تستأمر وھن[۲]

---

[۱] بخاری، کتاب النکاح، باب لاینکح الاب وغیرہ البکر والثیب الا برضاہا۔

[۲] دارقطنی، کتاب النکاح صفحہ ۳۸۵۔

"یتیم لڑکیوں کا نکاح ان سے رائے اور مشورہ کرنے سے پہلے نہ کرو"

"یتامیٰ" کا لفظ یہاں بہت ہی قابلِ لحاظ ہے۔ شفیق و مہربان اور خیر خواہ باپ کے نہ ہونے کی صورت میں بہت ممکن ہے کہ کوئی ظالم سرپرست بے آسرا لڑکی کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بنالے اور شریعت نے اس کو اپنے متعلق فیصلہ کا جو حق دیا ہے اس سے محروم کر دے، اس لیے خصوصی طور پر اس سے رائے اور مشورے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ ہر حال میں عورت اپنی مرضی کی آپ مالک رہے۔ چنانچہ جب کبھی اس کی مرضی کے علی الرغم کوئی اقدام کیا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بدل کر رکھ دیا۔

ان معاملات کا تعلق تو اس کی اپنی شخصیت سے ہے، اس سے بھی آگے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے:-

امروا النساء فی بناتھن [1]

"عورتوں سے ان کی لڑکیوں کے معاملہ میں مشورہ لو"

یہ حدیث بتاتی ہے کہ زندگی کے جن شعبوں سے متعلق وہ تجربات رکھتی ہے اور ان کے نفع و نقصان سے بہتر طور پر واقف ہے ان کے سلسلہ میں اس کے افکار و خیالات خصوصی توجہ اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جن کو نظر انداز کرنا ہمارے لیے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا بلکہ ان معاملات میں اس کی رائے اور مشورہ سے فائدہ اٹھانے میں پیش قدمی کرنی چاہیے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عام اسوہ اور طریق عمل حضرت حسن بصری رح بتاتے ہیں:-

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یستشیر حتی المرأۃ فتشیر علیہ بالشیء فیاخذ بہ [2]

---

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی الاستئمار۔

[2] عیون الاخبار لابن قتیبہ، جلد ۱ صفحہ ۲۷

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ کرتے تھے یہاں تک کہ عورت سے بھی اور وہ کبھی ایسی رائے دیتی جسے آپؐ اختیار فرماتے۔"

یہ اسوہ زندگی کے کسی ایک یا چند پہلوؤں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہر نوعیت کے مسائل اور تمام پہلوؤں سے ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں تاریخ کے صفحات میں جگہ جگہ ملتا ہے۔

حدیبیہ کی مشہور صلح، قریش اور مسلمانوں کے درمیان جن شرائط پر ہوئی تھی ابتداء میں ان سے مسلمانوں کی اکثریت ناخوش تھی۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مسلمان اس سال عمرہ کیے بغیر لوٹ جائیں گے۔ اس شرط کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حدیبیہ ہی کے مقام پر احرام کھولنے اور قربانی کرنے کا حکم دیا لیکن صحابہ کے جذبات اس وقت اتنے بدلے ہوئے تھے کہ اس حکم کی تعمیل ہوتی نظر نہ آئی۔ آپ نے افسوس کے ساتھ حضرت ام سلمہؓ سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے صحابہ کی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے انتہائی دانشمندانہ مشورہ دیا کہ آپ کسی سے مزید گفتگو نہ فرمائیے بلکہ جو مراسم ادا کرنے ہیں ان کو آگے بڑھ کر ادا کیجئے۔ پھر دیکھئے، کس طرح لوگ اس پر عمل نہیں کرتے۔ چنانچہ آپ کو دیکھ کر فوراً پیروی شروع کر دی۔[۱] اس طرح حضرت ام سلمہؓ کی درست اور صائب رائے نے آن کی آن میں یہ نازک صورت حال ختم کر کے رکھ دی۔

جنازہ کی موجودہ شکل کا مسلمانوں میں رواج نہیں تھا۔ حضرت اسماء بنت عمیس نے اس کو حبشہ میں نصاریٰ کے ہاں دیکھا تھا۔ انہوں نے اس کا مشورہ دیا اور وہ قبول کیا گیا۔[۲]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کا طریق عمل بھی آپ کے

۱؎ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب الخ

۲؎ طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۲۰۶۔

اسوہ ہی کی تائید کرتا نظر آتا ہے۔ ابن سیرینؒ حضرت عمرؓ کے متعلق بیان کرتے ہیں:۔

ان کان عمر لیستشیر فی الامر حتی ان کان لیستشیر المرأۃ فربما ابصر فی قولها او الشیء یستحسنه فیاخذ بهٖ[1]

"عمرؓ پیش آمدہ مسائل میں (اصحاب الرائے لوگوں سے) مشورہ کرتے حتیٰ کہ (ان مسائل میں سمجھ بوجھ رکھنے والی) کوئی عورت ہوتی تو اس سے بھی، اور بسا اوقات اس کی رائے میں خیر و خوبی کا کوئی پہلو دیکھتے یا کوئی مستحسن چیز پاتے تو اس کو اختیار کرتے۔

شفاء بنت عبداللہ کے تذکرہ میں علامہ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں:۔

اسلمت الشفاء قبل الهجرة فهی من المهاجرات وبایعت النبیؐ وکانت من عقلاء النساء وفضلائهن وکان عمر یقدمها فی الرأی ویرضاها ویفضلها[2]

"شفاءؓ ہجرت سے پہلے ایمان لا چکی تھیں، ان کا شمار ہجرت کرنے والی خواتین میں ہے۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت بھی کی۔ سب سے عقل و فہم اور فضیلت رکھنے والی عورتوں میں تھیں، حضرت عمرؓ ان کو رائے اور مشورے میں آگے بڑھاتے اور ان کو خوش رکھتے اور ان کو دوسروں پر فضیلت دیتے تھے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں مخالفین سے جنگ کا ارادہ کیا، تو مدینہ کی ایک اہم شخصیت عبداللہ بن عمیر کمیل نخعی سے ساتھ دینے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں اہل مدینہ کا ایک فرد ہوں اگر وہ آپ کے اس فیصلہ کی تائید کرتے ہیں تو مجھے آپ کے اقدامات میں شریک ہونے میں کوئی تامل نہ ہوگا

---

[1] السنن الکبریٰ بیہقی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۱۳

[2] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرہ شفاء بنت عبداللہ۔

ورنہ میں معذور ہوں۔ اس کے بعد وہ عمرہ کے ارادے سے مکہ روانہ ہو گئے۔ روانگی سے قبل انہوں نے حضرت علی رض کی صاحبزادی ام کلثوم سے کہا کہ میں جنگ میں تو شریک نہیں ہو سکتا البتہ بقیہ تمام معاملات میں حضرت علی رض کی اطاعت پر قائم ہوں۔ اتنے میں یہ افواہ اڑ گئی کہ وہ شام روانہ ہو گئے ہیں۔ حضرت علی رض نے جب یہ خبر سنی تو چاہا کہ شام پہنچنے سے پہلے ان کو گرفتار کر لیا جائے چنانچہ آپ شہسواروں کو اس کی ہدایت دے ہی رہے تھے کہ ام کلثوم اطلاع پا کر فوراً پہنچیں اور کہا کہ عبداللہ کے معاملہ میں سختی نہ کیجئے۔ ان کے متعلق جو کچھ آپ کو بتایا گیا ہے حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے میں ان کی ضمانت لیتی ہوں کہ وہ آپ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ حضرت علی رض نے ام کلثوم کی خبر اور عبداللہ کے متعلق ان کی رائے پر اعتماد کرتے ہوئے اتنے اہم معاملہ میں اپنے فیصلہ کو تبدیل کر دیا اور سواروں کو روک دیا۔[1]

جس زمانہ میں حضرت عائشہ رض حضرت عثمان رض کے قاتلین سے قصاص لینے کی تیاری کر رہی تھیں، اپنی تقریر میں فرماتی ہیں:

کان الناس یتجنون علی عثمان و یزرون علی عمالہ فیستشیروننا فیما یخبروننا عنہم فنظر فی ذالک فنجدہ بریًا تقیًا وفیًا و نجدھم فجرۃ غدرۃ یحاولون غیر ما یظہرون[2]

"عثمان پر لوگ بے بنیاد الزامات لگاتے اور ان کے عمال کی عیب گیری کرتے تھے اور ہمارے پاس مدینہ آ کر ان گورنروں کے متعلق جو کچھ وہ ہمیں بتاتے اس سلسلے میں ہم سے مشورہ کرتے ہم غور کرتے تو حضرت عثمان کو

---

[1] تاریخ الرسل والملوک طبری، جلد ۵ صفحہ ۱۶۳
[2] تاریخ کامل، جلد ۳ صفحہ طبری، جلد ۵ صفحہ ۱۶۷۔

ہر الزام سے بری، خدا ترس اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے والے پاتے اور ان کو فاجر و فاسق، دھوکا باز، جھوٹا اور جو کچھ ظاہر کر رہے ہیں اس کے خلاف سعی و تدبیر کرتے ہوئے دیکھتے ۔"

ان الفاظ سے ایک تو یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہ رض حکومت اور اس کے ذمہ داروں کے اعمال وقت نظر سے مطالعہ کرتی رہتی تھیں کہ کون سے امور حدود عدل و انصاف کے اندر انجام پا رہے ہیں اور کہاں ان حدود سے تجاوز ہو رہا ہے۔ دوسرے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ عوام کے مسائل و معاملات سے حضرت عائشہ رض کا بہت ہی گہرا اور قریبی تعلق تھا اور لوگ اہم سیاسی مسائل تک میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور وہ ان کو سلجھانے کی کوشش کرتی تھیں حضرت عثمان رض کے بعد کس کو خلیفہ بنایا جائے؟ اس بنیادی سوال کو لے کر بصرہ کی مشہور شخصیت اور اپنے قبیلہ کے سردار احنف، حضرت طلحہ رض اور زبیر رض کے علاوہ حضرت عائشہ رض کے پاس بھی جاتے ہیں۔ جب تینوں کی رائے حضرت علی رض کے حق میں پاتے ہیں تو مدینہ جا کر حضرت علی رض کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں [1]

عملی تعاون

مختلف سیاسی وغیر سیاسی مسائل میں عورت کی رائے اور فہم سے اسلامی معاشرہ نے جس طرح فائدہ اٹھایا ہے اسی طرح اپنی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں بھی اس کی عملی صلاحیتوں سے وہ مدد حاصل کرتا رہا ہے۔ عورتوں نے رضا کارانہ جو جنگی خدمات انجام دی ہیں ان کا ذکر اس سے پہلے آ چکا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ضرورت پر ریاست نے بھی ان سے یہ خدمات حاصل کی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رض سے خوارج نے دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ

---

[1] تاریخ الرسل والملوک طبری، جلد ۵ ص۱۹۰۔

صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو جہاد پر لے جاتے تھے ؟ انھوں نے جواب دیا۔

وقد كان يغزو بهن فيداوين الجرحى[1]

"ہاں آپ ان کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور وہ زخمیوں اور مریضوں کے علاج معالجہ کا کام انجام دیتی تھیں"

حضرت انس رض فرماتے ہیں :-

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يغزو بام سليم ونسوة من الانصار فيسقين الماء ويداوين الجرحى[2]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام سلیم اور انصار کی بعض خواتین کو لے کر جنگ پر روانہ ہوتے تھے تاکہ وہ پیاسوں کو پانی پلائیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کریں"

اس کے علاوہ بعض سماجی اور مذہبی کام بھی ان سے لیے گئے ہیں، مثلاً ام ورقہ بنت عبداللہ کہتی ہیں :-

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يزورها في بيتها وجعل لها موذنا يؤذن لها وامرها ان تؤم اهل دارها[3]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملاقات کے لیے ان کے گھر آتے تھے اور آپ نے ان کے لیے ایک موذن بھی مقرر کر دیا تھا کہ اذان دیا کرے اور ان کو اپنے گھر والوں کی امامت کا حکم دیا تھا"

حضرت عبداللہ بن عمر رض اپنی ایک لونڈی کو حکم دیتے تھے کہ وہ رمضان کی راتوں کی نماز (تراویح) میں ان کے گھر کی عورتوں کی امامت کرے[4]

---

[1] مسلم کتاب الجہاد باب النساء الغازیات یرزق لہن۔ ترمذی ابواب السیر باب من یعطی الفئی۔

[2] ابوداؤد، کتاب الجہاد باب فی النساء یغزون۔ مسلم کتاب الجہاد۔ ترمذی، ابواب السیر۔

[3] ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ باب امامۃ النساء۔

[4] المحلی لابن حزم، جلد ۳ صفحہ ۱۳۵

شفاء بنت عبداللہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ:-

ربّما ولّاھا دای عمر) شیئاً من امر السوق لہ

"بسا اوقات حضرت عمرؓ ان کو بازار کی کوئی ذمہ داری سونپتے تھے"

یہ واقعات اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ اسلامی معاشرہ نے مسلمان عورت پر بہت سی سیاسی و سماجی ذمّہ داریاں عائد کیں اور مسلمان عورت نے اپنے خانگی فرائض کے ساتھ ان سے بھی عہدہ برآ ہونے کی سعی کی۔

لہ الاستیعاب فی اسماء الاصحاب۔

عورت اور اجتماعی مناصب

عورت کی فکری صلاحیتیں

اسلامی معاشرہ میں عورت سے جو خدمات لی گئی ہیں ان کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان چند متعین ذمہ داریوں ہی پر وہ مامور کی جاسکتی ہے یا ان کے علاوہ دیگر فرائض اجتماعی بھی اس کو سونپے جا سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اسلام، عورت کی فکری و عملی صلاحیتوں کے متعلق کیا رائے رکھتا اور ان پر کس حد تک اعتماد کرتا ہے؟ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ ممکن ہوگا کہ وہ کس نوعیت کے کاموں کی اہل ہے اور اسلامی معاشرہ میں اس پر کن ذمہ داریوں کا بار ڈالا جائے گا اور کن ذمہ داریوں کا نہیں؟

دنیا میں کام ایک طرح کے نہیں ہوتے چھوٹے بڑے، اہم اور غیر اہم ہر طرح کے ہوتے ہیں اور جو کام جس نوعیت کا ہوتا ہے اس کے انجام دینے کے لیے اسی نوعیت کی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر شخص میں ہر قسم کے کام کی صلاحیت نہیں ہوتی کوئی کسی کام کے لیے موزوں ہے تو کسی دوسرے کام کے لیے ناموزوں ہوگا۔ کوئی سائنسی تحقیقات کا اہل ہے تو کسی کے اندر عسکری تنظیم کا سلیقہ ہے۔ کوئی آرٹسٹ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے تو دوسرا اپنے اندر انشاء اور خطابت کی قوتیں پاتا ہے کسی کی جسمانی ساخت اور توانائی محنت اور مشقت برداشت کرے گی تو کوئی بالکل اس کے قابل نہ ہوگا، صلاحیتوں کا یہ اختلاف یوں تو ہر دو افراد کے درمیان پایا جاتا ہے لیکن جہاں انسانوں کی ایک صنف کا دوسری صنف سے مقابلہ کیا جائے تو یہ اختلاف

بہت ہی واضح اور نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔

عورت کمزور ہے

عورت اور مرد کے درمیان یہ اختلاف شریعت کی نگاہ میں فکری وعملی دونوں پہلوؤں سے ہے، چنانچہ عورتوں کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ناقصات عقل ودین [1]

یہاں "عقل" سے اس کے قوائے ذہنی کی طرف اشارہ ہے اور "دین" سے اس کی جسمانی طاقتیں مراد ہیں۔ یعنی ان دونوں پہلوؤں سے وہ مرد سے کمزور اور ناقص واقع ہوئی ہے۔

فقہا نے تصریح کی ہے:-

الرجل خیر من المرأۃ [2]

"(صلاحیتوں کے لحاظ سے) مرد عورت سے بہتر ہے"

عورت کی کمزوریوں کی رعایت

شریعت نے اس کی ان کمزوریوں کو صرف تسلیم ہی نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں ان کی رعایت کی ہے۔

(۱) ایام ماہواری میں ایک تو اس کی ظاہری نظافت اور پاکیزگی ختم ہو جاتی ہے اور دوسرے اس کے جسمانی نظام میں اس قدر اختلال رونما ہو جاتا ہے کہ وہ کسی ایسے کام کے قابل ہی نہیں رہتی جس میں زیادہ توجہ اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے شریعت نے ان ایام میں نماز جیسا اہم تزین فرض اس پر سے ساقط کر دیا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اوپر ابھی جو ارشاد گزرا ہے اس میں آپ نے اس کے "نقص دین" کی تشریح فرماتے ہوئے یہی بتایا کہ اس فطری کمزوری

---

[1] بخاری، کتاب الحیض، باب ترک الحائض الصوم

[2] فتح القدیر، جلد ۸ ص۴۷۹۔

کی وجہ سے اس زمانہ میں اس پر نماز اور روزے کا بار نہیں ڈالا گیا۔

(۲) ان سے بھی سخت تر حالات سے اس کو زچگی کے دوران گزرنا پڑتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ موت و حیات کی کشمکش سے گزرتی ہے۔ عورت کے اس نازک مرحلہ سے گزر کر حالتِ اعتدال پر آنے تک شریعت نے نماز سے اس کو منع کر دیا ہے۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں:۔

کانت المرأۃ من نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم تقعد فی النفاس اربعین لیلۃ لا یأمرھا النبی بقضاء صلوٰۃ النفاس[1]

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم (کے خاندان) کی عورتوں میں سے بعض بعض چالیس دن تک نفاس کی حالت میں مبتلا رہتیں۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نفاس کے زمانہ کی نماز قضا کرنے کا حکم نہ دیتے۔

(۳) مدت حیض و نفاس میں اگر روزے فرض ہو جائیں تو حکم دیا گیا کہ اس مدت میں یہ فرض انجام نہ دیا جائے بلکہ دوسرے دنوں میں ان کی قضا کی جائے جبکہ وہ ادائیگی کے قابل ہو جائے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم کو زمانۂ حیض کے روزوں کی قضا کا تو حکم دیا جاتا لیکن نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا[2]

(۴) کم و بیش یہی حال اس کا حمل اور رضاعت کی مدت میں رہتا ہے، اس مدت میں روزہ جیسی سخت عبادت کا ادا کرنا اس کے لیے انتہائی دشوار تھا چنانچہ شریعت نے یہ فرض دوسرے دنوں میں بجا لانے کی اس کو اجازت عطا کی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

ان اللہ وضع عن المسافر شطر الصلوٰۃ وعن

---

[1] ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی وقت النفساء۔

[2] مسلم، کتاب الحیض، باب وجوب قضاء الصوم علی الحائض

المسافر والحامل والمرضع الصوم[1]

"اللہ نے مسافر کی آدھی نماز کی تخفیف کر دی (وہ چار رکعت کی جگہ دو رکعت پڑھے گا) اور حاملہ اور دودھ پلانے والی کے لیے رمضان میں روزوں کی ادائیگی ضروری نہیں قرار دی (وہ دوسرے مہینوں میں اس کو ادا کر سکتی ہے)۔"

(۵) شریعت نے کمزوروں اور ناتوانوں کو جہاد کے بارِ گراں سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ اس صف میں آپ کو بوڑھوں اور بچوں کے ساتھ عورت بھی ملے گی۔

عن ابی ھریرۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد الکبیر والصغیر والضعیف والمرأۃ الحج والعمرۃ[2]

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ بوڑھے، بچے، کمزور اور عورت کے لیے حج اور عمرہ ہی جہاد ہے۔"

(۶) اگر وہ حج کے لیے جاتی ہے تو قدم قدم پر اس کے ضعف اور کم توانائی کی رعایت کی جاتی ہے۔ مثلاً ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو مزدلفہ میں رات گزار کر منیٰ کو چلنا چاہیے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو سویرے ہی منیٰ کے لیے روانہ ہونے کی اجازت دے دی تاکہ مجمع کے ساتھ چلنے میں ان کو کوئی زحمت نہ ہو، ساتھ ہی ان کو یہ بھی حق دیا کہ لوگوں کے منیٰ پہنچنے سے پہلے ہی رمی جمرہ سے فارغ ہو جائیں۔[3]

عورت کی ذہنی صلاحیت

عورت کی فکری صلاحیتوں کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

---

[1] ابن ماجۃ، ابواب ما جاء فی الصیام، باب ما جاء فی الافطار للحامل والمرضع، وروی بمعناہ الترمذی وابوداؤد والنسائی۔

[2] نسائی، کتاب مناسک الحج، باب فضل الحج۔

[3] بخاری، کتاب الحج، باب من قدم ضعفۃ اہلہ الخ

گزر چکا ہے کہ اس کی صلاحیتیں مرد سے کم تر درجہ کی ہوتی ہیں۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کے شارح امام اکمل الدین البابرتی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی روشنی میں عورت کی ذہنی صلاحیتوں کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر متعین کرنے کی کوشش کی ہے، فرماتے ہیں:-

"نفس انسانی کی قوتوں کو چار درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا درجہ یہ کہ مطلقاً سوچنے سمجھنے کی استعداد موجود ہو یہ استعداد فطرتاً ہر شخص میں پائی جاتی ہے دوسرا درجہ یہ کہ جزئیات میں حواس کے استعمال سے بدیہی باتیں دریافت ہونے لگیں (مثلاً دیکھ کر رنگ کا اور چکھ کر ذائقہ کا تعین وغیرہ) اور عقل اس قابل ہو کہ ان میں غور و فکر کے ذریعہ خالص فکری حقائق کا اکتساب کرنے لگے۔ اس کو اصطلاح میں "العقل بالملکۃ" کہتے ہیں۔ اس صلاحیت کے بعد ہی آدمی پر شریعت کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ بدیہی حقیقتوں سے جو نظریات مستنبط ہو رہے ہیں ان کے ادراک میں کسی قسم کی دقت اور محنت نہ پیش آئے اس کا نام "العقل بالفعل" ہے۔ چوتھا درجہ یہ کہ یہ نظریات ہمیشہ ذہن میں اس طرح مستحضر ہوں گویا کہ آنکھوں کے سامنے ہیں اس کو "عقل مستفاد" کہا جاتا ہے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں:-

ولیس فیما ھو مناط التکلیف وھو العقل بالملکۃ فیھن نقصان بمشاھدۃ حالھن فی تحصیل البدیھیات باستعمال الحواس فی الجزئیات وبالتنبیہ ان نسیت فانہ لوکان فی ذالک نقصان لکان تکلیفھن دون تکلیف الرجال فی الارکان ولیس کذالک وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم ھن ناقصات عقل المراد بہ العقل بالفعل[1]

---

[1] العنایہ مطبوع علی حاشیہ فتح القدیر، جلد ۲، صفحہ ۔

"شریعت کی ذمہ داریوں کا دار و مدار جس صلاحیت عقل پر ہوتا ہے یعنی "العقل بالملکہ" (عقل کا دوسرا درجہ) عورتوں میں اس کی کمی نہیں ہے کیونکر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جزئیات میں حواس کو استعمال کر کے بدیہیات کو پالیتی ہیں اور اگر کسی بات کو فراموش کر جاتی ہیں تو یاد دہانی کے بعد ذہن میں حاضر بھی کر لیتی ہیں۔ اگر کسی کی صلاحیت میں کسی قسم کا نقص ہوتا تو دین کے جن ارکان کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی گئی ہے عورتوں کو اس سے مختلف ارکان کی تکلیف دی جاتی حالانکہ صورت واقعہ یہ نہیں ہے، بلکہ دونوں پر ایک ہی طرح کی ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں "ناقصات العقل" جو فرمایا تو اس سے "العقل بالفعل" یعنی عقل کا تیسرا درجہ مراد ہے۔"

عورت کی گواہی

بہر حال شریعت نے مرد کو عقلی حیثیت سے برتر تصور کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مرد کی عقل پر عورت کی عقل سے زیادہ اعتماد بھی کیا ہے اس کی وضاحت کے لیے ہم عورت کی گواہی کے مسئلہ کو لیتے ہیں کیونکہ اس مسئلہ کو عورت کی عقل کے نقص پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور دلیل پیش کیا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے:-

شهادة المرأة مثل نصف شهادة الرجل[1]

"عورت کی گواہی مرد کی گواہی کی نصف ہے۔"

قرآن مجید میں پانچ مقامات پر شہادت کے احکام بیان کیے گئے ہیں جن میں صرف ایک مقام پر عورت کی شہادت کے مرتبہ و حیثیت سے بحث کی گئی ہے چنانچہ لین دین کے سلسلہ میں قرض کے احکام بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:-

---

[1] بخاری، کتاب الحیض، باب ترک الحائض الصوم۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى۔

(البقرہ — ۲۸۲)

"اور گواہی حاصل کرو اپنے مردوں میں سے دو کی اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، یہ گواہ ان لوگوں میں سے ہوں جن کو تم بحیثیت گواہ کے پسند کرتے ہو (ایک مرد کی جگہ دو عورت اس لیے کہ) اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے"

قرآن مجید نے عورت کی شہادت کے سلسلہ میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان سے کئی ایک سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ تنہا خواتین کی شہادت معتبر ہے یا نہیں؟ اگر معتبر ہے تو کیا تمام معاملات میں یا صرف بعض میں، اور یہ کہ ہر معاملہ میں نصاب شہادت کیا ہے؟ یعنی گواہی دینے والیوں کی کتنی تعداد ضروری ہے؟ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خواتین کی شہادت قابل قبول ہونے کے لیے ان کے ساتھ مرد کا ہونا ضروری ہے تو اس وقت بھی بعینہٖ یہی سوالات ابھرتے ہیں کہ یہ مشترک شہادت کیا ہر قسم کے مسائل میں فیصلہ کی بنیاد بن سکتی ہے یا صرف بعض مسائل کا فیصلہ اس کے ذریعہ ہو سکتا ہے؟

ان سوالات پر مسلمان فقہاء نے تفصیل سے بحث کی ہے، ہم ان کے خیالات کو کسی قدر تفصیل سے پیش کرتے ہیں تاکہ ان خیالات کی روشنی میں عورت کی ذہنی صلاحیتوں کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر سمجھنے میں آسانی ہو۔[1]

---

[1] ذیل میں شہادت سے متعلق جو خیالات پیش کیے جا رہے ہیں وہ المحلی ابن حزم جلد ۹ صفحہ ۳۹۵ تا ۴۰۰، اور امام ابن قیمؒ کی کتاب الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ صفحہ ۱۳۲ تا صفحہ ۱۳۹ سے ماخوذ ہیں مگر درمیان میں کسی اور کتاب سے کوئی بات لی گئی ہے تو وہیں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

تنہا عورتوں کی گواہی

امت کے تقریباً تمام فقہا متفق ہیں کہ ایسے مخصوص نسوانی مسائل کے فیصلہ کے لیے تنہا عورتوں کی شہادت کافی ہے جن کا علم مردوں کو نہیں ہو سکتا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

الولاد وعیوب النساء مما لم اعلم مخالفاً لقیت أنّ شہادة النساء فیہ جائزة لا رجل معهنّ۔

"جن (اہل علم حضرات) سے میں نے ملاقات کی ان میں کسی کو اس بات کا مخالف نہیں پایا کہ ولادت اور عورتوں کے (قابل ستر مقامات کے) عیوب کے سلسلہ میں عورتوں کی شہادت مرد کی شرکت کے بغیر جائز ہے۔"

امام زہریؒ کا بیان ہے:۔

مضت السنة ان تجوز شہادة النساء فیما لا یطلع علیہ غیرھن۔

"یہ سنت چلی آرہی ہے کہ ایسے تمام معاملات میں تنہا عورتوں کی شہادت جائز ہے جن کی اطلاع سوائے اُن کے کسی اور کو نہیں ہوتی۔"

مخصوص نسوانی مسائل کے علاوہ دیگر مسائل حیات میں فقہاء کے اختلاف، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور ان کے ہم خیال بعض اور فقہاء نے صرف عورتوں کی شہادت قبول نہیں کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عمرؓ بن عبدالعزیزؒ، اور عطاء بن ابی رباحؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:۔

لا یجوز شہادة النساء وحدھن الا علی ما لا یطلع علیہ غیرھن من عورات النساء وحملھن وحیضھن۔

"تنہا عورتوں کی شہادت صرف ان ہی امور میں جائز ہے جن سے
سوائے ان کے اور کوئی واقف نہیں ہو سکتا یعنی عورتوں کے قابلِ ستر
مقامات اور حمل اور حیض سے متعلق ان کے بیانات پر فیصلہ کیا جائے گا
اس کے لیے مرد کی شرکت ضروری نہیں سمجھی جائے گی"

حضرت علی رضہ کا ایک قول اسی خیال کی تائید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن بعض روایات اس کے خلاف بھی ملتی ہیں۔ چار خواتین نے حضرت علی رضہ کے سامنے شہادت دی کہ فلاں عورت نے فلاں بچہ کو پیر سے روند کر ہلاک کر دیا ہے تو آپ نے ان کی شہادت قبول کی۔

ایک دوسرا واقعہ ہند بنت طلق بیان کرتی ہیں کہ ہم چند عورتیں ایک جگہ تھیں، وہیں ایک بچہ کپڑے سے ڈھکا پڑا تھا ایک عورت نے ادھر سے گزرتے ہوئے اس کو روند ڈالا۔ بچہ کی ماں نے دعویٰ کیا کہ اس نے میرے بچہ کو ہلاک کر دیا۔ اس کی گواہی حضرت علی رضہ کے سامنے دس عورتوں نے دی جن میں میں بھی شامل تھی تو حضرت علی رضؓ نے اس عورت پر دیت لازم کر دی۔

اسی طرح حضرت عمر رضہ کے متعلق ایک روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ، نکاح، طلاق، حدود اور خون کے معاملات میں عورت کی شہادت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، لیکن ایک دوسری روایت ہے کہ چار عورتوں نے حضرت عمر رضہ کے سامنے گواہی دی کہ فلاں شخص نے نشہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ آپ نے بیوی کو شوہر سے جدا کر دیا۔

بعض فقہا کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ نسوانی معاملات میں تنہا خواتین کی گواہی جس بنیاد پر قبول کی جاتی ہے یعنی یہ کہ ان کا علم صرف خواتین ہی کو ہو سکتا ہے، اس نوعیت کے حالات جہاں کہیں اور جن مسائل میں پیدا ہو جائیں ان کی شہادت قبول کی جانی چاہیے۔ حضرت عمر رضہ اور حضرت علی رضؓ سے جو متضاد روایات منقول ہیں ان کے درمیان اس رائے کے ذریعہ تطبیق دی جا سکتی ہے کہ انہوں

نے تنہا خواتین کی شہادت ایسے حالات میں قابلِ رد قرار دی ہے جب کہ مردوں کو عورتوں سے زیادہ واقعات کے مطالعہ کے مواقع ہوں اور ان کی شہادت پر صرف ان صورتوں میں فیصلہ کیا ہے جن میں کہ ان کی شہادت قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا اور نہ قبول کرنے میں حقوق کے ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :۔

تقبل شهادة النساء في الحدود اذا اجتمعن في العرس والحمام ونص عليه احمد في رواية بكر بن محمد عن ابيه ونقل ابن صدقة في الرجل يوصي باشياء لاقاربه ويعتق لا يحضره الا نساء هل تجوز شهادتهن في الحقوق والصحيح قبول شهادة النساء في الرجعة فان حضورهن عنده اليسر من حضورهن عند كتابة الوثائق [1]

"اگر خواتین باراتوں اور غسل خانوں میں جمع ہوں اور وہاں کوئی حد کے قابل سانحہ پیش آجائے تو ایسی صورت میں حدود سے متعلق ان کی گواہی قبول کی جائے گی بکر بن محمد نے اپنے والد کے حوالے سے امام احمد سے اس کی صراحتاً روایت کی ہے۔ ابن صدقہ نے ایک صورت نقل کی ہے کہ اگر ایک شخص اپنے رشتہ داروں کو وصیت کرے اور اپنے غلام کو آزاد کرے لیکن اس وقت سوائے عورتوں کے اور کوئی موجود نہ ہو کیا اس طرح کے حقوق میں عورتوں کی گواہی جائز ہوگی ؟ امام احمدؒ نے فرمایا۔ ہاں حقوق میں ان کی گواہی جائز ہے [2] اسی طرح طلاق سے

---

[1] الاختیارات العلمیہ المطبوع مع الفتاوی صـ ۲۱۲

[2] ہم نے توسین کا اضافہ الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ صـ ۱۲۲ سے کیا ہے اس کے بغیر

رجوع کے متعلق بھی ان کی شہادت قبول کی جائے گی کیونکہ دستاویزات کی تحریر کے وقت ان کا حاضر ہونا اتنا آسان نہیں جتنا کہ طلاق سے رجوع کے وقت موجود ہونا آسان ہے۔ لہٰذا جب پہلی صورت میں ان کی گواہی قبول کی گئی تو دوسری صورت میں بھی قبول کی جانی چاہیے۔"

عطاء بن ابی رباحؒ کہتے ہیں کہ اگر آٹھ خواتین کسی عورت کے زانی ہونے کی شہادت دیں تو میں اس کو رجم کر دوں گا۔

علامہ ابن حزمؒ تو دو عورتوں کو ایک مرد کی حیثیت دینے کے بعد ہر حال میں اور ہر قسم کے حقوق و معاملات میں خواتین کی شہادت کو معتبر سمجھتے ہیں۔

قاضی شریحؒ کی بھی غالباً یہی رائے تھی۔ ایک گھر کے سازوسامان کے متعلق ان کے پاس مقدمہ پیش ہوا۔ فریقین میاں بیوی تھے، شوہر کا دعویٰ تھا کہ مال و اسباب اس کا ہے لیکن چار عورتوں نے گواہی دی کہ یہ بیوی کا ہے بیوی نے اپنے مہر کی رقم شوہر کے حوالے کی تو اس کے عوض شوہر نے یہ مال و اسباب اس کو دیا تھا۔ قاضی شریحؒ نے عورتوں کے اس متفقہ بیان کے مطابق شوہر کے خلاف فیصلہ کیا۔

اسی قسم کی ایک اور روایت آتی ہے کہ انہوں نے مہر کے ایک مقدمہ میں چار خواتین کی گواہی پر شوہر کے خلاف بیوی کے حق میں فیصلہ دیا۔

ایاس بن معاویہؒ نے طلاق کے سلسلہ میں دو عورتوں کی گواہی قبول کی ہے۔

حضرت معاویہؓ کے متعلق مروی ہے کہ صرف ام سلمہؓ کی شہادت پر انہوں نے ایک مکان سے متعلق قضیہ چکا دیا۔

عورت اور مرد کی مشترکہ گواہی

جن فقہاء نے ہر قسم کے معاملات میں تنہا خواتین کی شہادت کو معتبر مانا ہے ان کے لیے خواتین اور مردوں کی مشترکہ شہادت کو قبول کرنے میں کوئی

عذر نہیں ہو سکتا وہ اس کو ضرور ہی قبول کریں گے۔ یہاں اصل سوال ان فقہاء کے بارے میں پیدا ہوتا ہے جو نسوانی مسائل کے محدود دائرہ ہی کے اندر تنہا خواتین کی شہادت کو معتبر سمجھتے ہیں۔ اس دائرہ سے باہر جب تک عورت کے ساتھ گواہی میں مرد بھی شریک نہ ہو جائے وہ اس گواہی پر اعتماد کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ فقہاء کے اس گروہ کے درمیان اس پہلو سے اختلاف ہے کہ کن معاملات میں یہ مشترکہ شہادت قبول کی جائے گی اور کن معاملات میں قبول نہیں کی جائے گی:

مکحولؒ تابعی کہتے ہیں کہ صرف قرض کے سلسلہ میں عورتوں کی گواہی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ربیعہؒ کی رائے ہے کہ عورتوں کی شہادت نکاح، طلاق، حدود اور غلام کی آزادی کے متعلق تو قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ البتہ ایسے حقوق اور معاملات جو باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں، ان میں اس کی شہادت قبول کی جا سکتی ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ صرف مالی مسائل میں مردوں کے ساتھ عورتوں کے بیان پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے، گو کہ مالی مسائل کے تعین میں ان کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے۔ تمام فقہائے احناف اور عثمان بتی حدود و قصاص کے علاوہ ہر قسم کے مسائل میں عورت اور مرد کے مشترکہ بیان کو فیصلہ کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں۔ ایک روایت سے امام سفیان ثوریؒ کا بھی یہی خیال ظاہر ہوتا ہے، ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاص میں بھی مشترکہ گواہی ان کے نزدیک جائز ہے۔ صرف حدود میں وہ اس کو فیصلہ کے قابل نہیں مانتے۔ طاؤس کہتے ہیں کہ زنا کے علاوہ بقیہ تمام معاملات میں مشترکہ شہادت تسلیم کی جائے گی۔ زنا میں اس لیے قبول نہیں کی جائے گی کہ اس حالت کا بغور دیکھنا عورتوں کے لیے جائز نہیں ہے۔ عطا بن ابی رباحؒ کی رائے میں زنا اور دوسرے معاملات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ زنا میں بھی اگر تین مرد اور دو عورتیں گواہی دیں تو وہ قبول کی جائے گی۔

گواہی کی اہمیت

فقہاء نے خواہ بعض معاملات میں عورت کی شہادت قبول کی ہو یا مطلقاً

ہیں، لیکن جس حد تک بھی اس کی گواہی پر بھروسہ کیا ہے اس حد تک وہ اس کی ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ کیونکہ شہادت سادہ سی خبر اور اطلاع کو نہیں کہا جاتا بلکہ شہادت نام ہے کسی واقعہ کو اس کی حقیقی شکل میں مطالعہ کرنے اور اس کی بعینہٖ تعبیر کا۔ یہ کوئی آسان اور سہل کام نہیں ہے بلکہ ایک بھاری ذمہ داری ہے جو آدمی اپنے سر لیتا ہے۔ اتنی بھاری ذمہ داری کہ حاکم وقت اس کے مطابق بڑے سے بڑا اقدام کرنے پر مجبور ہے۔ درمختار میں لکھا ہے۔

وحکمھا وجوب الحکم علی القاضی بموجبھا بعد التزکیۃ فلو امتنع بعد وجود شرائطھا اثم لترکہ الفرض واستحق العزل لفسقہ وعزر لارتکابہ مالا یجوز شرعا وکفران لم یر الوجوب[1]

"شہادت کا حکم یہ ہے کہ تحقیق کے بعد قاضی پر اس کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہو جاتا ہے اگر شرائط کے پائے جانے کے بعد وہ فیصلہ سے رکتا ہے تو گناہگار ہو گا کیونکہ وہ اس طرح ایک فرض کا تارک بن رہا ہے اور اپنے اس فسق کی وجہ سے معزولی کا مستحق ہو گا اور اس کو تعزیر کی جائے گی اس لیے کہ وہ ایسی حرکت کا مرتکب ہو رہا ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے اور اگر وہ اس کے مطابق فیصلہ کو واجب ہی نہ سمجھے تو اس کی تکفیر کی جائے گی"

اسی وجہ سے ہمارے فقہا نے لکھا ہے:-

اھلیۃ القضاء تدور مع اھلیۃ الشھادۃ[2]

"جہاں شہادت کی اہلیت ہوتی ہے وہاں قضا کی بھی اہلیت ہوتی ہے"

---

[1] درالمختار المطبوع علی حاشیۃ رد المختار جلد ۴ صفحہ ۵۱۳
[2] بدائع الصنائع، جلد ۷، صفحہ ۳

یعنی اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں شہادت دے سکتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس معاملہ میں فیصلہ کرنے کا بھی اہل ہے۔ اس لیے یہ بات قطعی طور پر معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ عورت کی شہادت کے متعلق اسلام کا صحیح نقطہ نظر کیا ہے تاکہ ہم اس کی بنیاد پر فیصلہ کر سکیں کہ اس کی ذہنی صلاحیتیں اسلامی نقطہ نظر سے کس حد تک اور کن پہلوؤں سے کار آمد اور مفید ہیں۔

عورت کی گواہی سے متعلق فقہاء کے خیالات کا تجزیہ

عورت کی شہادت سے متعلق فقہاء کے جو خیالات ابھی پیش کیے گئے ہیں ایک طرف ان سب کا رد کر دینا دشوار بلکہ ناممکن ہے تو دوسری طرف ان کو جوں کا توں قبول کرنا بھی مشکل ہے کیونکہ کسی ایک پہلو میں کسی فقیہ کا قول عقل و شریعت سے ہم آہنگ نظر آتا ہے تو دوسرے پہلو میں دوسرے فقیہ کی رائے وزنی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کوشش کی جائے گی کہ ان مختلف افکار کی روشنی میں اصولِ دین اور فہمِ انسانی سے قریب تر رائے دریافت کی جائے۔

امام مالکؒ ہوں یا امام شافعیؒ یا فقہاء کا وہ گروہ جو صرف قرض یا مالی مسائل کی حد تک شہادتِ نسواں کو جائز سمجھتا ہے۔ ان کی رائے اس تصور پر مبنی ہے کہ عورت کا حافظہ اور فہم اصلاً اس قابل نہیں ہوتا کہ کسی معاملہ میں اس پر اعتماد کیا جائے مگر چونکہ بعض حالات میں اس کی عقل و فہم پر اعتماد کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہتا اس لیے مجبوراً اس کی شہادت کی بنیاد پر معاملات کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مالکی فقہ کی مشہور کتاب مدونہ میں لکھا ہے :-

شهادة النساء انما اجازت على وجه الضرورة[۱]

"عورتوں کی گواہی ضرورت کی بنا پر جائز ہوئی ہے"

اس تصور کی اساس ایک تو اس بات پر ہے کہ قرآن مجید نے مختلف

---

[۱] المدونۃ الکبری، جلد ۴ صفحہ ۸۳۔

مسائل زنا، قذف، طلاق اور اس سے رجوع، وصیت اور قرض یعنی دین سے بحث کرتے ہوئے شہادت کے احکام بیان کیے ہیں۔ لیکن صرف قرض کے سلسلہ میں عورت کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے موجودہ الفاظ میں جن میں اس کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے موجودہ الفاظ ہیں جن میں اس کی شہادت کا حکم بیان ہوا ہے۔

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۔ البقرہ ۔ ۲۸۲

گواہ بناؤ اپنے مردوں میں سے دو کو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، یہ گواہ ان لوگوں میں سے ہوں، جن کو تم گواہ کی حیثیت سے پسند کرتے ہو (ایک مرد کی جگہ دو عورت اس لیے کہ) ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔"

ان دونوں باتوں سے ان بزرگوں نے یہ سمجھا کہ قرض یا اس نوعیت کے دیگر مسائل کے علاوہ بقیہ معاملات میں اس کی شہادت جائز نہیں ہے، اور قرض کی نوعیت کے مسائل میں بھی اس کی شہادت کے قبول کیے جانے کی وجہ یہ ہے کہ قدم قدم پر ان مسائل سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ہر وقت صرف مردوں کی شہادت کا فراہم ہونا دشوار ہے۔

پھر آیت کے ظاہر الفاظ کی بنا پر یہ اصول بھی ان حضرات نے وضع کیا ہے کہ عورت کی شہادت اسی وقت قابل قبول ہوگی جب کہ گواہی دینے میں اس کے ساتھ مرد بھی شریک ہو کیونکہ عورت کی شہادت بربنائے ضرورت جائز کی گئی ہے اس لیے جس شکل میں اور جس حد تک اجازت دی گئی ہے، اس سے تجاوز صحیح نہیں ہوگا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

فلا يجوز من شهادتهن شيئ وان كثرن الا ومعهن

دجل[1]

"عورتوں کی کسی قسم کی شہادت جائز نہیں ہے خواہ وہ زیادہ ہی کیوں نہ ہوں الا یہ کہ ان کے ساتھ کوئی مرد ہو"

ہمارے خیال میں یہ تینوں باتیں صحیح نہیں ہیں۔ پہلی بات اس لیے صحیح نہیں ہے کہ احکام شریعت دونوں اصناف انسانی کے لیے عام ہوتے ہیں کسی حکم کے ذیل میں صراحت کے ساتھ عورت کا ذکر نہ کیے جانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہاں اس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس طرح تو شریعت کے بیشتر احکام کی وہ مکلف ہی نہیں رہے گی۔

باقی رہا قرآن مجید کے الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ عورت کی شہادت بربنائے ضرورت قبول کی گئی ہے تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ خود اس مسلک کے حاملین تسلیم کرتے ہیں کہ گواہی دینے والے دو مردوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت قبول کی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ میں ایک عملی صورت حال سے بحث کی گئی ہے اور وہ یہ کہ قرض کا لین دین ہو یا اسی نوعیت کے دوسرے معاملات، ان سے واسطہ عموماً مردوں ہی کو پڑتا ہے اس لیے شریعت نے یہاں اصلاً ان کی شہادت کے احکام بیان کیے ہیں۔ عورت کو اپنی خانگی مصروفیات کی بنا پر ان معاملات میں شرکت کا بہت کم موقع ملتا ہے لہذا اس کی شہادت کا تذکرہ بھی ضمناً کیا گیا ہے۔

اسی طرح ان حضرات کا یہ استدلال کہ عورت کی شہادت کے قابل قبول ہونے کے لیے کسی نہ کسی مرد کا شریک شہادت ہونا ضروری ہے، تسلیم کیے جانے کے لائق نہیں ہے کیونکہ اگر اس استدلال کو صحیح قرار دیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ شہادت کی جو دو صورتیں اس آیت میں بیان کر دی گئی ہیں بس

---

[1] کتاب الام، جلد ۷ ص ۷۷۔

دعویٰ کے اثبات کی بس وہی دو صورتیں ہیں۔ حالانکہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ مانتے ہیں کہ آیت میں جن صورتوں کا ذکر ہے ان سے ہٹ کر اگر کوئی شخص اپنے دعویٰ پر صرف ایک گواہ پیش کرے اور قسم کھائے تو اس کا دعویٰ ثابت ہو جائے گا۔

حنفیہ نے ان اعتراضات سے دامن بچا کر بہت ہی محتاط اور معقول روش اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ فقہ حنفی کے خیالات سے اسی اسکول کے ایک بہت بڑے محقق علامہ ابو بکر حصاصؒ نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ ذیل کی سطور میں ہم ان کی بحث کو اپنے الفاظ اور اپنی ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مشترکہ شہادت دو مردوں کی شہادت کا بدل ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ شہادت کا اصلاً ایک ہی طریقہ ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ تمام مسلمانوں کا کم از کم اس حد تک اجماع ہے کہ دو مردوں کی عدم موجودگی میں ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بن سکتی ہیں تو گویا یوں کہنا چاہیئے کہ قرآن مجید نے شہادت کی دو مختلف صورتیں پیش کی ہیں۔

اب جب کہ عورت کی یہ حیثیت تسلیم کر لی گئی کہ وہ گواہ بن سکتی ہے، تو جس معاملہ میں بھی شہادت کی ضرورت پڑے ہم اس کو بطور گواہ پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لا نکاح الا بولی و شاھدین۔

"ایک ولی اور دو گواہوں کے بغیر نکاح جائز نہیں ہے"

آیت میں بیان کردہ اصول شہادت کے مطابق ہمارے لیے جائز ہوگا کہ نکاح میں یا تو دو مردوں کو گواہ مقرر کریں یا ایک مرد اور دو عورتوں کو۔ اسی طرح شریعت کے اس ضابطہ "البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ" (دعویٰ کرنے والے پر دلیل فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے اور بصورت دیگر جس کے خلاف دعویٰ دائر کیا جائے اس پر قسم ضروری ہے) کے تحت اگر کوئی شخص اپنے دعویٰ کی دلیل میں مشترکہ شہادت پیش کرے تو اس کا دعویٰ ثابت

ہو جانا چاہیئے۔

تو آیت کے الفاظ ——— جب تم ایک مقررہ مدت کے لیے قرض کا معاملہ کرو ——— دلالت کرتے ہیں کہ عورت کی گواہی صرف مالیات تک محدود نہیں ہے کیونکہ قرآن نے ان الفاظ کے ذریعہ نہ صرف قرض کے سلسلہ میں اس کی شہادت منظور کی ہے بلکہ ادائیگی قرض کے لیے جو مدت متعین کی جائے اس کے متعلق بھی اس کے بیان پر اعتماد کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ تو کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ مدت کا تعلق صرف مالیات سے ہوتا ہے کیونکہ کفالت نفس اور آزادانسانوں سے غیر مالی قسم کے منافع کی بھی مدت مقرر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح دعویٰ قتل یا معافی قتل کے دعویٰ پر دلیل فراہم کرنے کے لیے حاکم ایک خاص وقت تک مہلت دے سکتا ہے۔ اگر کچھ دیر کے لیے یہ فرض بھی کیا جائے کہ مدت کا تعلق صرف مالیات سے ہے تب بھی یہ لازم آتا ہے کہ نکاح کے سلسلہ میں اس کی شہادت قبول کی جائے کیونکہ کسی شخص کے لیے ایک نامحرم عورت سے استمتاع کا حق مہر کی بنا پر حاصل ہوتا ہے اس طرح یہ ایک خالص مالی معاملہ ہے۔

اسی طرح ظاہر الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ قرض کی نوعیت رکھنے والے تمام معاملات میں مرد اور عورت کی مشترک شہادت کو قبول کیا جائے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ قرض کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ ایک چیز دی تو جائے فی الحال اور اس کا بدل بعد میں ادا کیا جائے۔ یہ صورت بہت سے معاملات میں پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نکاح کے ذریعہ کسی نامحرم عورت سے استمتاع کا حق حاصل کرے اور یہ طے کرے کہ اس کا عوض یعنی مہر بعد میں دے گا یا قتل کے سلسلہ میں مال پر صلح ہو جائے تو یہ مال قتل کا عوض بن جائیگا۔ کرایوں میں بھی یہی صورت ہے کہ ایک چیز اس وقت دی جا رہی ہے جس کا عوض بعد میں مل رہا ہے اگویا قرض کا لفظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے بہت ہی وسیع ہے اس لیے قرآن کے حکم کے مطابق یہ مفہوم معاملات کی جن جن شکلوں پر حاوی

ہو ان سب میں عورت کی شہادت قبول کی جانی چاہیے۔

ہمارے خیالات کی تائید بہت سے عملی نظائر سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قابلہ (دایہ) کی شہادت قبول کی۔ ظاہر ہے ولادت کا تعلق مالیات سے قطعاً نہیں ہے۔ ولادت کے معاملہ میں تمام لوگ متفق ہیں کہ عورت کی گواہی جائز ہے، اگر اختلاف ہے تو نصاب شہادت میں نہ کہ نفس شہادت میں۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ شہادت مالیات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے نکاح کے سلسلہ میں ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کو جائز قرار دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی اسی قسم کی روایت منقول ہے۔ ابو لبیدؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے طلاق کے سلسلہ میں عورت کی گواہی کو معتبر مانا ہے۔ عطاءؒ تابعی اور شعبیؒ نے بھی طلاق کے معاملہ میں عورت کی شہادت قبول کی ہے۔ محمد بن حنفیہؒ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ شادی بیاہ سے متعلق عورتوں کی گواہی جائز ہے۔ قاضی شریحؒ نے غلامی کے معاملہ میں مشترک شہادت کو صحیح مانا ہے۔

ان دلائل کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ مشترک شہادت ہر معاملہ میں قابل قبول ہونی چاہیے الا یہ کہ شریعت کسی خاص معاملہ میں اس کی شہادت کو ماننے سے انکار کر دے جیسا کہ اس نے حدود و قصاص میں کیا ہے۔

امام زہریؒ روایت کرتے ہیں:

مضت السنة من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والخلیفتین من بعدہ ان لا تجوز شہادة النساء فی الحدود ولا فی القصاص[1]

---

[1] احکام القرآن، جلد ۱ صفحہ ۵۹۴ تا ۵۹۸۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد کے دو خلفاء حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ حدود اور قصاص میں عورتوں کی شہادت کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔"

عورت کی شہادت پر فقہ حنفی کے ایک نامور محقق علامہ ابن الہمام ؒ نے ایک دوسرے پہلو سے بحث کی ہے۔ اس بحث میں جو باتیں اوپر گزر چکی ہیں ان کو حذف کر کے بقیہ اہم نکات کو ہم یہاں درج کر رہے ہیں، تاکہ مسئلہ اپنے حقیقی خدوخال کے ساتھ نکھر کر سامنے آجائے۔

"شہادت کی چار قسمیں ہیں:-

(۱) زنا کی شہادت۔ یہ شہادت مکمل ہوتی ہے چار مردوں کے متفقہ بیان سے، چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے:-

فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ۔

"پس تم گواہ بناؤ (زنا کا ارتکاب کرنے والیوں پر) اپنے میں سے چار کو"۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے مردوں سے خطاب کرتے ہوئے "اپنے میں سے چار" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اب اگر تین مردوں اور دو عورتوں کی شہادت قبول کی جاتی ہے تو قرآن کے بتائے ہوئے عدد اور معدود دونوں کے خلاف پڑتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشترک شہادت کے عام اصول اور اس آیت میں تعارض ہے یعنی اس اصول کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر معاملہ میں عورت کی شہادت معتبر مانی جاتی لیکن یہ آیت زنا کے سلسلہ میں اس کی گواہی قبول کرنے سے روکتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دوسری آیت کو اس عام اصول پر مقدم کیا جائے گا کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جواز اور حرمت کے درمیان جہاں مقابلہ ہو تو حرمت ہی پر عمل ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ شریعت کا حکم ہے کہ جہاں تک ہو سکے حدود کو دفع کرو، اگر اثبات زنا کے لیے یہ ضروری قرار دیا جائے کہ اس کے گواہوں میں صرف مرد

ہی ہوں اور عورت نہ ہو تو اس شرط کی وجہ سے زنا کے ثابت کرنے میں اتنی آسانی نہیں رہے گی جتنی آسانی کہ اس شرط کے نہ ہونے کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ اس طرح منشائے شریعت کی تکمیل میں آسانی ہو گی۔

تیسری بات یہ کہ قرآن نے جن الفاظ میں عورت کی شہادت قبول کرنے کا حکم دیا ہے۔ یعنی اگر شاہد دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ مقرر کرو۔ اس کا مطلب گو یہ نہیں ہے کہ مشترک شہادت کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے اور وہ دو مردوں کی شہادت کا بدل ہے، لیکن بہر حال ان الفاظ سے بدلیت کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض علماء اس طرف گئے بھی ہیں اور شبہ کے ہوتے ہوئے حدود میں فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے۔

(۲) زنا کے علاوہ بقیہ حدود کی شہادت۔

اس دوسری قسم میں بھی مذکورۂ بالا اسباب کی بناء پر عورت کی شہادت معتبر نہیں ہے۔ البتہ ان کے ثبوت کے لیے بجائے چار کے دو مرد کافی ہیں۔ قصاص کا بھی یہی حکم ہے۔

(۳) شہادت کی تیسری قسم میں حدود و قصاص اور عورت کے مخصوص مسائل کے علاوہ دوسرے تمام معاملات داخل ہیں خواہ ان کا تعلق مالی حقوق سے ہو یا نہ ہو مثلاً نکاح، طلاق، طلاق سے رجوع، عدت، استبراء رحم، اولاد، حسب نسب، وقف، صلح، ہبہ، اقرار، وصیت، وکالت، اور غلاموں کا آزاد کرنا وغیرہ۔ ان تمام معاملات میں دو مردوں کی شہادت بھی قابلِ قبول ہے اور ایک مرد اور دو عورتوں کی بھی۔

(۴) وہ ایسے مسائل جن کا علم صرف عورتوں ہی کو ہو سکتا ہے، مثلاً ولادت، دوشیزگی، قابلِ ستر مقامات کے عیوب وغیرہ تو ان میں ایک عورت کی گواہی بھی کافی ہے اگر مرد ہوں تو اور بھی اچھا ہے۔"[1]

---

[1] فتح القدیر، جلد ۶ ص ۴۔

اس بحث کا سب سے وزنی اور قیمتی پہلو یہ ہے کہ حنفیہ نے بعض دوسرے فقہاء کے مقابلہ میں وسعت نظر کے ساتھ مسئلہ کا مطالعہ کیا ہے اور نصوص شریعت کے پیچھے جو اسباب اور حکمتیں کام کر رہی ہیں ان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے عورت کی عقل و فہم کو بالکلیہ ناقابل اعتبار یا زندگی کے صرف ایک یا چند پہلوؤں ہی میں لائق توجہ نہیں قرار دیا بلکہ بیشتر معاملات میں اس پر بھروسہ کیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت کہ فقہ حنفی اس بات کا کوئی فیصلہ نہیں کر سکی ہے کہ کن مسائل حیات میں کس حد تک اس کی ذہنی قوتوں پر اعتماد صحیح ہے؟ اسی وجہ سے ہمیں ان کے خیالات میں تضاد ملتا ہے۔

حنفیہ نے زندگی کے مختلف مسائل کو جس طرح تقسیم کیا ہے اس میں زنا اور مخصوص نسوانی مسائل کے علاوہ بقیہ مسائل کے فیصلہ کے لیے کم از کم دو شہادتوں کو ضروری سمجھا ہے۔ ہم یہاں اس شرط کی قطعیت سے بحث نہیں کر رہے ہیں کہ آیا ہر حال میں دو ہی شہادتیں لازمی ہیں یا ایک شہادت کی بنیاد پر بھی فیصلہ ہو سکتا ہے بلکہ تھوڑی دیر کے لیے اس شرط کو تسلیم کرتے ہوئے یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ نسوانی مسائل اور دیگر مسائل میں کونسا بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے پہلی قسم کے مسائل میں صرف ایک شہادت کافی ہو جاتی ہے اور دوسری قسم کے لیے ناکافی! اس کا جواب فقہ حنفی کے امام وقت علامہ بدرالدین کاشانی المتوفی ۵۸۷ھ نے دیا ہے پہلے اسے ملاحظہ فرمائیے، فرماتے ہیں:۔

"سوائے پیغمبر کے کسی بھی شخص کی شہادت سے قطعی اور یقینی علم حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں بہرحال کسی نہ کسی پہلو سے غلطی کا احتمال باقی رہتا ہے۔ صرف پیغمبر ہی کی شخصیت ایسی ہوتی ہے کہ اس کا بیان ہر شک و شبہ سے بالاتر ہوتا ہے کسی صادق و امین انسان کی گواہی زیادہ سے زیادہ "ظن غالب" کا فائدہ دے سکتی ہے "ظن غالب" کے حصول کے لیے ایک قابل اعتماد آدمی کی شہادت بھی کافی (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) قرآن مجید نے شہادت کے جو اصول مقرر کیے ہیں

تعبدی ہیں اور ان کی حکمت عقل کی گرفت میں نہیں آتی اس لیے ان اصول کی جو شکلیں شریعت نے متعین کر دی ہیں ہم اس کی پابندی پر مجبور ہیں اور باقی صورتوں میں مذکورہ بالا قاعدہ پر عمل ہوگا۔ چنانچہ اس نے عورت کی شہادت کی ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے ، جب کہ وہ مرد کے ساتھ مل کر گواہی دے رہی ہو لیکن جن معاملات میں صرف عورتیں گواہ ہوں ان کے متعلق قرآن خاموش ہے ، ان میں ہم اسی قاعدۂ کلیہ پر عمل کریں گے۔ اس کی تائید حضور کے اسوہ سے بھی ہوتی ہے کہ آپ نے ولادت کے سلسلہ میں ایک دایہ کی شہادت قبول کی "[1]

اس دلیل پر کئی ایک اعتراضات واقع ہوتے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس دلیل کو اگر صحیح مان لیا جائے تو عورت کے مخصوص مسائل میں ایک عورت کی شہادت تو کافی ہونی چاہیے لیکن ایک مرد کی شہادت ناکافی کیونکہ شریعت نے گواہی کی جو صورتیں پیش کی ہیں ان میں یا تو دو مردوں کی گواہی کا ذکر ہے یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کا صرف ایک مرد کی شہادت کا ذکر نہیں ہے لیکن حنفیہ کے پاس اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ جن مسائل میں ایک عورت کی گواہی معتبر ہو ان میں بدرجۂ اولیٰ ایک مرد کی گواہی پر اعتبار کیا جانا چاہیے۔

اس اصول کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ جب "ظن غالب" کے پیدا کرنے میں مرد اور عورت برابر ہیں تو دونوں کو مساوی حیثیت ملنی چاہیے لیکن حنفیہ نے کسی بھی مسئلہ میں عورت اور مرد کی عقل و فہم کو برابر نہیں سمجھا۔

اس کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے ہر معاملہ کے فیصلہ کے لیے صرف ایک گواہی کافی ہونی چاہیے۔ حالانکہ قرآن نے مختلف معاملات کے لیے نصاب شہادت مختلف مقرر کیا ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ نصاب شہادت ایک

---

[1] بدائع الصنائع، جلد ۶ صفحہ ۲۷۸

خالص تعبدی حکم ہے صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ حکم اپنے اندر بہت ہی نمایاں حکمت رکھتا ہے جسے خود علامہ کاشانی نے تسلیم کیا ہے :-

ولانہ اذا کان فرد ایخاف علیہ السھو والنسیان لان الانسان مطبوع علی السھو والغفلۃ فشرط العدد فی الشھادۃ لیذکر البعض البعض عند اعتراض السھو و الغفلۃ کما قال اللہ تعالیٰ فی اقامۃ امرأتین مقام رجل فی الشھادۃ ان تضل احداھما فتذکر احداھما الاخریٰ [1]

"کیونکہ جب ایک فرد ہو تو بھول چوک کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے کہ انسان کی فطرت میں سہو اور غفلت داخل ہے۔ شہادت میں عدد کی شرط اس لیے رکھی گئی ہے کہ اگر بھول ہو جائے یا غفلت پیش آجائے تو گواہ آپس میں یاد دہانی کرا سکیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے شہادت میں ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو رکھنے کی علت بیان کی ہے، اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا سکے۔"

اگر واقعتاً یہ حکمت ہے اور ایسی حکمت کہ اس کو نظر انداز کر کے صرف ایک شہادت کی بنا پر فیصلہ کے ہم مجاز نہیں ہیں تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ نسوانی مسائل کے فیصلہ کے لیے کم از کم دو عورتوں کی شہادت ضروری قرار دی جائے جیسا کہ امام مالکؒ کا مسلک ہے اور اس کی ذہنی صلاحیتوں کو ناقص تسلیم کرنے کے بعد تو چار عورتوں کی شہادت کے بغیر فیصلہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، جیسی کہ امام شافعیؒ کی رائے ہے۔ اپنے مسلک کی تائید میں حنفیہ نے جس روایت کا حوالہ دیا ہے اس سے بحث ہم آگے چل کر کریں گے۔

حنفیہ نے ایک اصول یہ بیان کیا ہے کہ حدود و قصاص میں عورت کی شہادت

---

[1] بدائع الصنائع، جلد ۶ صفحہ ۲۷۷۔

قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ اس کا حافظہ کمزور ہونے کی وجہ سے اس کی شہادت میں غلطی کا احتمال رہتا ہے، اور شریعت حدود و قصاص کے اثبات کے لیے انتہائی قطعی اور یقینی دلائل کا مطالبہ کرتی ہے باقی اور معاملات میں اتنی قطعیت کو وہ ضروری نہیں سمجھتی اس لیے دلائل میں کسی قدر شبہ کے باوجود ان کے متعلق فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

اس اصول کی رو سے حدود و قصاص کے علاوہ بقیہ مسائل کے فیصلے صرف خواتین کی شہادت پر صحیح ہونے چاہئیں لیکن حنفیہ مخصوص نسوانی مسائل کے علاوہ کسی بھی مسئلہ میں ان کی شہادت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک کہ ان کے ساتھ گواہی میں کوئی مرد شریک نہ ہو۔ اس اعتراض کا جواب انھوں نے یہ دیا ہے کہ:-

ان القیاس یقتضی قبول ذالك لكنه ترك ذالك

كی لا یكثر خروجهن۔[1]

"قیاس تو یہی چاہتا ہے کہ تنہا خواتین کی شہادت بھی قبول کی جائے لیکن اس پر عمل اس لیے نہیں کیا جاتا تاکہ گھروں سے باہر ان کی بہت زیادہ آمدورفت نہ ہونے لگے"

غور کیجئے! یہ کتنی کمزور دلیل ہے۔ ایک شخص چار پختہ سیرت اور قابلِ اعتماد خواتین کے سامنے کسی مفلوک الحال اور محتاج انسان کے لیے وصیت کرجاتا ہے۔ کیا شریعت کے تقاضے اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ یہ وصیت محض اس مصلحت کی بنا پر نافذ نہ ہو کہ ان خواتین کو گھر سے باہر نکلنا نہ پڑے یا اس بات کا کہ اس مصیبت زدہ شخص کو مصیبت سے نجات دلانے کے لیے ان کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی جائے؟

---

[1] العنایۃ المطبوع، علی حاشیہ فتح القدیر، جلد ۶ صفحہ ۔

اصل سوال حنفیہ کے اس دعویٰ کے بارے میں پیدا ہوتا ہے کہ ایک مرد کے قائم مقام عورتوں کو کرنے کے باوجود ان کے بیان میں غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ کیونکہ انسانی تجربات سے اس دعویٰ کی تائید نہیں ہوتی، فرض کیجئے خالص عورتوں کے کسی مجمع میں جھگڑا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں ایک عورت ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس ہلاکت کے اسباب پر انتہائی ثقہ اور عمل و فہم رکھنے والی آٹھ عورتیں ایک متفقہ بیان دیتی ہیں۔ کیا عقل اور تجربہ یہی کہتا ہے کہ ان کے اس بیان کا وزن اتنا بھی نہیں ہے جتنا کہ چار عام مردوں کی شہادت کا ہوتا ہے! اس سے بھی زیادہ حیرت یہ سوچ کر ہوتی ہے کہ کسی مالی معاہدہ پر ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت تو حنفیہ کے یہاں قابل اعتماد ہے لیکن چوری، زنا، قذف وغیرہ مقدمات میں ایک دو نہیں بیسیوں عورتوں کی گواہی بھی بھروسہ کے لائق نہیں ہے عورت کی ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں یہ انتہائی بدظنی ہے۔ تعجب کہ فقہ حنفی میں یہ کیسے جگہ پا گئی۔ اس فقہ کا امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ اس کی تعلیمات عقل کو اپیل کرنے والی ہوتی ہیں۔

علامہ ابن حزمؒ نے حقیقت سے کس قدر قریب تر بات کہی ہے:۔

وبضرورة العقل يدري كل احد انه لا فرق بين امرأة ورجل وبين رجلين وبين امرأتين وبين اربعة رجال وبين اربعة نسوة في جواز تعمد الكذب والتواطي عليه وكذلك الغفلة ولو حينا الى هذا لكان النفس اطيب على شهادة ثماني نسوة منها على شهادة اربعة رجال[1]

بدیہی بات ہے ہر شخص جانتا ہے کہ ایک عورت اور ایک مرد اور دو مرد اور دو عورتوں اور چار مرد اور چار عورتوں کے درمیان اس معاملہ میں کوئی

---

[1] المحلی جلد ۹ ص ۳۹۶۔

فرق نہیں ہے کہ وہ عمداً جھوٹ بولیں اور اس پر متفق ہو جائیں یہی حال غفلت کا ہے خواہ ایک وقت ہی سہی دو عورت اور مرد دونوں اس کا شکار ہو سکتے ہیں، اس لحاظ سے چار مردوں کی گواہی کے مقابلہ میں آٹھ عورتوں کی گواہی پر دل زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔

علامہ ابن قیم رح لکھتے ہیں:۔

انا لا نسلم ضعف شهادة المرأتين اذا اجتمعتا ولهذا تحكم بشهادتهما مع الرجل وان امكنه ان يأتى برجلين فالرجل والمرأة العدل كالرجل فى الصدق والامانة و الديانة الا انها لما خيف عليها السهو والنسيان قويت بمثلها وذلك قد يجعلها اقوى من الرجل الواحد او مثله ولا ريب ان الظن المستفاد من رجل واحد دونهما دون امثالهما[1]

"ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ دو عورتوں کی شہادت کمزور ہوتی ہے جب کہ وہ اس پر متفق ہوں یہی وجہ ہے کہ ہم مرد کے ساتھ ان دونوں کی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں اگرچہ دو مرد گواہوں کا پیش کرنا ممکن ہی کیوں نہ ہو۔ ایک مرد اور دو عورتیں اصل ہیں نہ کہ بدل۔ ایک قابل اعتماد عورت مرد ہی کے مانند ہے سچائی امانت اور دیانت میں مگر چونکہ اس پر سہو و نسیان کا اندیشہ کیا جاتا ہے اس لیے اس جیسی دوسری عورت سے اس کی تقویت کر دی گئی۔ دوسری عورت کی تائید اس کو ایک مرد سے زیادہ قوی بنا دیتی ہے یا کم از کم اس کے برابر کر دیتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک شخص کی گواہی سے جو گمان حاصل ہوتا ہے وہ ان دونوں یا ان جیسی دوسری عورتوں کی گواہی سے

---

[1] الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ صفحہ ۱۴۳۔

حاصل شدہ گمان سے کم ہوتا ہے۔"

حدود میں عورت کی شہادت کے قبول نہ کیے جانے پر حنفیہ نے بعض اور دلیلیں جو پیش کی ہیں وہ بھی کمزور ہیں مثلاً یہ کہ زنا کی شہادت کے سلسلہ میں قرآن نے مردوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم میں سے چار گواہ ہوں لیکن جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں اس خطاب میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ باقی یہ کہنا کہ عورتوں کو اس حکم میں شامل کرنے سے چار کے عدد میں اضافہ ہو جائے گا کیونکہ ایک مرد کی جگہ ایک عورت تو نہیں لی جا سکتی بلکہ دو عورتوں کو لینا پڑے گا ہمارے خیال میں یہ بات شریعت کے منشاء سے کچھ میل نہیں کھاتی کیونکہ اہمیت کسی خاص تعداد کی نہیں بلکہ اس تعداد کے ذریعہ حاصل ہونے والے یقین کی ہے اگر دو عورتوں کی شہادت سے ایک مرد کی شہادت کا یقین حاصل ہوتا ہے تو اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔

فقہاء احناف اور دوسرے تمام فقہاء جنہوں نے حدود و قصاص میں عورت کی شہادت پر اعتبار نہیں کیا ہے، ان کی سب سے بڑی دلیل امام زہری کی وہ روایت ہے جو علامہ جصاصؒ کی تقریر کے ذیل میں ہم نے نقل کی ہے، یعنی یہ کہ حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی سنت یہ ہے کہ حدود و قصاص میں عورت کی شہادت قبول نہ کی جائے۔

تو جصاصؒ نے اس روایت کی کوئی سند نہیں پیش کی ہے، البتہ ابن الہمام نے اس کو ابن ابی شیبہؒ کے حوالے سے سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ابن ابی شیبہؒ نے یہ روایت حفص بن غیاث سے لی ہے لیکن محدثین ان کو ثقہ اور قابلِ اعتبار قرار دینے کے باوجود مدلس سمجھتے ہیں[1] اگر ان کی اس کمزوری کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی یہ روایت حجت کے قابل نہیں معلوم ہوتی کیونکہ حفص کو یہ روایت حجاج بن

---

[1] تہذیب التہذیب، جلد ۲ صفحہ ۴۱۵ تا ۴۱۸۔

ارطاۃ کے واسطے سے ملی ہے اور اس نے اس کو امام زہری سے روایت کیا ہے۔ حجاج بن ارطاۃ پر بھی تدلیس کا متفقہ الزام ہے اسی لیے بیشتر محدثین کے نزدیک ان کی روایات قابلِ عمل نہیں ہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یحییٰ اسی سے انکار کرتے تھے کہ حجاج نے امام زہری کو دیکھا ہے اور ان کے متعلق اتنی خراب رائے رکھتے تھے کہ ہمیں مزید گفتگو کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

کہتے ہیں کہ حجاج بن ارطاۃ نے مجھ سے کہا کہ ذرا امام زہری رح کا حلیہ بیان کرو کیونکہ میں نے انہیں نہیں دیکھا ہے [۱]

اسی وجہ سے علامہ ابن حزم رح نے اس روایت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے [۲]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ہر معاملہ میں شہادتِ نسواں کو جائز سمجھتا ہے، ہاں اس کی رائے یہ ضرور ہے کہ جن امور کا تعلق براہِ راست مرد کی عملی زندگی سے ہے اور جو عورت کے دائرہ کار سے خارج ہیں ان کے متعلق اس کی شہادت میں مرد کی شہادت سے کہیں زیادہ سہو و نسیان کا امکان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی حقیقت تک رسائی میں آدمی کی فکر و فہم کو جتنا دخل ہوتا ہے اتنا ہی اس کی ذہنی ساخت اور عملی سرگرمیوں کو بھی ہوتا ہے۔ ایک واقعہ کسی کے دامنِ توجہ کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور وہ اس کی تہہ تک پہنچنے اور اس کے مالہ وماعلیہ سے واقف ہونے کی سعی کرتا ہے، لیکن دوسرے شخص کے لیے اس واقعہ میں کوئی کشش اور جاذبیت نہیں ہوتی اور وہ سرسری طور پر پاس سے گزر جاتا ہے۔ ایک کاروباری آدمی کا ذہن علمی مسائل میں اتنی مستعدی سے کام

---

[۱] حجاج بن ارطاۃ کے متعلق میزان الاعتدال، جلد ا صفحہ ۲۱۲، اور تہذیب التہذیب، جلد ۲ صفحہ ۱۹۶ تا ۱۹۸ ملاحظہ ہو۔

[۲] المحلیٰ، جلد ۹ صفحہ ۴۰۳۔

نہیں کرتا جتنا کہ ایک طالب علم کا کرتا ہے۔ بلکہ خود علم کے مختلف شعبوں یہ حال ہے کہ ایک شعبہ کے ماہر کو دوسرے شعبہ کی معلومات اخذ کرنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے یہی حال عورت کا ہے اس کا ذہنی سانچہ اور اس کے عمل کی دنیا دونوں مرد کے ذہنی سانچہ اور اس کی عملی دنیا سے بالکل مختلف ہیں اس لیے وہ اپنے حدودِ عمل سے باہر ہونے والے واقعات کا مشاہدہ اور ضبط اتنی عمدگی کے ساتھ نہیں کر سکتی جتنی عمدگی کے ساتھ مرد کر سکتا ہے لیکن اس کے باوجود شریعت نے ان واقعات میں بھی اس کی شہادت قبول کی ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ شریعت عورت کی ذہنی صلاحیتوں پر ان امور میں بھی اعتماد کرتی ہے جو اس کی افتادِ طبع اور عملی سرگرمیوں سے کلی طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں۔

رہے وہ معاملات جن میں وہ شب و روز لگتی رہتی ہے اور جو اس کے ذوق اور رجحان سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں ان میں شریعت نے اس کی گواہی کو مرد کی گواہی کی سی حیثیت دی ہے۔ بلکہ شعبیؒ تو کہتے ہیں :-

من الشہادات ما لا یجوز فیہ الا شہادۃ النساء[1]

"شہادت کی بعض ایسی قسمیں ہیں جن میں صرف عورتوں ہی کی شہادت جائز ہے"

کسی واقعہ کا ثبوت صرف ایک یا دو آدمیوں کی زبانی شہادت ہی پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ بہت سے داخلی اور خارجی علامات اصل حقیقت کی غمازی کرتے ہوتے ہیں لیکن یہ علامات زیادہ تر صریح اور قطعی نہیں ہوتے، بلکہ اشاراتی ہوتے ہیں، اس لیے شریعت نے فیصلہ کی بنیاد انسانوں کی قطعی اور دو ٹوک گواہی پر رکھی ہے البتہ بعض مخصوص معاملات کے سوا تمام معاملات میں ان علامات کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اگر یہ علامات کہیں واضح شکل میں موجود ہوں یا احتیاط اور تقویٰ کسی خاص

---

[1] الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ ص۱۳۳۔

طرح کے فیصلہ کا تقاضا کر رہے ہوں تو اس نے صرف ایک گواہ کو بھی کافی سمجھا ہے۔ عورت کے مخصوص مسائل میں بھی اس کا یہی طریقہ ہے۔

امام زہری فرماتے ہیں تین مختلف گھرانوں کے درمیان شادی بیاہ کے ذریعہ رشتہ قائم ہونے کے بعد ایک عورت حضرت عثمانؓ کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ یہ سب میری رضاعی اولاد ہے اور میں نے ان کو دودھ پلایا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اس کی اس شہادت کی بنا پر ان کے نکاح فسخ کرا دیے۔

امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ رضاعت کے سلسلہ میں حضرت عثمانؓ کے فیصلہ ہی پر لوگوں کا عمل ہے۔[1]

روایت حدیث میں عورت پر اعتماد

اسی طرح امت نے زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اس کی روایت کردہ احادیث پر کلی اعتماد کیا ہے۔ اور مردوں اور عورتوں کی روایات میں کسی قسم کا فرق کیے بغیر دونوں کو یکساں اہمیت دی ہے۔ اس اہمیت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدریؓ کی بہن فریعہؓ کے شوہر کے چند اونٹ فرار ہو گئے تھے وہ ان کی تلاش میں روانہ ہوئے اور پا بھی گئے لیکن اچانک اونٹوں نے پلٹ کر ان پر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں وہ ہلاک ہو گئے۔ فریعہؓ نے حضورؐ سے اس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ میرے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے لیکن انہوں نے نہ تو میرے لیے کوئی نان نفقہ چھوڑا ہے اور نہ اپنے بچوں کے لیے رہنے کی کوئی جگہ۔ اس لیے میں اپنے بھائیوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں آپؐ کا کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا عدت کے دن تمہیں اسی مکان میں گزارنے ہوں گے جس میں تمہیں اپنے شوہر کے انتقال کی خبر ملی ہے۔

حضرت عثمانؓ کے سامنے ان کے دورِ حکومت میں اسی قسم کا مسئلہ پیش ہوا۔

---

[1] الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ ص ۲۳۵۔

لوگوں نے ان کو بتایا کہ فریعہؓ کے ساتھ یہ معاملہ پیش آچکا ہے اور حضورؐ نے ان کو جو حکم دیا تھا وہ معلوم کر لیا جائے، فریعہؓ کہتی ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے مجھے بلایا میں پہنچی تو وہ بعض اور لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے متعلق حضورؐ کا فیصلہ ان کو سنایا تو انہوں نے میری نظیر پر عمل کیا اور جس عورت کو یہ مسئلہ درپیش تھا اسے بھی حکم دیا کہ جس مکان میں اس کے شوہر کا انتقال ہوا ہے اسی میں عدت گزارے[۱]

اس طرح حضرت عثمانؓ نے فریعہؓ کی روایت کو قانونی حیثیت دے دی۔

بعض بعض احادیث ہم تک ایسی سندوں سے پہنچی ہیں جن میں کئی کئی خواتین موجود ہیں مثلاً فتن سے متعلق ایک حدیث امام مسلم نے ابوبکر ابن ابی شیبہ، سعید بن عمرو، زہیر بن حرب اور ابن ابی عمر سے لی ہے ان چاروں نے سفیان بن عیینہ سے، سفیان بن عیینہ نے امام زہری سے، امام زہری نے عروہ سے، عروہ نے زینب بنت ابی سلمہ سے، انہوں نے حبیبہ سے، انہوں نے اپنی ماں ام حبیبہ سے اور انہوں نے زینب بنت جحش سے اس کی روایت کی ہے[۲]

اسی حدیث کو امام ترمذی نے سعید بن عبدالرحمٰن اور دوسرے کئی ایک افراد کے حوالے سے مذکورہ بالا سند ہی سے نقل کیا ہے[۳]

علم حدیث سے ابتدائی واقفیت رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ ابن ابی شیبہ سعید بن عبدالرحمٰن، سفیان بن عیینہ، امام زہری اور عروہ بن زبیر کس پایہ کے محدث

---

[۱] طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۳۶۷۔

[۲] مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعۃ، فصل من اشراط الساعۃ خروج یاجوج و ماجوج۔

[۳] ترمذی، ابواب الفتن، ما جاء فی خروج یاجوج و ماجوج۔ اس حدیث کے بعض دوسرے سلسلوں میں حبیبہؓ کا ذکر نہیں ہے البتہ بقیہ تینوں خواتین کا ذکر ہے۔ امام بخاری نے ابواب المناقب، باب علامات النبوۃ اور دوسرے مقامات پر اسی دوسرے سلسلہ کو نقل کیا ہے امام مسلم نے بھی اسی دوسرے سلسلہ کو قبول کیا ہے۔

ہیں۔ امام مسلم اور امام ترمذی کا نام ہی ان کی عظمت کا اپنا ثبوت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر دور کے اکابر محدثین نے اس روایت کو کس قدر اہمیت دی ہے۔

یہی نہیں بلکہ محدثین نے رواۃ حدیث کے متعلق تو اتین کی جرح وتنقید اور تعدیل وتصویب کو تسلیم کیا اور ان کی رائے کے مطابق کسی راوی حدیث کی روایات کو قبول یا رد کیے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ [1]

یہاں ممکن ہے ایک سوال ذہن میں پیدا ہو وہ یہ کہ جب عقائد و عبادات، عادات و معاملات، اخلاق و قانون غرض ہر شعبۂ زندگی سے متعلق اس کی روایات کو ویسی اہمیت دی گئی جیسی کہ مرد کی روایات کو دی گئی ہے تو کیوں زندگی کے تمام مسائل میں اس کی شہادت کو مرد کی شہادت کا درجہ نہیں دیا گیا، اس کی وجہ ہمارے خیال میں خالص نفسیاتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے ساتھ انتہائی عقیدت و احترام کا جذبہ شامل ہوتا ہے اس لیے ان میں غفلت اور بے توجہی کا امکان دوسرے عام واقعات کے مقابلہ میں کم سے کم تر ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسوہ کا مطالعہ ایک مومن جس نگاہ سے کرتا ہے اس نگاہ سے بازار میں ہونے والے واقعات کا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے شہادت اور روایت میں خود شریعت نے فرق کیا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو علامہ ابن جوزی کی کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۹۷-۹۸۔

عورت کی عملی صلاحیتیں

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شریعت کی نگاہ میں زندگی کے مسائل دو طرح کے ہیں، بعض مسائل ایسے ہیں جن میں عورت کی عقل وفہم پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے اور بعض مسائل وہ ہیں جن میں اس کی فہم کے لغزش کھانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ عمل کے میدان میں بھی شریعت نے یہی تقسیم برقرار رکھی ہے چنانچہ ایک طرف شریعت اس کو قیادت ورا ہنمائی کا اہل نہیں سمجھتی کیونکہ قیادت کے لیے جن اوصاف وخصوصیات کی ضرورت ہے وہ اس میں نہیں ہیں۔ دوسری طرف رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے :۔

والمرأة راعية على اهل بيت زوجها وولده وهي مسئولة عنه[1]

"عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کی اولاد کی نگراں ہے اور ان کے متعلق اس سے باز پرس ہوگی (کہ کہاں تک اس نے ان کے حقوق کا خیال رکھا)"

عورت کو کیوں گھر ہی کی حد تک ذمہ دار بنایا گیا اس کی وجہ حافظ ابن حجرؒ کے الفاظ میں یہ ہے :۔

---

[1] بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ اطیعوا اللہ الخ۔ ابوداؤد، کتاب الخراج والفیٔ والامارۃ باب مایلزم الامام من حق الرعیۃ۔

انما قید بالبیت لانہا لا تصل الی ما سواہ غالباً الا باذن خاص[1]

"آپ نے اس کی ذمہ داری کو گھر کے ساتھ مقید کیا ہے کیونکہ گھر کے علاوہ کسی اور مقام تک اس کی رسائی نہیں ہوتی الا یہ کہ کسی خصوصی اجازت سے فائدہ اٹھا کر وہ پہنچ جائے۔"

یعنی اس کا دائرۂ عمل گھر ہی ہے، اس لیے گھر سے باہر اس کے ذمہ دار بنائے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ گھر کے اندر اس کے راعی اور نگران ہونے کا مطلب کیا ہے؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو افراد اس کے زیر اثر ہیں اس کا فرض ہے کہ ان کے حقوق اور مفادات کی نگہداشت کرے، ان کو راہ راست پر چلائے اور غلط روی سے باز رکھے اور ان کے نفع و ضرر اور سود و زیاں کی اس طرح نگرانی کرے جس طرح ایک چرواہا جنگل میں بھیڑوں کی کرتا ہے۔ عورت کا فرض یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اس دولت اور ساز و سامان کی بھی محافظ اور امین بنائی گئی ہے جو شوہر نے اس کے تصرف میں دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صالح بیوی کی ایک صفت یہ بیان فرماتے ہیں:-

وان غاب عنہا نصحتہ فی نفسہا ومالہ[2]

"اگر شوہر اس کی نگاہوں سے غائب ہو جائے تو وہ اپنے نفس (عصمت) اور اس کے مال کے معاملہ میں اس کے ساتھ خیر خواہی کرتی ہے"

اس سے بھی آگے گھر کے تمام داخلی فرائض و واجبات اس کے ذمہ کیے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان

---

[1] فتح الباری، جلد ۵ صفحہ ۱۳۲۔

[2] ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب افضل النساء

امورِ خانہ داری کی تقسیم اس طرح فرمائی تھی کہ حضرت فاطمہؓ اندرونی خدمات اور حضرت علیؓ باہر کے کام انجام دیں گے۔ [1]

عورت کے یہ فرائض، فکر و عمل کی آزادی کا جس حد تک مطالبہ کرتے ہیں شریعت نے اس حد تک اس کو اپنی صواب دید کے مطابق کام کرنے کی آزادی بھی دی ہے۔ ایک مرتبہ ہند بنت عتبہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے شوہر ابو سفیانؓ کی شکایت کی کہ وہ پیسہ کے معاملہ میں ہاتھ روکے رہتے ہیں اور میرے اور میری اولاد کے تمام اخراجات پورے نہیں کرتے۔ اپنی ضروریات کی تکمیل کی سوائے اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ بس ان کے علم اور اطلاع کے بغیر ہی ان کا مال لے لیا کروں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ عرفِ عام کے مطابق تم اپنی اور اپنی اولاد کے حسبِ ضرورت ان کی دولت صرف کر سکتی ہو۔ [2]

ایک خاص حد کے اندر اس کو شوہر کے مال سے صدقہ و خیرات کا بھی حق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اذا انفقت المرأۃ من بیت زوجھا غیر مفسدۃ کان لھا اجرما انفقت ولزوجھا اجرما اکتسب [3]

"جب عورت اپنے شوہر کے گھر سے خرچ کرتی ہے، غلط طریقہ پر نہیں (بلکہ جائز حدود میں) تو اس کو اس خرچ کا اجر ملتا ہے اور شوہر کو اس کے کمانے کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔"

---

[1] زاد المعاد، جلد ۴ ص ۴۵۔

[2] بخاری، کتاب النفقات، باب اذا لم ینفق الرجل فللمرأۃ ان تاخذ بغیر علمہ ما یکفیہا وولدہا بالمعروف۔ مسلم، کتاب الاقضیہ، باب قضیہ ہند۔

[3] بخاری، کتاب الزکوۃ۔ مسلم، کتاب الزکوۃ۔ ابو داؤد، کتاب الزکوۃ باب المرأۃ تصدق من بیت زوجہا و اللفظ لہ۔

خانگی زندگی میں عورت کی صلاحیتوں پر شریعت کے اعتماد کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ اس کو اولاد کے سن شعور کو پہنچنے تک ان کی پرورش اور نگہداشت کے لیے مردوں سے زیادہ اہل اور موزوں سمجھتی ہے۔

ایک صحابی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اس بیوی سے ان کے ایک بچہ بھی تھا اور وہ اس بچہ کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے لیکن بچہ کی ماں نے حضور سے اس کے خلاف شکایت کی تو آپ نے فرمایا:-

انت احق بہ مالم تنکحی [1]

"تو اس کی زیادہ حقدار ہے جب تک کہ تو دوسرا نکاح نہ کرے"

اس حدیث کی شرح میں علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

فیہ دلیل علی ان الام اولی بالولد من الاب ما لم یحصل مانع من ذالک کالنکاح وھو مجمع علی ذالک [2]

"اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ ماں باپ سے زیادہ بچہ کی حقدار ہے جب تک کہ کوئی حقیقی رکاوٹ نہ پیدا ہو جائے مثلاً ماں کا دوسرا نکاح کر لینا، یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر سب کا اجماع ہے"

علامہ بدرالدین کاشانی فرماتے ہیں:-

الاصل فیھا النساء لانھن اشفق وارفق واھدای الی تربیۃ الصغار [3]

"حضانت کا اصل حق عورتوں کو حاصل ہے کیونکہ وہ مردوں کے مقابلہ میں زیادہ شفیق اور زیادہ مہربان ہوتی ہیں، اور کم سنوں کی تربیت کا سلیقہ اور

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب من احق بالولد، مستدرک، جلد ۲ صفحہ ۲۰۷۔

[2] نیل الاوطار، جلد ۷ صفحہ ۱۳۹۔

[3] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، جلد ۴ صفحہ ۴۱۔

خواتین کی جداگانہ تنظیم

جب عورت کو مرد پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بچوں کی تربیت اور پرورش وہ بہتر طریقہ پر انجام دے سکتی ہے تو زندگی کے جس دائرہ میں بھی اس کی خدمات سوسائٹی کے لیے مفید اور کار آمد ہوں ان میں اس کو آگے بڑھانا پڑے گا ہمارے خیال میں اس مقصد کے لیے اس کو انفرادی سعی کے ساتھ اجتماعی جدوجہد کی اجازت بھی دی جا سکتی ہے۔ اس پر شریعت کوئی قدغن نہیں لگاتی۔ یہاں یہ بحث چھیڑنا صحیح نہیں ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں آیا خواتین کی کوئی تنظیم تھی یا نہیں؟ کیونکہ کوئی تنظیم جن اسباب و حالات کے تحت وجود میں آتی ہے وہ اسباب و حالات ہی اس وقت ناپید تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین ہی کی تنظیم کیا معنی کسی بھی تنظیم کی کوئی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس کے باوجود اس تاریخی حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ مختلف دینی و ملی ضروریات کے تحت خواتین جمع ہوتی تھیں اور بعض اوقات اجتماعی طور پر اپنی فکری و عملی مشکلات حضورؐ کے سامنے رکھتیں اور آپؐ ان کو حل فرماتے۔

ایک مرتبہ ایک صاحبہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خواتین کی راہ میں پیش آنے والی ایک بڑی رکاوٹ کا ذکر کیا اور اس کو دور کرنے کی درخواست کی۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں "قال النساء" یعنی بہت سی عورتوں نے یہ گزارش کی۔ غالباً یہ گزارش تو سب ہی کی ہوگی، البتہ انہوں نے اس کو حضورؐ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کسی ایک کو اپنا نمائندہ بنایا ہوگا، درخواست پیش کرنے والی خاتون کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے فرماتی ہیں:-

ذھب الرجال بحدیثك فاجعل لنا من نفسك یوما ناتیك فیہ تعلمنا مما علمك اللہ فقال اجتمعن فی یوم کذا وکذا فاجتمعن فاتاھن رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم فعلمھن مما علمہ اللہ [۱]

"آپ کی گفتگو اور وعظ و نصیحت سے مرد مستفید ہوتے ہیں (اور
ہمیں اس کا موقع نہیں ملتا) لہٰذا آپ اپنے اوقات میں سے ہمارے لیے
کوئی دن مقرر کیجیے جس میں ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپ ہمیں وہ
باتیں بتائیں جن کی اللہ نے آپ کو تعلیم دی ہے آپؐ نے فرمایا اچھا تو فلاں
دن فلاں جگہ تم جمع ہو جاؤ، چنانچہ وہ جمع ہوئیں تو حضورؐ ان کے پاس گئے
اور اللہ نے جو دین آپ کو سکھایا ہے اس کی آپ نے ان کو تعلیم دی"

اسی طرح ایک اور مرتبہ مسلمان خواتین نے اپنی ایک ذہنی الجھن حل کرنے
کے لیے اسماء بنت یزیدؓ نامی بہت ہی سمجھ دار اور زیرک خاتون کو اپنا ترجمان
بنا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا وہ آپؐ کی خدمت میں پہنچ کر عرض کرتی ہیں:۔

انی رسول من ورائی من جماعۃ النساء المسلمین
کلھن یقلن بقولی وعلی مثل رائی ان اللہ تعالیٰ بعثک الی الرجال و
النساء فآمنا بک واتبعناک ونحن معشر النساء مقصورات
قواعد بیوت ومواضع شھوات الرجال وحاملات اولادھم
وان الرجال فضلوا بالجمعات وشھود الجنائز والجہاد واذا
خرجوا للجہاد حفظنا لھم وربینا اولادھم افنشارکھم
فی الاجر یارسول اللہ؟ فالتفت رسول اللہ صلی اللہ وسلم بوجھہ
الی اصحابہ فقال ھل سمعتم مقالۃ امرأۃ احسن سؤالاً
عن دینھا من ھذہ؟ فقالوا بلیٰ واللہ یارسول اللہ فقال رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصرفی یا اسماء واعلمی من وراءک
من نساء ان حسن تبعل احداکن لزوجھا وطلبھا لمرضاتہ
واتباعھا لموافقتہ یعدل کل ما ذکرت [۲]

---

[۱] بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب تعلیم النبی امتہ من الرجال والنساء مما علمہ اللہ الخ

[۲] اسد الغابۃ فی اسماء الاصحاب تذکرہ اسماء بنت یزید بن السکن ونقل الحافظ ابن حجر فی (مطبوعہ ...)

"میں قاصد ہوں مسلمان خواتین کی ایک جماعت کی طرف سے جو میرے پیچھے ہے، سب کی سب وہی کہتی ہیں جو میں کہتی ہوں اور وہی رائے رکھتی ہیں جو میری رائے ہے کہ اللہ نے آپ کو مردوں اور عورتوں دونوں کی طرف بھیجا ہے پس ہم سب آپؐ پر ایمان لائے اور آپؐ کی پیروی کی لیکن ہم طبقۂ خواتین کا یہ حال ہے کہ وہ پابند پردہ نشین، گھر میں بیٹھی رہنے والی، مردوں کی خواہشات کی مرکز اور ان کی اولاد کو اٹھانے والی ہیں اور مردوں کو جمعوں میں شرکت اور جنازوں اور جہاد میں حصّہ لینے کی بنا پر فضیلت دی گئی ہے جب وہ جہاد پر جاتے ہیں تو ہم ان کے مال و اسباب کی حفاظت اور ان کے بچوں کی پرورش کرتے ہیں تو کیا اے اللہ کے رسول! اجر و ثواب میں ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہوں گی! حضورؐ نے صحابہ کی طرف اپنا رُخ کیا اور پوچھا کیا تم نے کسی عورت کو اپنے دین کے متعلق اس عورت سے زیادہ بہتر انداز میں سوال کرتے سنا ہے؟ صحابہ نے جواب دیا قسم خدا کی ہم نے نہیں سنا، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسماء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اسماء جاؤ اپنے پیچھے جو عورتیں ہیں ان کو بتا دو کہ تمہارا اپنے شوہروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی رضا جوئی اور ان کے ساتھ موافقت کے لیے ان کی اتباع کرنا ان تمام خدمات کے برابر ہے جن کا تم نے ابھی ذکر کیا ہے۔"

اس طرح مختلف اوقات میں بعض اور عمومی الجھنوں کو نمائندہ خواتین صنفِ نسوانی کی طرف سے حضورؐ کے روبرو پیش کرتی رہی ہیں۔ مثلاً ابو داؤد کی روایت ہے:

لما بايع رسول الله صلى الله عليه وسلم النساء قامت امرأة [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۰ سے) المنذری عن البزار والطبرانی مختصراً الترغیب والترہیب جلد ۳ ص ۳۳۶

جلیلۃ کانہا من نساء مضر فقالت یا نبی اللہ انا کل علی آبائنا وابنائنا وازواجنا فما یحل لنا من اموالہم قال الرطب تاکلنہ وتھدینہ [1]

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے بیعت لی تو ایک بڑی عورت جو قبیلہ مضر کی معلوم ہو رہی تھی کھڑی ہوئی اس نے کہا اے اللہ کے نبی ہم (ویسے ہی) اپنے باپوں اور اولاد اور شوہروں پر بوجھ بنی ہوئی ہیں تو کیا ہمیں ان کی مال و دولت سے کچھ خرچ کرنے کا حق بھی ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ ہاں کھجور (کی قسم کی کھانے پینے کی چیزیں) جس کو تم کھا بھی سکتی ہو اور ہدیہ بھی دے سکتی ہو۔"

اس حدیث میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ سوال کرنے والی صاحبہ کو تمام خواتین نے اپنی ترجمانی پر مامور کیا تھا لیکن بہت سی خواتین کی موجودگی اور سوال کی نوعیت صاف ظاہر کرتی ہے کہ یہ ان کا ذاتی مسئلہ نہیں تھا۔

اس قسم کے تاریخی واقعات کے ساتھ جب ہم دین کی اصولی تعلیمات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواتین کی علیحدہ جماعت سازی کی بالکل خلاف نہیں ہیں بلکہ ان سے اس کی تائید ہوتی ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ خواتین نماز کے لیے مردوں سے الگ جماعت بنا سکتی ہیں۔ اس سے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ورقہ بنت عبداللہؓ کو اپنے گھر والوں کی امامت کا حکم دیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابیات کا بھی اس پر عمل رہا ہے۔ انہوں نے فرض اور نوافل دونوں طرح کی نمازیں باجماعت ادا کی ہیں اور خواتین ہی نے امامت کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔

عن ریطۃ الحنفیۃ قالت امتنا عائشۃ فقامت

---

[1] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب المرأۃ تصدق من بیت زوجہا۔

بینھن فی الصلوٰۃ المکتوبۃ [۱]

"ریطۃ الحنفیہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرض نماز میں ہماری امامت کی اور وسط میں کھڑی ہوئیں۔ (یعنی مردوں کی طرح امامت کے لیے صف سے آگے نہیں گئیں)"

عن تمیمۃ بنت سلمۃ عن عائشۃ ام المومنین انھا امت النساء فی الفریضۃ فی المغرب وقامت وسطھن وجھرت بالقراءۃ [۲]

"تمیمہ بنت سلمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں کہ انہوں نے مغرب کی فرض نماز کی امامت کی اور عورتوں کے بیچ میں کھڑی ہوئیں اور جہر کے ساتھ قراءت کی"

عن حجیرۃ بنت حصین قالت امتنا ام سلمۃ فی صلوٰۃ العصر فقامت بیننا [۳]

"حجیرہ بنت حصین کہتی ہیں کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عصر کی نماز میں ہماری امامت کی اور بیچ میں کھڑی ہوئیں"

عن عطاء عن عائشۃ انھا کانت تؤذن وتقیم وتؤم النساء وتقوم وسطھن [۴]

"عطاء حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اذان بھی دیتی تھیں

---

[۱] دارقطنی صفحہ ۱۵۵، باب صلوٰۃ النساء جماعۃ وموقف امامھن بیہقی جلد ۳ صفحہ ۱۳۱ المحلی لابن حزم جلد ۳ صفحہ ۱۲۶۔

[۲] المحلی لابن حزم جلد ۳ صفحہ ۱۲۶۔

[۳] دارقطنی ص ۱۵۵۔ المحلی جلد ۳ ص ۱۲۷۔

[۴] مستدرک جلد ۱ ص ۲۰۴۔

اور اقامت بھی کہتی تھیں اور عورتوں کی امامت بھی کرتی تھیں اور امامت کے لیے عورتوں کے وسط میں کھڑی ہوتی تھیں۔"

عن سعدة بنت قمامة انها كانت تؤم النساء و تقوم فى وسطهن [1]

"سعدہ بنت قمامہ سے روایت ہے کہ وہ عورتوں کی امامت کرتیں اور درمیان میں کھڑی ہوتیں۔"

عن عائشة انها كانت تؤم النساء فى رمضان تطوعا وتقوم فى وسط الصف [2]

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ وہ رمضان میں نفل نماز (تراویح) میں امامت کرتی تھیں اور صف کے وسط میں کھڑی ہوتی تھیں۔"

عن خيرة ان ام سلمة ام المؤمنين كانت تؤمهن فى الصف [3]

"خیرہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام سلمہؓ رمضان میں ان کی امامت کرتی تھیں اور صف میں ان کے ساتھ کھڑی ہوتی تھیں۔"

عن ابن عباسؓ قال تؤم المرأة النساء تقوم وسطهن [4]

وفى رواية ابن حزم تؤم المرأة النساء فى التطوع وتقوم وسطهن [5]

---

[1] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرۃ سعدۃ بنت قمامۃ۔

[2] کتاب الآثار للامام ابی یوسف ص۴۱ حدیث نمبر ۲۱۲

[3] المحلی، جلد ۳ ص۱۳۶۔

[4] السنن الکبریٰ، جلد ۳ ص۱۳۱

[5] المحلی، جلد ۳ ص۱۳۶۔

"ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عورت عورتوں کی امامت کرسکتی ہے اور وہ ان کے درمیان کھڑی ہو گی ۔ ابن حزم رح کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ عورت نفل نماز میں خواتین کی امامت کر سکتی ہے اور ان کے بیچ میں کھڑی ہو گی۔"

نماز حقیقت میں تنظیم امت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے، اسی لیے نماز کی امامت کو امامت صغریٰ کہا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی جانشینی کا سوال پیدا ہوا تو مہاجرین نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا اور اس منصب کے لیے آپ کے اہل ہونے کی دلیل یہ دی کہ حضور نے آپ کو نماز کی امامت کے لیے اپنی زندگی میں بڑھایا تھا۔ اس دلیل کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ شریعت، خواتین کو اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل کے حل کے لیے اپنی تنظیمیں قائم کرنے سے نہیں روکتی، اس طرح کی تنظیموں کو مختلف قسم کے معاشرتی امور انجام دینے کی آزادی دی جا سکتی ہے۔ وہ خواتین کی تعلیم و تربیت اور ان کی فلاح و بہبود کے دوسرے کام بھی کر سکتی ہیں، بلکہ خواتین کو اپنی عدالتیں قائم کرنے اور قضا و نفاذ قوانین کے حقوق دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

عورت اور منصب امامت

البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام عورت کو ملت کی قیادت اور رہنمائی کی اہل نہیں سمجھتا کیونکہ قیادت کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ اس میں نہیں اور یہ انتہائی غیر فطری بات ہو گی کہ جن دائروں میں عورت کی قوتیں کام نہیں کر سکتیں ان میں بھی اس پر اعتماد کر لیا جائے۔ اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا نکل سکتا ہے کہ اجتماعی طور پر قوم ہلاکت اور تباہی کے کھڈ میں جا گرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

هلكت الرجال حين اطاعت النساء[1]

---

[1] مستدرک حاکم، جلد ۴ صفحہ ۲۹۱

"مرد ہلاک ہوئے جب وہ عورت کی اطاعت کرنے لگے"

ایک دوسرا فرمان جو اس سے زیادہ پُرزور ہے :-

لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ[1]

"وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنی زمامِ اقتدار عورت کے حوالے کر دی ہو"

اس حدیث کی شرح میں امام شوکانی رح فرماتے ہیں :-

فیہ دلیل علی ان المرأۃ لیست من اھل الولایات ولا یحل لقوم تولیتہا لان تجنب الامر الموجب لعدم الفلاح واجب[2]

"اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ عورت سرپرستی اور حکومت کی اہل نہیں ہے اور کسی قوم کے لیے اس کو سرپرست مقرر کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ عدمِ فلاح اور خسران کو لازم کرنے والے فعل سے پرہیز کرنا ضروری ہے"

یہ کوئی مختلف فیہ مسئلہ بھی نہیں ہے کہ اس میں دو رائیں ہوں اور ہمارے لیے کسی رائے کے اختیار کرنے کی آزادی ہو بلکہ امت کے تمام قابلِ اعتبار فرقوں کا اس مسئلہ پر اجماع ہے۔

علامہ ابن حزم لکھتے ہیں :-

وجمیع فرق اھل القبلۃ لیس الاحد یجیز امامۃ امرأۃ[3]

"اہل قبلہ (مسلمانوں) کے تمام فرقوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبی الی کسری و قیصر، ترمذی (ابواب الفتن باب بغیر عنوان) نسائی، کتاب آداب القضاۃ۔

[2] نیل الاوطار، جلد ۸ صفحہ ۱۶۸

[3] الفصل فی الملل والاھواء والنحل، جلد ۴ صفحہ ۱۱۱

جو عورت کی امامت کو جائز سمجھتا ہو۔"

امت کا یہ اتفاق عورت سے کسی بیر یا حقارت و نفرت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس کی فطری کمزوریوں ہی کے باعث انہوں نے اس کو بارگراں کے قابل نہیں سمجھا ہے مثلاً علماء نے لکھا ہے کہ منصب امامت کا اہل وہی شخص ہو سکتا ہے جو دین کے اصول و فروع میں مجتہدانہ بصیرت رکھتا ہو تاکہ ہر طرح کی فکر رکھنے والوں کو مطمئن کر سکے، معاملات میں ژرف نگاہ اور صلح و جنگ کی تدابیر سے پوری طرح واقف ہو، ورنہ وہ دین و ملت کو پیش آنے والے مسائل حل نہیں کر سکے گا۔ انتہائی جری اور عزم و حوصلہ کا مالک ہو تاکہ کوئی قوت اس کو اپنے فرض کی ادائیگی میں مانع نہ بن جائے۔ ظاہر ہے قدرت یہ صفات مردوں ہی کے اندر پیدا کرتی ہے اور وہ بھی ہر ایک میں نہیں صرف محدودے چند افراد میں۔ عورت کیوں منصب امامت کی اہل نہیں ہے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ سعد الدین تفتازانی شرح مقاصد میں لکھتے ہیں :۔

والنساء ناقصات عقل و دین ممنوعات عن

الخروج الی مشاهد الحکم و معارك الحروب۔ [1]

"اس لیے کہ عورتوں کی عقل اور دین (ان کی جسمانی قوت) ناقص ہے اور ان کو فیصلہ کے مقامات (عدالتوں) اور جنگ کے محاذوں پر جانے کی اجازت نہیں ہے"

بعض لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہوا ہے کہ عورت گو کہ ان صفات سے عاری ہوتی ہے لیکن اس کو خلیفہ بنائے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ وہ دوسرے قابل افراد کے تعاون سے امور سلطنت انجام دے سکتی ہے لیکن یہ خواہ مخواہ کی توجیہ ہے کیونکہ کوئی شخص کسی ذمہ داری کا اہل اس وقت ہوتا ہے جبکہ

---

[1] ان مباحث کے لیے ملاحظہ ہو شرح مقاصد، جلد ۲، صفحہ ۲۰۳ شرح مواقف، جلد ۸، صفحہ ۳۴۹

خود اس کے اندر اس ذمہ داری کے اٹھانے کی اہلیت ہو، یہ کوئی خاندانی جاگیر نہیں ہے کہ بغیر کسی استحقاق کے از خود حاصل ہو جائے۔ اسی لیے علماء نے اس رائے کو درخور اعتناء نہیں سمجھا ہے:۔

علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں:۔

واما تقریرها فی نحو وظیفة الامام فلا شك فی عدم صحة لعدم اهلیتها خلافا لما زعمه بعض الجهلة انها تصح وتستنیب لان صحة التقریر یعتمد وجود الاهلیة و جواز الاستنابة فرع صحة التقریر[1]

"لیکن اس کو امام کے منصب جیسے منصب پر متعین کرنا بلاشبہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ وہ اس کی اہل نہیں ہے، بعض نادانوں کے اس خیال کے برعکس کہ اس کو امام مقرر کرنا درست ہے اور وہ اپنا نائب مقرر کرے گی کیونکہ کسی منصب پر تعین صحیح اس وقت ہوتا ہے جبکہ اہلیت پائی جائے اور نائب مقرر کرنا تو کسی منصب پر تعین کے صحیح ہونے کے بعد کی چیز ہے"

کتابوں سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کس حیثیت اور مرتبہ کے افراد اس فکر کے حامل رہے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے صرف علامہ طبریؒ کے متعلق اس قدر لکھا ہے کہ وہ عورت کی امارت اور قضا کو جائز سمجھتے ہیں[2]

عورت کن اجتماعی ذمہ داریوں کی اہل ہے

عورت اگر امت کی رہنمائی نہیں کر سکتی تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ کسی اجتماعی کام کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔ عورت کے فطری دائرہ سے باہر بہت سی ایسی سماجی و معاشرتی ذمہ داریاں ہیں جن کے بارے میں فقہاء

---

[1] رد المختار، جلد ۴ صفحہ ۲۹۶۔

[2] فتح الباری، جلد ۸ صفحہ ۹۶۔

نے صراحت کی ہے کہ وہ اس کو سونپی جا سکتی ہیں۔ علامہ ابن الہمام حنفی رح لکھتے ہیں:-

ولیس فی الشرع سوی نقصان عقلها و معلوم انه لم یصل الی حد سلب ولایتها بالکلیة الا تری انها تصلح شاهدة و ناظرة فی الاوقاف و وصیة علی الیتامی[1]

"شریعت نے عورت کے متعلق صرف یہ کہا ہے کہ اس کی عقل ناقص ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے اندر عقل کی کمی اس حد تک نہیں پہنچ گئی ہے کہ وہ کسی منصب کی اہل ہی نہ رہ گئی ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہ اوقاف کی نگراں اور متولی ہو سکتی ہے اور اس کو یتیموں کی دیکھ بھال کی وصیت کی جا سکتی ہے۔"

فقہ کی اس تصریح سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ عورت سماجی خدمات کی اہل ہے یہ تصریح کوئی قانونی کلیہ نہیں ہے۔ اس پر قیاس کر کے دوسری بہت سی معاشرتی ذمہ داریوں کا بار اس پر ڈالا جا سکتا ہے لیکن ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ فقہاء نے جو کچھ کہا ہے اس کی صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر کہا ہے۔ لہٰذا اس کو کوئی ذمہ داری سونپنے سے پہلے ہر حال میں یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ اس ذمہ داری کی متحمل ہو بھی سکتی ہے یا نہیں؟ اس کے مزاج اور رجحان طبع کی رعایت بھی ضروری ہے ورنہ اس کی صلاحیتوں کے ضائع جانے کا اندیشہ ہے بلکہ ہو سکتا ہے اس کی غیر فطری سرگرمیاں معاشرہ کے لیے نقصان دہ اور ضرر رساں ثابت ہوں، ویسے بھی یہ انتہائی غیر دانشمندانہ فعل ہوگا کہ کسی شخص کو ایسے کسی کام کے کرنے کی دعوت دی جائے جس کے کرنے کی نہ تو اس میں طاقت ہو اور نہ وہ اس کے ذوق اور رجحان سے مناسبت رکھتا

---

[1] فتح القدیر، جلد ۵ ص ۴۸۶

جو بات ایک فرد کے لیے غلط ہو وہ ایک طبقہ اور ایک صنفِ انسانی کے لیے کیسے صحیح ہو سکتی ہے!

بعض اصولوں کی پابندی

عورت سماج اور معاشرہ کی جو بھی خدمت انجام دے اس کو چند بنیادی اصولوں کی پابندی کرنی پڑے گی ان اصولوں کو پس پشت ڈال کر وہ کسی بھی جدوجہد میں حصہ نہیں لے سکتی کیونکہ شریعت کی نگاہ میں اس کی شخصیت کی سلامتی و ارتقا اور معاشرہ کی فوز و فلاح دونوں ان اصولوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔

(۱) حقیقی پوزیشن پر نظر

ان میں پہلا اصول یہ ہے کہ اس کو ہر حال میں اپنی حقیقی پوزیشن پر نظر رکھنی پڑے گی۔ وہ اصلاً خانگی زندگی کی معمار اور اس کے خوب و زشت کی ذمہ دار ہے۔ اس لیے نہ تو ریاست اس امر کی مجاز ہے کہ اس سے کوئی ایسا کام لے جس سے اس کی اصل حیثیت مجروح ہوتی ہو اور نہ خود اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ گھر کی دنیا چھوڑ کر زندگی کے دوسرے گوشوں کی آرائش و زیبائش میں لگ جائے۔ اگر وہ اپنے فرائضِ منصبی کی وجہ سے تمدن و سیاست کی گتھیاں سلجھا نہ سکے تو اسلام کی نگاہ میں یہ کوئی معیوب بات نہیں لیکن اپنی حقیقی ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھ کر زندگی کے دوسرے دائروں میں اس کا جولانیاں دکھانا معصیت ہے۔ اگر اس کے دست و بازو کی توانائی مشینوں اور اسلحہ جات کی تیاری میں صرف نہیں ہوتی، اس کے قدم ملک و ملت کی راہ میں غبار آلود نہیں ہوتے تو یہ اس کی ناکامی کی دلیل نہ ہوگی جب کہ وہ اپنی قوت کے خزانوں کو ایسے دست و بازو اور ایسے دل و دماغ کی تیاری میں صرف کرے جن میں قوموں کی قسمت کے فیصلہ کا عزم و حوصلہ ہو اور جو صحیح معنی میں ملت کے معمار اور اس کے خیر خواہ و خیر اندیش ہوں۔

---

(۲) خاوند کی اطاعت

اسلامی معاشرت اپنا ایک تفصیلی نقشہ رکھتی ہے۔ اس نقشہ میں مرد کو قوام تسلیم کیا گیا ہے یعنی وہ عورت پر امر و اقتدار کا حق رکھتا ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ۔

"مرد، عورتوں پر قوام ہیں"

لہٰذا ازدواجی زندگی کی فلاح و بہبود کے لیے وہ اپنی بیوی کو جن حدود و قوانین کا پابند کرنا چاہے کر سکتا ہے، اور جب تک اس کے یہ قوانین احکام شریعت اور اللہ کی مرضی سے متصادم نہ ہوں عورت کے لیے ان کی اتباع ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے بعد صالح بیوی دنیا کی سب سے بڑی بھلائی اور نعمت ہے، صالح بیوی کی ایک صفت آپؐ نے یہ بیان کی:۔

ان امرھا اطاعته [۱]

"اگر وہ حکم دے تو اس کی اطاعت کرے"

ایک مرتبہ آپ سے سوال کیا گیا کہ نیک عورت کی کیا صفات ہوتی ہیں؟ آپ نے جواب دیا:۔

التی تسرّہ اذا نظر وتطیعه اذا امر ولا تخالفه فی نفسها ومالها بما یکرہ [۲]

"وہ جو شوہر کو خوش کر دے جب وہ اس کو دیکھے، اور اس کی بات مانے جب وہ حکم دے اور اپنے نفس اور مال میں کسی ایسی حرکت سے

---

[۱] ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب افضل النساء

[۲] نسائی، کتاب النکاح، باب ای النساء خیر، مستدرک حاکم، جلد ۲ صفحہ ۱۶۱، واللفظ للاول۔

اس کی مخالفت نہ کرے جسے وہ پسند نہ کرتا ہو۔"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں :۔

اثنان لا تجوز صلاتہما رؤسہما عبد آبق من

موالیہ حتی یرجع وامرأۃ عصت زوجہا حتی ترجع[1]

"دو طرح کے افراد کی نمازان کے سروں سے اوپر نہیں جاتی (یعنی

بارگاہِ الٰہی تک اس کی رسائی نہیں ہوتی) وہ غلام جو اپنے آقا سے فرار

ہو گیا ہو جب تک کہ وہ لوٹ نہ آئے اور وہ عورت جو اپنے شوہر

کی نافرمانی کرے تا آنکہ وہ اس سے رجوع نہ کرلے۔"

میاں اور بیوی کی قانونی پوزیشن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ

سے روشنی پڑتی ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے۔

استوصوا بالنساء خیراً فانھن عوان عندکم[2]

"عورتوں کے ساتھ انتہائی خیر و خوبی کی روش اختیار کرو کیونکہ وہ

تمہارے پاس اسیر ہیں۔"

گویا عورت مرد کے کنٹرول میں اور اس کے حکم کی تابع ہوتی ہے۔ اس کی

اس حیثیت کو آپ نے دوسرے مواقع پر اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا

ہے :۔

لا یحل لامرأۃ تؤمن باللہ والیوم الاٰخر ان تأذن

فی بیت زوجہا وھو کارہ ولا تطیع فیہ احداً ولا تخشن

بصدرہ ولا تضربہ[3]

---

[1] الترغیب والترہیب، جلد ۳ صفحہ ۳۳ بحوالہ طبرانی وحاکم۔

[2] ترمذی، ابواب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأۃ علی زوجہا۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح باب حق المرأۃ علی الزوج۔

[3] مستدرک حاکم، جلد ۲ صفحہ ۱۹۰۔

"جو عورت اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں کسی ایسے شخص کو آنے کی اجازت دے جسے وہ ناپسند کرتا ہو اور وہ گھر سے نکلے ایسی صورت میں جب کہ اس کا نکلنا شوہر کو ناگوار ہو اور (اسے چاہیے) کہ شوہر کے معاملہ میں کسی کی اطاعت نہ کرے اور اس کے آنے پر خشونت نہ اختیار کرے اور نہ اس کو مار پیٹ کرے۔"

عورت کا مسجد میں نماز پڑھنا فی نفسہ جائز ہے لیکن وہ اسی صورت میں مسجد جا سکتی ہے جب اس کو اس کا شوہر اجازت دے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سفارش نقل کرتے ہیں:-

اذا استأذنت امرأة احدکم الی المسجد فلا یمنعها [1]

"تم میں سے کسی کی بیوی اگر مسجد جانے کی اجازت چاہے تو (اجازت دے دی جائے اور بلا وجہ) اس کو نہ روکے۔"

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ نے ایک مقام پر امام نووی کا یہ قول نقل کیا ہے:-

استدل به علی ان المرأة لا تخرج من بیت زوجها الا باذنه لتوجه الامر الی الازواج بالاذن [2]

"اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ عورت اپنے خاوند کے گھر سے اس کی اجازت ہی سے نکل سکتی ہے کیونکہ اجازت دینے کا اختیار خاوندوں کو دیا گیا ہے۔"

---

[1] مسلم، کتاب الصلوٰۃ باب خروج النساء فی المساجد۔

[2] فتح الباری، جلد ۲ صفحہ ۲۳۶۔

اس سے معلوم ہوا کہ صرف مسجد جانے کی حد تک ہی وہ شوہر کے اذن کی پابند نہیں بلکہ کسی بھی صورت میں اس کی مرضی کے بغیر وہ گھر نہیں چھوڑ سکتی، اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بخاری نے مذکورہ بالا حدیث پر ان الفاظ میں باب باندھا ہے:۔

استیذان المرأۃ زوجہا فی الخروج الی المسجد وغیرہ[1]

"مسجد وغیرہ کی طرف جانے کے لیے عورت کا اپنے شوہر سے اجازت لینا ضروری ہے۔"

عورت کے سفر حج کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

عن عبد اللہ ابن عمرؓ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی امرأۃ لہا زوج ولہا مال ولا یأذن لہا فی الحج لیس لہا ان تنطلق الا باذن زوجہا[2]

---

[1] بخاری، کتاب النکاح۔

[2] دار قطنی ص۲۸۵، المعجم الصغیر طبرانی مطبوعہ ہند ص۱۲، اس حدیث کے ایک راوی عباس بن محمد کو محدث ابن قطان نے مجہول الحال کہا ہے یعنی یہ نہیں معلوم کہ وہ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ۔ لیکن اس حدیث کو امام بیہقیؒ نے "السنن الکبریٰ" جلد ۵ ص۲۲۳ میں ایک دوسرے سلسلۂ سند سے نقل کیا ہے جس میں عباس بن محمد کی جگہ احمد بن محمد الازرقی ہیں جس سے طبرانی اور دار قطنی کی روایت کی تائید ہوتی ہے۔ ابن ترکمانی نے "الجوہر النقی" میں اس حدیث کے دو راویوں پر جرح نقل کی ہے لیکن اس جرح میں محدثین متفق الرای نہیں ہیں۔ ان دو راویوں میں سے ایک حسان بن ابراہیم ہیں جن کے متعلق امام نسائیؒ نے لکھا ہے کہ وہ روایت حدیث میں قوی نہیں تھے۔ اس کے برعکس امام احمدؒ جیسے ماہر فن نے ان کی توثیق کی ہے۔ ملاحظہ ہو میزان الاعتدال جلد اص۲۲۲ اور تہذیب التہذیب جلد ۲ ص۲۴۴ تا ۲۴۷) دوسرے راوی ابراہیم الصائغ ہیں جن کو ابن جوزی نے ضعفاء میں شمار کیا ہے۔ لیکن یہ ابن جوزیؒ کے فطری تشدد کا زیادتی ہے

"عبداللہ بن عمرؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی عورت کے متعلق یہ حکم روایت کرتے ہیں جس کا شوہر ہو اور اس کے پاس (اتنا) مال بھی ہو کہ اس سے حج فرض ہو جائے لیکن اس کا شوہر اس کو حج کرنے کی اجازت نہ دے تو وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر حج کو نہیں جا سکتی"

ان نصوص کی وجہ سے تقریباً یہ طے شدہ مسئلہ سمجھا جاتا ہے کہ عورت گھر سے باہر جانے کے لیے اپنے شوہر کے اذن کی پابند ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں :-

ان منع الرجال نساءھم امر مقرر[1]

"مردوں کو اپنی بیویوں کو گھر سے باہر جانے سے منع کرنے کا اختیار ایک ثابت شدہ بات ہے"

اس مسلمہ اصول کی خلاف ورزی پر فقہ حنفی شوہر کو بیوی کی تعزیر کا بھی حق دیتی ہے لیکن بعض ایسی مستثنیٰ صورتیں بھی ہیں جن میں عورت خاوند کی اجازت کی پابند نہیں ہے، فقہاء حنفیہ نے اس طرح کی حسب ذیل صورتوں کی نشان دہی کی ہے :-

قالوا لیس للمرأۃ ان تخرج بغیر اذن الزوج الا باسباب معدودۃ منہا اذا کانت فی منزل یخاف السقوط علیہا ومنہا الخروج الی مجلس العلم اذا وقعت لہا نازلۃ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۴ سے) منظر ہے۔ اکابر محدثین نے ان کی روایات کو قابل قبول سمجھا ہے تہذیب التہذیب جلد ۸ صفحہ ۶۱ بہر حال یہ روایت صحیح ہے امام شافعیؒ کا مسلک یہی ہے کہ عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر حج کو نہیں جا سکتی حنفیہ فرض حج کے لیے تو اجازت ضروری نہیں سمجھتے البتہ ان کے نزدیک بھی شوہر اپنی بیوی کو نفل حج کے لیے جانے سے باز رکھ سکتا ہے، ملاحظہ ہو فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۱۹۱۰

[1] فتح الباری، جلد ۲ صفحہ ۲۳۶۔

[2] فتاویٰ قاضی خان المطبوع علی حاشیہ فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۱ صفحہ ۴۴۲۔

ولم يكن الزوج فقيها ومنها الخروج الى الحج الفرض اذا وجدت محرما ولا يجوز للزوج ان يأذن لها بالخروج ولا يجب لعلمها بالاذن ومنها الخروج الى زيارة الوالدين وتعزيتهما وزيارة المحارم۔[1]

"فقہاء نے کہا ہے کہ چند گنے چنے اسباب کے سوا کسی بھی عورت کو اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کا حق نہیں ہے۔ ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایسے مکان میں ہو جس کے گر پڑنے کا اندیشہ ہو۔ ان ہی میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ اسے کوئی مسئلہ پیش آ جائے اور شوہر فقیہ نہ ہو تو وہ بلا اجازت علمی مجالس کی طرف رخ کر سکتی ہے۔ اسی طرح بلا اجازت گھر چھوڑنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کو فرض حج کے لیے جانا پڑے اور کوئی محرم بھی موجود ہو۔ ایسی صورت میں شوہر اس کو اجازت دے سکتا ہے اس سے وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ اسی طرح والدین کی ملاقات، ان کی تعزیت، عیادت اور محرم رشتہ داروں سے ملنے جانے کے لیے بھی وہ شوہر کی اجازت کی پابند نہیں ہے۔"

فقہ کی اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ ایک مسلمان خاتون حقوق زوجیت اور خدا اور بندوں کے ان بے شمار حقوق کے درمیان ہمیشہ فرق کرے گی جو اس پر ایک دینی فرد کی حیثیت سے عائد ہوتے ہیں، جہاں ان مختلف حقوق کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہو، وہاں وہ اہم تر حقوق کو کم اہم حقوق پر مقدم رکھے گی لیکن یہ ایک انفرادی معاملہ ہے۔ اطاعت کا سوال بھی اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ دو متضاد احکام کی تعمیل کا بلا واسطہ اس سے مطالبہ کیا جائے۔ اس پہلو سے ہمیں انفرادی اور اجتماعی دائرہ عمل میں فرق کرنا پڑے گا کیونکہ اجتماعی

---

[1] فتاوی قاضی خان جلد ...

کا براہِ راست سماج اور معاشرہ مخاطب ہوتا ہے جب کہ فرد پر یہ ذمہ داریاں بالواسطہ عائد ہوتی ہیں، ہاں اگر کسی وقت کوئی سماجی فریضہ اس کے لیے فرضِ عین کی حیثیت اختیار کر جائے تو وہ اس کے انجام دینے کے لیے شوہر کی مرضی کے خلاف گھر کے حدود چھوڑ سکتی ہے لیکن عام حالات میں وہ اس کے حکم کی پابند رہے گی اور شوہر کی اجازت کے بغیر کوئی اجتماعی فریضہ ادا کرنے کے لیے گھر سے باہر نہیں نکل سکتی۔ انفرادی اور اجتماعی فرائض کے اس بنیادی فرق کو نظر انداز کر کے بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اجتماعی ذمہ داریوں کے لیے عورت کو شوہر کی نافرمانی کا حق ہے، حالانکہ یہ شرعی نقطۂ نظر سے کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ علامہ ابن نجیم حنفیؒ اس خیال پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وينبغي ان للزوج ان يمنع القابلة والغاسلة من الخروج لان في الخروج اضرارا له وهي محبوسة لحقه وحقه مقدم على فرض الكفاية بخلاف الحج الفرض لان حقه لا يقدم على فرض العين له

"شوہر کو اس بات کا حق ہے کہ اگر اس کی بیوی دایہ یا غاسلہ (میت کو نہلانے والی) ہے تو ان کاموں کے لیے باہر جانے سے روکے کیونکہ بیوی کے گھر سے باہر جانے میں اس کا نقصان ہے اور وہ شوہر کے حقوق کی ادائیگی کی پابند ہے اس لیے شوہر کا حق فرضِ کفایہ پر مقدم ہے۔ البتہ فرض حج کا معاملہ دوسرا ہے اس کے لیے وہ اس کی مرضی کے خلاف نکل جا سکتی ہے کیونکہ شوہر کا حق فرضِ عین پر مقدم نہیں کیا جا سکتا۔"

اس بحث کا تعلق گھر سے باہر عورت کی سرگرمیوں سے تھا، گھر کے اندر بھی شوہر اس کی مصروفیات پر پابندی لگا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

له ان يمنعها من الاعمال كلها المقتضية للكسب لانها مستغنية عنه بوجوب كفايتها عليه

۱؎ البحر الرائق، جلد ۴، صفحہ ۱۹۵۔

وکذا من العمل تبرعا له

"شوہر کو حق ہے کہ بیوی کو ایسے کاموں سے روکے جو کسب معاش کے لیے کیے جاتے ہیں کیونکہ شوہر پر اس کا نان و نفقہ فرض ہونے کی وجہ سے اس کو کمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح بطور نفل و ثواب کے وہ کسی کا کوئی کام کرنا چاہے تو وہ اس پر بھی پابندی لگا سکتا ہے۔"

گویا شوہر کو یہ حق اس بنیاد پر ملا ہے کہ وہ اس کے اخراجات کا کفیل ہے لیکن اگر وہ اس پوزیشن میں نہ ہو تو عورت کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے جد و جہد اور کسب کا حق ملنا چاہیے۔ علاوہ ازیں بقول علامہ ابن عابدینؒ "عورت کے بہت سے ایسے اخراجات ہو سکتے ہیں جن کا بار اٹھانا مرد کے لیے ضروری نہیں ہے ان کے پورا کرنے کے لیے وہ اندرون خانہ کوئی پیشہ اپنا سکتی ہے۔" ابن عابدینؒ نے مزید لکھا ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو اس لیے بھی محنت و مشقت سے باز رکھ سکتا ہے کہ اس سے اس کی صحت کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔ اور شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی بیوی کو حسین و جمیل اور تندرست و توانا باقی رکھنے کی کوشش کرے۔ لیکن اس حق کی بنا پر شوہر بیوی کی زیادہ سے زیادہ ایسی مصروفیات پر قدغن لگا سکتا ہے جو اس کے لیے مضر صحت ہوں اس وجہ سے علامہ ابن عابدینؒ فرماتے کہ قاعدہ اس طرح وضع کیا جا سکتا ہے :۔

لہ منعہا من کل عمل یؤدی الی تنقیص حقہ او ضررہ او الی خروجہا من بیتہ اما الذی لا ضرر لہ فیہ فلا وجہ لمنعہا لہ

"شوہر اپنی بیوی کو ہر اس کام سے منع کر سکتا ہے جس سے اس کے

لہ البحر الرائق، جلد ۴ صلاے۔

لہ الدر المختار، جلد ۲ صلا۲ ۱۵۰۔

حق میں کمی آتی ہو یا اس کو نقصان پہنچتا ہو، یا کوئی ایسا کام ہو جس کے بجا
لانے کے لیے اسے گھر سے باہر نکلنا پڑے، باقی سب ایسے کام جن میں
اس کا کوئی نقصان نہیں ہے تو ان سے منع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

اس اصول کے تحت ممکن ہے یہاں ایک سوال پیدا ہو، وہ یہ کہ عورت اپنے خاوند کے حقوق کی رعایت کرتے ہوئے گھر سے باہر مختلف سرگرمیوں میں کیوں نہیں حصہ لے سکتی؟ اگر وہ حقوق زوجیت میں کوئی کوتاہی نہیں کرتی تو جس طرح اس کو گھر کے اندر سعی و عمل کی آزادی ہے اسی طرح گھر سے باہر بھی ہونی چاہیے لیکن ہمارے خیال میں یہ سوال صحیح نہیں ہے کیونکہ شریعت ان دونوں حالتوں میں فرق کرتی ہے۔ وہ گھر کی چہار دیواری کو اس کے دین و اخلاق کی پناہ گاہ سمجھتی ہے اور بیرون خانہ اس کے متاع اخلاق کے لٹ جانے کا خدشہ محسوس کرتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشیطن۔[1]

"عورت پوشیدہ رکھی جانے والی مخلوق ہے جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی طرف جھانکتا ہے"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

النساء عورة فاستروها بالبیوت۔[2]

"عورت پوشیدہ رکھی جانے والی مخلوق ہے لہٰذا تم اس کو گھروں میں چھپاؤ"

یہاں ایک نفسیاتی حقیقت بھی ہے جس کی طرف علامہ ابن الہمام رحمہ نے

---

[1] ترمذی، ابواب الرضاع، باب (بغیر عنوان)۔

[2] عیون الاخبار، جلد ۴ ص ۷۸۔

اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ اسلام ازدواجی رشتہ کو مستحکم دیکھنا چاہتا ہے لیکن یہ رشتہ اتنا نازک ہے کہ ذرا سے دھکے سے ٹوٹ سکتا ہے۔ کوئی شریف اور باغیرت خاوند گھر سے باہر بیوی کی بکثرت آمد و رفت کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے بہت سے فتنوں کے راستے کھلتے ہیں۔

فان فی کثرۃ الخروج فتح باب الفتنۃ خصوصاً اذا کانت شابۃ والزوج من ذوی الھیئات۔[1]

"کیونکہ گھر سے باہر بہت زیادہ آمد و رفت رکھنا فتنہ کے دروازے کو کھولنا ہے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ وہ جوان ہو اور شوہر با اخلاق اور شریف ہو"

(۳) اختلاط سے اجتناب

یہ توضیحات ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہیں کہ مسلمان خاتون اپنے شوہر کی اجازت اور رضامندی کے ساتھ گھر سے باہر بھی مختلف تعلیمی و دینی اور سماجی خدمات انجام دے سکتی ہے۔ لیکن وہ کسی حال میں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتی کہ شریعت نے اس کے اور اجنبی مردوں کے درمیان اخلاق اور قانون کی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ اس کے فرائض حیات کو خانگی میں محصور کرنے کا ایک اہم مقصد یہی ہے کہ نامحرموں سے اختلاط اور میل جول اخلاقی بگاڑ کا ذریعہ نہ بننے پائے۔ اگر کوئی عورت خدا کی قائم کردہ دیوار کو توڑ کر کسی میدان میں آگے بڑھتی ہے تو اسلام کی نگاہ میں اس کا ہر قدم معصیت اور تباہی کی راہ طے کرتا ہے خواہ اس کی نیت کتنی ہی صاف اور اس کے ارادے کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں کیوں کہ اس طرح وہ اس مقصد کو پامال کرتی ہے جس کی پامالی شریعت دیکھنا نہیں چاہتی۔

---

[1] فتح القدیر، جلد ۳ صفحہ ۳۳۵

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خدا ترس کون ہوگا؟ کس کی اخلاقی بلندی آپ کی رفعت کردار کا مقابلہ کر سکتی ہے اور ان خواتین کے پاک جذبات آج کی کونسی عورت کو حاصل ہیں جو آپ سے اسلامی احکام کے اتباع کا عہد کرنے حاضر ہوتی تھیں، وفاداری کا عہد مرد تو آپ کے ہاتھ میں ہاتھ ملا کر کرتے تھے لیکن ذات اقدس کا دست مبارک کبھی کسی نامحرم خاتون کے ہاتھ سے مس نہیں ہوا۔ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں:

كان النبي صلى الله عليه وسلم يبايع النساء بالكلام بهذه الآية لا تشركن بالله شيئا وما مست يد رسول الله صلى الله عليه وسلم يد امرأة إلا امرأة يملكها

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے اسی آیت کے ذریعہ "لا تشرکن باللہ شیئاً" زبانی بیعت لیتے تھے آپ کا دست مبارک سوائے ایسی عورت کے جو آپ کے قبضہ میں ہوتی (بیوی) کسی عورت کے ہاتھ سے مس نہیں ہوا"

اس سے زیادہ واضح یہ الفاظ ہیں:

لا والله ما مست يد رسول الله يد امرأة قط غير أنه يبايعهن بالكلام وكان يقول لهن إذا أخذ عليهن قد بايعتكن كلاما

"نہیں بقسم خدا کبھی حضور کا ہاتھ کسی کے ہاتھ سے مس نہیں ہوا آپ ان سے صرف زبانی بیعت لیتے تھے جب آپ ان سے قول و قرار لے چکتے تو فرماتے (اچھا اب جاؤ) میں نے تم سے گفتگو ہی کے ذریعہ بیعت لی ہے"

---

۱ بخاری کتاب الاحکام باب بیعۃ النساء۔

۲ مسلم کتاب الامارۃ باب کیفیۃ بیعۃ النساء۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ خود خواتین نے آپؐ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر احکام شریعت کی اطاعت کا عہد کرنا چاہا تو آپؐ نے صاف کہہ دیا۔

انی لا اصافح النساء انما قولی لمأۃ کقولی لامرأۃ واحدۃ[1]

"میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا میرا سو عورتوں سے خطاب کر کے کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی ایک عورت سے خطاب کروں (اس لیے ہر ایک سے علیحدہ عہد لینے کی بھی ضرورت نہیں)"

اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم و تربیت ہو یا ثقافت و تہذیب یا دفاع و سیاست ہر میدان میں دونوں صنفوں کا عدم اختلاط ناگزیر ہے۔ اسلام میں نہ تو کسی مشترک کلچرل پروگرام کی کوئی گنجائش ہے نہ مخلوط تعلیم کی۔ ایک مسلمان خاتون اجنبی مردوں کے ساتھ نہ فوجی تربیت اور ملی جلی مشقوں میں شریک ہو سکتی ہے اور نہ کھیل کود اور سیر و تفریح میں۔ بازار اور منڈی سے لے کر ایوانِ اسمبلی تک کسی بھی مقام پر دونوں کی آمیزش اور باہمی اتصال قطعاً ناروا اور عظیم جرم ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبوں میں عورتیں شریک ہوتی تھیں لیکن وہ مردوں کے پہلو بہ پہلو نہیں بیٹھتی تھیں بلکہ ہمیشہ ان کی نشست گاہ مردوں سے بالکل الگ ہوتی تھی۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ ایک عید کی نماز کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

فصلی ثم خطب ثم اتی النساء ومعہ بلالؓ فوعظھن[2]

---

[1] مسند احمد، جلد ۶ ص ۳۵۷، نسائی، کتاب البیعۃ، باب بیعۃ النساء دار قطنی ص ۴۲۸ و روی بمعناہ الترمذی والحاکم۔

[2] بخاری، کتاب العیدین، باب العلم الذی بالمصلی۔

"پہلے آپ نے نماز پڑھی پھر خطبہ دیا اس کے بعد آپ عورتوں کے پاس تشریف لائے آپ کے ساتھ بلال رضی اللہ عنہ بھی تھے آپ نے ان کو نصیحت فرمائی۔"

حافظ ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں :-

قولہ ثم اتی النساء یشعر بأن النساء کن علی حدة من الرجال غیر مختلطات بھم۔[1]

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ اس کے بعد آپ عورتوں کے پاس تشریف لائے بتاتا ہے کہ وہ مردوں سے علیحدہ تھیں، ان کے ساتھ ملی جلی نہیں تھیں۔"

ایک دوسری روایت ہے :-

صلی قبل الخطبة ثم خطب فرأی انه لم یسمع النساء فاتاھن فذکرھن۔[2]

"آپ نے خطبہ سے پہلے نماز پڑھی پھر خطبہ دیا اس کے بعد آپ نے محسوس کیا کہ آپ اپنی بات عورتوں کو نہیں سنا سکے ہیں چنانچہ آپ ان کے پاس آئے اور ان کو نصیحت کی۔"

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ خواتین مردوں سے اس قدر دور تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شبہ ہونے لگا کہ آپ کی آواز ان تک پہنچ بھی رہی ہے یا نہیں؟

تعلیم ہی نہیں، زندگی کے تمام شعبوں میں شریعت مرد و زن کے اختلاط کو

---

[1] فتح الباری، جلد ۲ صفحہ ۳۵۸، ۳۸۷۔

[2] بخاری، کتاب العلم۔ باب عظة الامام النساء و تعلیمھن، مسلم، کتاب صلوٰة العیدین، واللفظ لمسلم۔

روکنا چاہتی ہے۔ ذیل کے ایک واقعہ سے شریعت کے منشا اور رُخ کو سمجھا جاسکتا ہے۔

دو شخص رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مقدمہ لے کر حاضر ہوئے۔ ان میں سے ایک نے آپ سے عرض کیا کہ میرا لڑکا اس کی بیوی سے زنا کا مرتکب ہو گیا ہے، آپ اللہ کے حکم کے مطابق اس کا فیصلہ فرما دیجیئے آپ نے فرمایا تمہارے لڑکے کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ایک سال کے لیے جلاوطن کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انیس نامی ایک صحابی کو عورت کے متعلق حکم دیا۔

اغد علی امرأة هٰذا فاسئلها فان اعترفت فارجمها

فاعترفت فرجمها[1]

"جاؤ اس (دوسرے) شخص کی بیوی کے پاس اور اس سے دریافت کرو کہ اگر وہ اپنے جرم کا اعتراف کرے تو اس کو رجم کر دو چنانچہ انیس نے اعتراف کیا اور انہوں نے اس کو سنگسار بھی کیا"

غور کیجیئے! موت حیات کا فیصلہ کرنے والے مقدمہ کی سماعت کے لیے بھی آپ نے پسند نہیں کیا کہ عورت کو عدالت میں طلب کیا جائے بلکہ اپنے نمائندہ کو تحقیق اور قانون کے نفاذ کا حق دے کر عورت ہی کے پاس روانہ کیا۔ اس کا مقصد سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے جو امام نسائی رہ نے اس حدیث پر ان الفاظ میں باندھ کر ظاہر کیا ہے:۔

صون النساء عن مجلس الحکم[2]

---

[1] بخاری، کتاب المحاربین من اہل الکفر والردۃ، باب ہل یامر الامام رجلا فیضرب الحد غائبا عنہ۔ مسلم، کتاب الحدود، باب حد الزنا۔

[2] نسائی، کتاب آداب القضاۃ۔

"عدالت گواہوں سے عورتوں کو بچایا۔"

علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی رحمہ لکھتے ہیں:۔

ولا تکلف المخدرة للدعوی اذا کانت مخدرة و لا لیمین بل یحضر الیہا القاضی او یبعث الیہا نائبہ یحلفہا بحضرة شاهدین له[1]

"دعوی کے اثبات اور قسم کے لیے اس کو عدالت میں پیشی پر مجبور نہیں کیا جائے گا جب کہ وہ پردہ نشین ہو بلکہ قاضی خود اس کے پاس جائے گا یا اپنے کسی نائب کو بھیجے گا جو دو گواہوں کے سامنے اس سے قسم لے گا۔"

ابن قاسم رحمہ نے امام مالک رحمہ سے دریافت کیا کہ اگر عورتوں سے قسم لینے کی ضرورت پیش آئے تو قسم کہاں لی جائے گی؟ امام مالک رحمہ نے جواب دیا:۔

أما کل شیء له بال فانہن یخرجن فیه الی المساجد فان کانت امرأة تخرج بالنہار اخرجت نہارا فاحلفت فی المسجد وان کانت ممن لا تخرج اخرجت لیلا فاحلفت فیه قال وان کان الحق انما هو شیء یسیر لا بال له احلفت فی بیتہا اذا کانت ممن لا تخرج وارسل القاضی الیہا من یحلفہا لطالب الحق[2]

"معاملہ اگر اہم ہے تو قسم لینے کے لیے وہ مسجدوں میں لائی جا سکتی ہیں۔ اگر ایسی عورت ہو جو دن میں نکلتی ہو تو دن میں اس کو نکالا جائے گا اور مسجد میں اس سے قسم لی جائے گی اگر وہ دن میں نہ نکلتی ہو تو رات میں

---

[1] الاشباہ والنظائر مطبوعہ ہند ص ۲۴۶۔

[2] المدونۃ الکبری، جلد ۴ ص ۱۰۳ ،

اس کو مسجد لے جایا جائے گا اور اس سے قسم لی جائے گی۔ امام مالکؒ نے کہا اگر کوئی معمولی حق ہو اور وہ گھر سے باہر نکلنے کی عادی نہ ہو، تو گھر ہی میں قسم کھلائی جائے گی اور قاضی اس کے پاس کسی ایسے آدمی کو بھیجے گا جو حق چاہنے والے کے لیے اس سے قسم لے گا۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خواتین کو فنونِ جنگ کی باقاعدہ تعلیم تو نہیں دی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص ماحول اور جفاکشانہ زندگی کی بنا پر ہمیشہ جنگی خدمات کی اہل رہی ہیں۔ آج بھی وقت ضرورت اسلامی ریاست ان کو فوجی تربیت دے کر ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتی ہے لیکن ضروری ہے کہ تربیت کا یہ نظام بھی نامحرموں کے اختلاط سے پاک ہو۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک غزوہ میں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ میں دبلی پتلی اور چھریری تھی۔ آپؐ نے صحابہ کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ جب وہ آگے بڑھ گئے تو آپؐ نے مجھ سے کہا عائشہؓ! آؤ ہم اور تم دوڑ لگائیں، دیکھوں تمہیں پیچھے چھوڑ دیتا ہوں۔ جب مقابلہ ہوا تو میں آگے نکل گئی۔ یہ دیکھ کر آپؐ خاموش ہو گئے۔ پھر ایک عرصہ کے بعد جب کہ میں اس واقعہ کو بھول چکی تھی اور اس وقت میں کسی قدر فربہ ہو گئی تھی آپؐ کے ساتھ سفر پر گئی۔ آپؐ نے اس مرتبہ بھی صحابہ سے کہا کہ تم لوگ ذرا آگے بڑھ جاؤ۔ جب وہ آگے چلے گئے تو آپؐ نے مجھے دوڑ میں مقابلہ کے لیے بلایا۔ اب کی بار جو مقابلہ ہوا تو آپؐ سبقت لے گئے۔ آپؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا یہ اس کا جواب ہے[1]

---

[1] الدر الثمین فی مناقب امہات المومنین، تالیف محب الدین الطبری المتوفی ۶۹۴ھ۔
حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ میں دو مرتبہ حضورؐ کے مقابلہ کا ذکر امام احمدؒ (باقی صفحہ ۲۳۷ پر)

کیا غزوات میں خواتین کی شرکت صنفی اختلاط کی دلیل ہے؟

غزوات میں مسلمان خواتین کی شرکت کی بنا پر یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ باہمی اختلاط کے بغیر دونوں صنفوں نے محاذِ جنگ پر کیسے کام کیا! اگر مل جل کر جہاد میں حصہ لیا تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ شریعت کی نگاہ میں صنفی اختلاط کوئی جرم نہیں ہے لیکن یہ سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ ہم کسی استثنائی شکل کو اصول کی حیثیت دے دیں حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اصول عمومی ضابطہ اور قانون کا نام ہے اور استثناء کسی عارضی رکاوٹ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے عمل ہر دور اور ہر حال میں اصول ہی پر ہوگا الا یہ کہ کسی حقیقی مانع کی وجہ سے وقتی طور پر شریعت ہم کو اس کا پابند نہ قرار دے لیکن جیسے ہی یہ مانع دور ہو جائے ہم اصول کی پیروی پر مجبور ہوں گے۔

جنگ ایک حقیقی بلکہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس میں کسی ایک فرد کو نہیں پورے ملک کو اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس وقت حالات اتنے نازک ہوتے ہیں کہ بہت سے اصول اور قوانین پر ان کی اصل شکل میں عمل درآمد ممکن نہیں رہتا۔ اس ہنگامی حالت پر عام حالات کو قیاس کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی آتش زدہ شہر میں یہ دیکھ کر کہ مزدور اور مالک، صحافی اور سیاست دان، تاجر اور صنعت کار سب کے سب آگ فرو کرنے میں لگے ہوئے ہیں، یہ فیصلہ کر دے کہ اس شہر میں کوئی نظامِ عمل نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۳۶ سے) اور ابو داؤد رحمہ نے بھی کیا ہے۔ مسند احمد جلد ۲ ص ۳۹ میں مسابقت سے پہلے صرف ایک مرتبہ صحابہ کو آگے روانہ کرنے کا ذکر ملتا ہے لیکن محب الدین طبری کی نقل کردہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مرتبہ آپ نے صحابہ رض کی عدم موجودگی کو ضروری سمجھا۔

یہ سوال بھی بالکل اسی نوعیت کا ہے، پھر جب ہم ان حالات کو سامنے رکھتے ہیں جن میں مسلمان خواتین کو نامحرموں کے ساتھ عرصۂ پیکار کی طرف رُخ کرنا پڑا تو یہ سوال اور بھی مہمل نظر آتا ہے۔

یوں تو فی نفسہٖ جنگ کسی نہ کسی حد تک حالات کا توازن بگاڑ دیتی ہے لیکن کبھی کبھی وہ اس قدر خطرناک اور بھیانک شکل اختیار کر لیتی ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے اور ملک کے سامنے اپنی حفاظت سے زیادہ اہم اور کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو اپنے غزوات میں ایسے ہی بھیانک حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایک طرف ان کو ابھی پوری طرح سیاسی استحکام بھی نہیں حاصل ہوا تھا کہ مخالفین سے جنگ کا غیر منقطع سلسلہ شروع ہو گیا، دوسری طرف وہ اپنی عددی قوت اور ساز و سامان کے لحاظ سے بھی بہت پیچھے تھے، ان کے مقابلہ میں دشمن پوری طرح مسلح اور تعداد میں کئی چند ہوتے ہوئے بھی میدانِ جنگ میں عورتوں کی کھیپ کی کھیپ اپنے ہمراہ لاتا تھا جو لڑنے والوں کے اندر قومی حمیت اور جوش و جذبہ ابھارتیں اور مرنے مٹنے پر اکساتیں۔ عورتوں کو ساتھ رکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا کہ وہ طبی خدمات انجام دیں کیونکہ طب اس وقت ایک مخصوص شعبہ نہیں بلکہ ایک تجربہ اور عمل ہی کی حیثیت رکھتی تھی اس لیے قدرتی طور پر عورتوں کو مردوں سے زیادہ اس سے واقفیت بھی ہوتی۔

ان حالات میں مسلمانوں کا اپنی خواتین سے جنگی تعاون نہ حاصل کرنا سیاسی مصالح کے بالکل منافی تھا اس لیے انہوں نے ضروری سمجھا کہ جنگ میں خواتین اپنے ساتھ رکھیں تاکہ جو بھی خدمت وہ انجام دے سکتی ہیں اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ساتھ ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوشش کی کہ غزوات میں ان کی شرکت ناگزیر حد سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ چنانچہ ہم کتاب کے شروع میں

کرچکے ہیں کہ ان کو جہاد میں حصہ لینے کی کبھی ترغیب نہیں دی جاتی تھی بلکہ اگر کبھی ان کی جانب سے اس کی خواہش کا اظہار ہوتا بھی تو ہمت افزائی نہ کی جاتی یہی وجہ ہے کہ بڑی سے بڑی جنگ میں بھی خواتین معدودے چند سے زیادہ نظر نہیں آتیں۔

اس کے باوجود جو خواتین شریک ہونا چاہتیں ان پر یہ پابندی تھی کہ وہ آپ کی اجازت کے بغیر شریک نہ ہوں۔ اس پابندی کا مقصد یہ تھا کہ پہلے ہی سے معلوم ہو جائے کہ کس مزاج اور طبیعت کی عورتیں ساتھ چل رہی ہیں؟ ان کی حفاظت کے کیا انتظامات ہیں؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ میدانِ جنگ میں آیا ان کی ضرورت ہے یا نہیں؟ ان تمام پہلوؤں سے اطمینان حاصل کیے بغیر آپ خواتین کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ایک مرتبہ بعض خواتین جہاد کے شوق میں بلا اجازت فوج کے ہمراہ ہو گئیں تو آپ ﷺ نے ان کو سخت تنبیہ فرمائی۔ حشرج بن زیاد اشجعی نادی سے روایت کرتے ہیں:

انّھا خرجت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوۃ خیبر سادس ست نسوۃ فبلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبعث الینا فجئنا فرأینا فیہ الغضب فقال مع من خرجتن وباذن من خرجتن لہ

"کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خیبر کی جنگ کے لیے روانہ ہوگئیں ان کے ساتھ پانچ دوسری عورتیں بھی تھیں (ان کا بیان ہے کہ) اس کی خبر جب آپ کو ہوئی تو آپ نے ایک شخص کو بھیج کر ہمیں طلب

لہ مسند احمد جلد ۵ ص ۲۷۱، ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی المرأۃ والعبد یحذیان من الغنیمۃ واللفظ للآخر۔

کیا ہم حاضر ہوئے تو دیکھا آپؐ کے چہرہ پر غصہ کے آثار ہیں آپؐ نے
(ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے) فرمایا کس کے ساتھ گھر سے نکلیں اور کس کی
اجازت سے نکلیں؟"

خواتین ایک تو جنگ میں شرکت کی آپؐ سے اجازت حاصل کرتی تھیں
اور دوسرے اُن کی یہ شرکت اپنے قبیلہ کے ساتھ یا انتہائی قابلِ اعتماد افراد کے
ساتھ ہوتی تھی۔ حشرج بن زیاد کی دادی اور ان کی ساتھیوں پر خفگی کی وجہ یہی تھی کہ انہوں
نے ان دونوں باتوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔

امّ سنان اسلمیہؓ اپنا واقعہ بیان کرتی ہیں:-

لما اراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخروج الی خیبر جئتہ
فقلت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخرج معک فی وجھک
ھذا اخرز السقاء واداوی المریض والجریح ان کانت جراح
ولا تکون وابصر الرحل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اخرجی علی برکۃ اللہ فان لک صواحب قد کلمنی واذنت
لھن من قومک ومن غیرھم فان شئت فمع قومک
وان شئت فمعنا قلت معک قال فکونی مع ام سلمۃ زوجتی
قالت فکنت معھا[1]

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی طرف چلنے کا ارادہ کیا
تو میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا حضورؐ آپ کی اس مہم میں میں
بھی ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔ وہاں پانی کی ضرورت پڑے تو مشک سی دوں گی،
اگر کوئی مریض اور زخمی ہو تو اس کا علاج کروں گی۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو اور
کجاوے (اور دیگر سامان) کی نگرانی کروں گی۔ حضورؐ نے فرمایا اللہ برکت دے،

---

[1] طبقات ابن سعد، جلد ۸ صفحہ ۲۱۴۔

تم چل سکتی ہو تمہارے قبیلہ اور بعض دوسرے قبائل کی عورتیں تمہاری طرح مجھ سے گفتگو کر چکی ہیں اور میں نے ان کو بھی اجازت دے دی ہے اس سفر میں یہ سب تمہاری ساتھی ہوں گی۔ اگر تم چاہو تو اپنی قوم کے ساتھ چلو اور اگر چاہو تو ہمارے ساتھ بھی چل سکتی ہو۔ میں نے کہا کہ میں آپ ہی کے ساتھ چلوں گی، آپ نے فرمایا اچھا تو میری بیوی ام سلمہؓ کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ ام سنان کہتی ہیں کہ میں ام سلمہؓ کے ساتھ ہو گئی۔"

واقعات بتاتے ہیں کہ عموماً خواتین کے حقیقی سرپرست اور باپ، بھائی اور اولاد جیسے قریب ترین محرم ہی ان کو اپنے ہمراہ محاذِ جنگ پر لے جاتے تھے۔ حضرت عائشہ رضؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ بیان فرماتی ہیں:-

کان رسول اللّٰہ اذا اراد سفراً اقرع بین ازواجہ وایتھن خرج سھمھا خرج بھا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم معہ۔[1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ کرتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے اور قرعہ کے نتیجہ میں جس کے حصہ میں شرکت نکلتی آپ اس کو اپنے ساتھ لے جاتے۔"

میدانِ جنگ میں خواتین کی خدمات کا دائرہ بھی ان کے خویش و اقارب اور عزیزوں کی حد تک محدود رہتا تھا اگر کبھی نا محرموں کے تعاون اور ہمدردی کی ضرورت پڑتی بھی تو ناگزیر حد سے آگے نہ بڑھتی تھیں اور حتی الوسع خلا ملا سے احتراز کرتی تھیں۔ امام نوویؒ عورتوں کی جنگی خدمات کی نوعیت کے متعلق فرماتے ہیں:

وھٰذا المداواۃ لمحارمھن و ازواجھن وما کان منھا لغیرھم

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافک۔

لا یکون فیہ مس بشرۃ الا فی موضع الحاجۃ[۱]

"عورتوں کا یہ علاج معالجہ ان کے محرموں اور شوہروں کی حد تک رہتا تھا اور جہاں علاج ان کے علاوہ دوسروں کا ہوتا تو اس میں بدن سے مس نہیں ہوتا تھا الا یہ کہ کوئی ضرورت پیش آجائے۔"

بہرحال ہر دور میں اسلامی ریاست کو اس طرح کے ہنگامی اور نازک حالات پیش آسکتے ہیں۔ مسلمان عورت مذکورہ حدود و شرائط کی پابندی کرتے ہوئے اپنے دین و ملک کے بچاؤ کی بالواسطہ یا بلاواسطہ کوشش کرسکتی ہے۔

تاریخ سے ایک غلط استدلال اور اس کا جائزہ

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ کے ایک خاص واقعہ پر کسی قدر تفصیلی گفتگو کی جائے کیونکہ ایک تو اس واقعہ کا گزشتہ مباحث سے بہت ہی گہرا اور قریبی تعلق ہے دوسرے یہ کہ اس واقعہ کی بنیاد پر ہمارے دور کے بعض محققین اس کوشش میں مصروف ہیں کہ عورت کے بارے میں اسلام اور مغرب کے نظریات کو ہم آہنگ کر دکھائیں حالانکہ ان دونوں میں اتحاد اور مطابقت کے رشتے تلاش کرنا دو انتہائی متضاد خیالات کے درمیان وجہ اشتراک ڈھونڈنے کے ہم معنی ہے کیونکہ مغرب عورت کے لیے جس نوعیت کی سیاسی و تمدنی آزادی کا دعویدار ہے وہ اس آزادی سے قطعاً مختلف ہے جو اسلام نے اس کو دی ہے، اسلام عورت کو جس سمت لے جانا چاہتا ہے مغربی افکار بالکل اس کی مخالف سمت کی طرف اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اسلام گھر کو اس کی سعی و جہد کا مرکز قرار دیتا ہے تو یہ اس کو گھر سے بغاوت کی تعلیم دیتے ہیں۔ اسلام نے عورت کے لیے جو نظام عمل تجویز کیا ہے وہ مغرب کی نگاہ میں اس کی توہین اور ذلت

---

[۱] شرح مسلم، جلد ۲ صفحہ ۱۱۶۔

کا پارٹ ہے۔ غرض عورت کے متعلق اسلام اور مغربی فکر میں صریح تضاد پایا جاتا ہے۔ اتنے کھلے ہوئے تضاد سے جس واقعہ کی بنیاد پر انکار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب نظام حکومت میں ابتری پیدا ہو گئی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین سے قصاص لینا دشوار ہو گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور قاتلین پر احکام شریعت نافذ کرانے کی پوری کوشش کی اور اس راہ میں اس حد تک آگے نکل گئیں جس حد تک مردوں کی صف کا کوئی راہنما جا سکتا ہے یہاں تک کہ اپنے مقصد کے حصول میں حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کو مزاحم پایا تو ان سے بھی اعلان جنگ کر دیا۔

اس واقعہ سے ان حضرات نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسلام جس حد تک مرد کو سیاسی جدوجہد کا حق دیتا ہے اسی حد تک سیاست میں عورت کے عمل دخل کو بھی جائز سمجھتا ہے اس لیے اس کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں کو محدود کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر شریعت کے نزدیک صنفی اختلاف کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مرد اور عورت دونوں کو یکساں آزادی حاصل ہے کہ ہر نوعیت کے مسائل حیات سے دلچسپی لیں اور ان کو سلجھانے کی کوشش کریں۔

اس واقعہ کی حقیقت سے تو بعد میں بحث کی جائے گی یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اس واقعہ کو جس شکل میں پیش کیا گیا ہے اگر اسی شکل میں اس کو قبول کر لیا جائے تو بھی اس کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رائے میں عورت کو بھی سیاسی جدوجہد کا حق حاصل تھا۔ وہ سیاست کو مرد کے لیے مخصوص نہیں سمجھتی تھیں لیکن اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا بالکل غلط ہو گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے دور میں عورت کا یہی سیاسی رول رہا ہے یا اسلام کا یہی قانون ہے۔ کیونکہ

کسی انفرادی عمل سے کوئی اجتماعی کردار نہیں ثابت کیا جاسکتا۔ دعویٰ جس حیثیت اور جس نوعیت کا ہو اس کے اثبات کے لیے اسی حیثیت اور مرتبہ کے دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ عورت کا سیاسی و سماجی کردار ایسا کوئی حادثہ نہیں ہو رات کے سناٹے یا سلطنت کے کسی گوشے میں پیش آ گیا ہو جسے ہم دو ایک تاریخی واقعات سے ثابت کر دیں بلکہ یہ ایک عمومی نوعیت کا مسئلہ ہے اس کو متعین کرنے کے لیے ہمیں اسلام کے اصول و قوانین کا مطالعہ کرنا ہوگا اس کے مزاج و فطرت کو دیکھنا پڑے گا۔ اسلام کے اصولِ تہذیب اور آئینِ معاشرہ سے بحث کرنی ہوگی اور پھر اس کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ اسلامی معاشرے میں عورت کی شب و روز کی سرگرمیاں کیا تھیں اور وہ کس نہج کی زندگی گزارتی تھی۔ اس کے بغیر سماج میں عورت کی حیثیت متعین نہیں کی جاسکتی۔

جہاں تک اسلام کی تعلیمات اور اس کے مزاج کا تعلق ہے قطعیت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عورت کو گھر کے اندر دیکھنا چاہتے ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کی تعمیر کردہ سوسائٹی نے بھی گھر ہی کو اس کی سعی و جہد کا مرکز قرار دیا گھر سے باہر اس نے ہمیشہ مرد کے نقشِ قدم کی پیروی کی۔ قیادت و راہنمائی کا منصب نہ تو کبھی اس کو حاصل ہوا اور نہ کبھی اس نے اس کا دعویٰ کیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفاءِ راشدین کے دَور میں امت کو بہت سے اجتماعی و سیاسی مسائل پیش آتے رہے لیکن ان کے حل کے لیے امت نے کسی خاتون پر کبھی اعتماد نہیں کیا۔ اس طویل عرصے میں کئی ایک جنگیں ہوئیں لیکن کوئی عورت فوج کی کمانڈر نہیں بن سکی۔ مختلف علاقوں میں مختلف گورنروں کا تقرر ہوا لیکن کسی بزرگ سے بزرگ ترصحابیہ کو بھی اس منصب کا اہل نہیں سمجھا گیا، مالیات اور تعزیر و قضاء کے محکمے قائم ہوئے لیکن یہ ذمہ داریاں کسی بھی عورت کو نہیں سونپی گئیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت مسلسل خلافت کا مسئلہ حل کرتی رہی لیکن کبھی کسی عورت کے خلیفہ چنے جانے

سوال تک نہیں پیدا ہوا۔

اگر حضرت عائشہؓ کے کسی عمل سے اسلامی سوسائٹی کے اس مجموعی طرز عمل کے خلاف کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے تو یقیناً امریکہ میں فاقہ کشی کے دو ایک واقعات کی بنا پر یہ دعویٰ بھی صحیح ہوگا کہ وہاں احتیاج اور فقر و فاقہ کی حکمرانی ہے اور لوگ آئے دن بھوکے مر رہے ہیں اور اگر اس دعویٰ کو صحیح مان لیا جائے تو امریکہ کی ہر اس چیز کی تردید کرنی ہوگی جو وہاں کے عیش و عشرت پر گواہی دے رہی ہے وہاں کے ذرائع دولت کو اسباب عسرت اور مظاہر عیش کو افلاس اور محتاجی کی علامت ثابت کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے اس کی جرأت کم ہی لوگ کر سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں حضرت عائشہ رضؓ کا کوئی عمل ہمارے لیے اسوہ بن سکتا ہے تو کیا دیگر امہات المومنین و اکابر صحابیات قابل تقلید نہیں ہیں؟ اگر حضرت عائشہؓ کا حضرت علیؓ سے جنگ کرنا ہمارے لیے سند ہے تو حضرت ام سلمہؓ کی روش کیوں اسوہ نہیں بن سکتی؟ حضرت علی رضؓ جس وقت حضرت زبیر رضؓ، طلحہ رضؓ اور حضرت عائشہ رضؓ کے مقابلے کے لیے بصرہ کی طرف روانہ ہونے لگے تو حضرت ام سلمہ رضؓ نے حضرت علی رضؓ سے کہا:

یا امیر المومنین لولا ان اعصی اللہ وانک لا تقبلہ منی لخرجت معک وھذا ابنی عمر وھو واللہ اعز علی من نفسی یخرج معک ویشھد مشاھدک [1]

اے امیر المومنین! آپ کے ساتھ اس مہم پر میرا چلنا خدا کی نافرمانی میں شمار ہوگا اور یہ کہ آپ میرے اس اقدام کو قبول بھی نہیں کریں گے۔ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو میں آپ کے ساتھ چلتی۔ یہ لیجئے میرا چچازاد بھائی حاضر ہے۔ قسم خدا کی یہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے یہ آپ کے

---

[1] تاریخ الرسل والملوک طبری، جلد ۵ صفحہ ۱۶۷، تاریخ کامل جلد ۳ صفحہ ۱۰۶۔

ساتھ چلے گا اور آپ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوگا؟
دوسری طرف حضرت عائشہ رضؓ کو لکھا: "آپ کی حیثیت رسول اللہ اور امت کے درمیان ایک دروازے کی ہے اور آپ کا حجاب گویا اس پر حرمت کا پردہ ہے لیکن آپ نے اس پردے کو چاک کر دیا (ذرا دیکھیے) قرآن نے آپ کے دامن کو سمیٹ دیا ہے اسے پھیلائیے نہیں اللہ نے آپ کو اپنے گھر میں بٹھایا ہے اسے چھوڑ کر میدان میں نہ چلی آیئے۔ خدائے تعالیٰ اس امت کی پشت پر ہے۔ آپ خود جانتی ہیں کہ حضور رضؐ کو آپ سے کس قدر محبت تھی۔ اگر امت کی ذمہ داری آپ کے حوالہ کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں کیا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ دین کا ستون اگر گرنے لگے تو عورتیں اسے کھڑا نہیں کر سکتیں اور اگر اس میں شگاف پیدا ہو جائے تو عورتوں کے بس میں نہیں کہ اسے بھر دیں۔ ان میں اگر دین کے لیے جہاد کی اہلیت ہوتی تو حضور رضؐ لازماً آپ کو جہاد کی وصیت کر جاتے۔ عورتوں کا جہاد اور ان کے لیے انتہائی محبوب بات یہ ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنا دامن سمیٹے رہیں۔
ذرا سوچیئے تو سہی کہ آپ کی ملاقات حضورؐ سے اس حال میں ہوتی کہ آپ اونٹ پہ بیٹھے ہوئے پہاڑوں اور ٹیلوں کے اطراف ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ گھوم رہی ہیں تو آپ کیا جواب دیتیں! کل آپ کو حضور رضؐ کے سامنے حاضر ہونا ہے اور حال یہ ہے کہ آپ نے اللہ کے ڈالے ہوئے پردے کو چاک کر دیا ہے اور اس کے عہد کو توڑ چکی ہیں۔
آپ نے جو کچھ کیا اگر وہ مجھ سے سرزد ہوتا تو قسم خدا کی مجھے جنت میں جاتے ہوئے بھی ندامت ہوتی (لہٰذا میری گزارش ہے) کہ آپ حضور رضؐ کے قائم کردہ پردے کو اپنا ستر اور گھر کے صحن کو اپنا قلعہ بنائیں۔ آپ حقیقت میں امت کی خیر خواہ اسی وقت ہوں گی جبکہ آپ ان کی مدد کے لیے (بجائے میدان میں جانے کے) گھر میں رہیں اگر میں آپ کو وہ حدیث سناؤں جو میں نے حضورؐ سے سنی ہے

تو یقین جانیے، کہ آپ سانپ کی طرح مجھے ڈسنے کے لیے دوڑ پڑیں گی"۔[1]

یہ نہ خیال کیا جائے کہ اس تنقید میں حضرت ام سلمہؓ تنہا ہیں بلکہ بہت سے اکابر امت نے حضرت عائشہؓ کے اقدام کو غلط اور شرعی حدود سے تجاوز قرار دیا تھا۔

حضرت عائشہؓ اپنی مہم پر جب بصرے پہنچیں تو انہوں نے زید بن صوحان کو اپنی اولادِ خالص ہے خطاب کرکے خط لکھا کہ "حضرت عثمانؓ کا قصاص لینے کے لیے جو کوشش ہو رہی ہے فوراً تم اس میں شریک ہو جاؤ اور اگر شریک ہونا نہیں چاہتے ہو تو کم از کم اپنی قوم کے لوگوں کو حضرت علیؓ کی حمایت سے باز رکھو"۔ یہ خط دیکھ کر زید بن صوحان نے کہا "اللہ ام المؤمنین پر رحم کرے، انہیں گھر میں بیٹھے رہنے اور ہمیں باہر نکل کر جہاد کرنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن جس امر کی وہ پابند ہیں خود تو اس سے آزاد ہو گئیں اور ہم سے اس کی پابندی کرانا چاہتی ہیں اور جس کام پر ہم مامور کیے گئے ہیں اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور ہمیں اس سے روک رہی ہیں۔ پھر خط کے جواب میں حضرت عائشہؓ کو لکھا "یقیناً میں آپ کی اولادِ خالص ہوں (اور آپ میری ماں ہیں) بشرطیکہ آپ اس سعی و جہد سے کنارہ کش ہو جائیں اور گھر لوٹ جائیں، ورنہ آپ کو چھوڑنے والوں میں مجھے پہلا شخص سمجھیے"۔[2]

بصرہ کی ایک اور مشہور شخصیت اور صحابیِ رسول جاریہ بن قدامہ حضرت عائشہؓ سے کہتے ہیں "آپ کے اس خروج کے مقابلے میں ہمارے نزدیک حضرت عثمانؓ کی شہادت بہت ہلکی ہے۔ اللہ نے آپ کی حرمت قائم کی تھی اور آپ کو پردے کا پابند کیا تھا لیکن آپ نے اس پردے کو چاک اور اس کی حرمت کو

---

[1] العقد الفرید، جلد ۳ صفحہ ۹۶-۹۷۔ الامامۃ والسیاسۃ، جلد ۲ صفحہ ۵۶

[2] طبری، جلد ۵ صفحہ ۱۸۳-۱۸۴۔ الکامل لابن الاثیر جلد ۳ صفحہ ۹۶۔

ختم کر دیا، جو شخص آپ سے جنگ جائز سمجھتا ہے وہ گویا آپ کے قتل کو بھی جائز سمجھتا ہے۔ دیکھئیے! آپ نے لوگوں کو کس قدر نازک پوزیشن میں ڈال دیا ہے لہٰذا اگر آپ اپنی خوشی سے آئی ہیں تو اب اپنے گھر لوٹ جائیے اور اگر آپ کو مجبور کر کے یہاں لایا گیا ہے تو اس کے خلاف لوگوں کا تعاون حاصل کیجئیے اور اپنے مستقر پہنچ جائیے۔ ۱

مشہور صحابی ابو بکرہؓ کہتے ہیں کہ جنگ جمل میں میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ شریک ہو جاتا لیکن حضورؐ کے ایک فرمان نے مجھے اس سے بچا لیا۔ جب آپ کو کسریٰ کی لڑکی کے تخت نشین ہونے کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا تھا کہ وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جو اپنا اقتدار کسی عورت کے حوالے کر دے ۲

حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے بزرگ صحابی فرماتے ہیں:۔

وبيتها خير لها من هودجها ۳

"حضرت عائشہؓ کے لیے ان کا گھر ہودج سے بہتر ہے"

ان تنقیدوں کو کوئی شخص یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتا کہ یہ حضرت عائشہؓ کے مخالفین کی ہیں کیونکہ یہ وہ بزرگ ہیں جن کی حق پسندی و نیکی کی حضرت عائشہؓ بھی معترف تھیں اور اگر ایسے ایسے صحابہ تابعین بھی مخالفت کے جوش میں جادۂ حق سے منحرف ہو گئے تو دین پر ثابت قدمی اور رہنمائی کی کس سے توقع کی جا سکتی ہے؟

پھر یہ بھی ایک غور طلب سوال ہے کہ اس امت کو اپنے ابتدائی چند سالوں میں بے شمار سیاسی و تہذیبی حوادث کا سامنا کرنا پڑا اور تاریخ گواہ ہے

---

۱ تاریخ الرسل والملوک طبری، جلد ۵ صفحہ ۱۷۶۔

۲ بخاری کتاب الفتن۔

۳ الامامۃ والسیاسۃ، جلد ۱ صفحہ ۱۱۔

کہ رجالِ امت نے ان حوادث کو صحیح رُخ پر موڑنے کی کوشش کی لیکن امت کی کسی خاتون نے عملاً ان کا مقابلہ نہیں کیا۔ خود حضرت عائشہ رض کو دیکھئے! کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تقریباً پچاس سال زندہ رہیں اور اس دوران میں حالات میں مسلسل اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رض ہمیشہ ان سے کنارہ کش رہیں اور اصلاح کے لیے کبھی کوئی اقدام نہیں کیا۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ گھر ہی کو وہ اپنی سرگرمیوں کا محور سمجھتی تھیں! ان کی پوری زندگی جس طرز فکر و عمل کی شہادت دے رہی ہے اس کو کسی ایک عمل کی بنا پر جھٹلایا نہیں جا سکتا اس کی ہمیں لازماً ایسی توجیہ کرنی ہوگی جو ان کی زندگی کی مجموعی روش سے ہم آہنگ ہو، کیونکہ بہت ممکن ہے اس عمل کے پیچھے وہ محرکات نہ ہوں جو ہم نے سمجھ لیے ہیں اور کچھ دوسرے ہی اسباب و حالات نے حضرت عائشہ رض کو میدانِ جنگ میں پہنچا دیا ہو۔ آئیے اس واقعہ کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دَور میں ان کے خلاف ایک عام بے اطمینانی پیدا ہو گئی تھی اور لوگ برملا تنقید کرنے لگے تھے یہاں تک کہ ایک وہ وقت آیا کہ مختلف علاقوں کے غنڈوں اور اوباشوں نے مدینے پر حملہ کر دیا اور اس کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا عظیم سانحہ پیش آیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض بزرگوں نے اس سیلاب کو روکنے کی اپنی حد تک پوری پوری کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔ اور اس فتنے سے دین و ملت کو جو نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچ کر رہا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا اس نے امت کو اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ سوچنے سمجھنے والوں نے محسوس کیا کہ یہ حقیقت میں ان کی ناکامی اور فتنہ جو عناصر کی کامیابی ہے۔ اگر بر وقت ان کی تلافی نہیں کی گئی تو دین ہمیشہ کے لیے شرپسندوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ جائے گا۔ اس کی تلافی کی صورت بعض افراد نے یہ سوچی کہ حضرت عثمان کی شہادت میں جو بھی شریک رہا ہے فوراً

اس سے قصاص لیا جائے ورنہ امت کا اجتماعی وزن گھٹ جائے گا اور اقتدار چند شورش پسندوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ وہ جسے چاہیں گے خلیفہ منتخب کریں گے اور جب چاہیں گے اسے تہ تیغ کر دیں گے اور کوئی قوت ان سے باز پرس کرنے والی نہیں رہ جائے گی۔ اس طرز فکر کی قیادت حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کر رہے تھے۔ ملیح بن عوف السلمی نے حضرت زبیرؓ سے دریافت کیا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ جواب دیا۔

ننهض الناس فيدرك بهذا الدم لئلا يبطل فان ابطاله توهين سلطان الله بيننا ابدا اذا لم يفطم الناس عن امثالها لم يبق امام الا قتله هذا الضرب قال والله ان ترك هذا الشديد ولا تدرون الى اين ذالك يسير[1]

"ہم لوگوں کو ابھار رہے ہیں کہ وہ اس خون کا بدلہ لیں تاکہ وہ ضائع نہ جائے کیونکہ اس کے ضائع جانے سے اقتدار خداوندی (اسلامی حکومت) ہمارے درمیان ہمیشہ کے لیے کمزور ہو کر رہ جائے گا۔ اگر لوگوں کی یہ عادت چھڑائی نہیں جائے گی تو جو بھی امام آئے گا اس کو تلوار کی یہ مار ختم کر دے گی۔ انہوں نے کہا قسم خدا کی اس کا قصاص نہ لینا بہت سخت ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ اس کے نتائج کہاں تک پہنچیں گے؟

یہاں ایک دوسرا گروہ بھی تھا جو امت کے اتحاد و اتفاق کو بنیادی اہمیت دے رہا تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ شیرازۂ ملت منتشر ہو چکا ہے، اور امت نے ایک خود سری کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ان حالات میں اس کے نزدیک حضرت عثمانؓ

---

[1] تاریخ الرسل والملوک طبری جلد ۵ ص ۱۷۱۔

کے قصاص کا مسئلہ چھیڑنا مزید انتشار کو دعوت دینا تھا۔ اس گروہ نے ضروری سمجھا کہ پہلے امت کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے چنانچہ اس نے حضرت علی رضؓ کو اپنا خلیفہ منتخب کیا۔ مدینے کی اکثریت نے اس گروہ کا ساتھ دیا۔ اس صورت حال کے بعد پہلی فکر کے حامل بہت سے افراد مدینہ چھوڑ کر دوسرے شہروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان ہی میں سے بعض مکے پہنچے جہاں پہلے سے امہات المومنین موجود تھیں۔ ان کو مدینے میں ہونے والی تبدیلیوں کا علم نہیں تھا کیونکہ یہ ان سے قبل ہی حج کے ارادے سے مکے آ گئی تھیں۔ جب انہوں نے مدینے سے آنے والے حضرات سے وہاں کے حالات دریافت کیے تو انہوں نے ایسا نقشہ پیش کیا جو اصل حقیقت سے بہت کچھ مختلف تھا۔ گویا اب خلافت ختم ہو چکی ہے مدینے میں شرپسندوں اور غنڈوں کا دور دورہ ہے اور ان ہی کا متعین کردہ ایک شخص حکومت کر رہا ہے۔

حضرت عائشہؓ نے اپنے ایک رشتہ دار سے پوچھا "کیا حال ہے؟" اس نے جواب دیا کہ حالات کی سختی نے لوگوں کو بہرا اور تباہ و برباد کر دیا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے افسوس کا اظہار کرنے کے بعد پھر سوال کیا۔ بتاؤ کیا حالات ہمارے حق میں ہیں یا ہمارے خلاف جا رہے ہیں؟ اس نے کہا میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کے بعد آٹھ دن تک لوگ بغیر امیر کے زندگی گزارتے رہے۔ اس کے بعد اہل مدینہ اور وہ لوگ جو مدینے پر چھائے ہوئے تھے (یعنی باہر کے غنڈے) حضرت علی رضؓ کے اطراف جمع ہو گئے ہیں[1]

حضرت عائشہؓ کے ایک اور رشتہ داران سے بیان کرتے ہیں:

قتل عثمان واجتمع الناس علی علیؓ والامر امر الغوغاء[2]

---

[1] طبری، جلد ۵ ص ۱۶۵

[2] ایضاً ص ۱۶۹۔

"حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے بعد ازاں لوگ حضرت علیؓ
کی بیعت پر متفق ہو گئے اور اصل اقتدار تو غنڈوں کے ہاتھ میں ہے۔"
مکہ پہنچنے والے ان ہی لوگوں میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی تھے۔ جن کو حضرت علیؓ کی بیعت سے اتفاق نہیں تھا اس لیے آپ کی بیعت اور نئی تبدیلیوں کے خلاف ان کے اندر سخت جذبات کا پایا جانا کسی حد تک قدرتی تھا چنانچہ حضرت عائشہؓ کے سوال پر جن الفاظ میں انہوں نے نئے حالات کا تذکرہ کیا ان سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

انا تحملنا بقلتنا هرابا من المدينة من غوغاء و اعراب وفارقنا قوما حيارى لا يعرفون حقا ولا ينكرون باطلا ولا يمنعون انفسهم[1]

"مدینہ سے ہم اپنی قلت کی تعداد کی بنا پر شر پسندوں اور بدوؤں کے خوف سے بھاگ کے چلے آئے اور وہاں ہم ایک حیران و سرگرداں قوم (اہل مدینہ) کو چھوڑ آئے ہیں جو نہ حق کو پہچانتی ہے اور نہ باطل پر نکیر کرتی ہے اور نہ اس میں اپنے آپ کی مدافعت ہی کی طاقت ہے۔"

حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ اور ان کے ہم فکر اصحاب نے مکہ پہنچنے کے بعد اب اس بات کی کوشش شروع کر دی کہ جو اصلاحی قدم وہ اٹھانا چاہتے تھے اس کے لیے راہ ہموار کریں اور حضرت عثمانؓ کے قاتلین سے قصاص لینے کی امت کو دعوت دیں۔ اس کے لیے انہیں امہات المومنین کے تعاون اور ہمدردی کی سخت ضرورت تھی جو اتفاق سے وہاں موجود تھیں اور نئے حالات سے بے انتہا متاثر بھی تھیں کیونکہ کسی تحریک کے ساتھ ان کی ہمدردی اس میں زندگی کا باعث بن سکتی تھی چنانچہ ان حضرات نے امہات المومنین سے خاص طور پر حضرت عائشہؓ

---

[1] تاریخ الرسل والملوک طبری، جلد ۳ صفحہ ۱۶۹

اور حضرت حفصہؓ سے جن کا سوسائٹی پر بہت زیادہ اثر تھا درخواست کی کہ وہ تمام دین کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیں۔ لیکن سوائے حضرت عائشہؓ کے بقیہ امہات نے اسے اپنے حدود سے تجاوز قرار دیا اور تعاون سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ مدینہ واپس چلی آئیں۔

حضرت عائشہؓ نے بہت ممکن ہے سوچا ہو کہ اس سے پہلے صرف ایک شخص ابوبکرؓ کے عزم وہمت نے ارتداد جیسے فتنے کو کچل کر رکھ دیا۔ اب بھی اس امت میں اتنا دم خم ہے کہ موجودہ شورش اور بغاوت کو وہ فرو کر سکتی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ کوئی صاحب عزم وایمان اس کو اس مقصد کے لیے تیار کر لے۔ بہرحال جو بھی سوچا ہو انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ امت کو اصلاح حال کی دعوت دی جائے۔

چنانچہ جب وہ اپنی مہم پر بصرہ پہنچیں تو گورنر بصرہ عثمان بن حنیف نے عمران بن حصین اور ابو الاسود کو آپ کی خدمت میں بھیجا کہ وہ آپ کا منشاء دریافت کر آئیں چنانچہ ان کے استفسار پر حضرت عائشہؓ نے جواب دیا۔

ان الغوغاء ونزاع القبائل غزوا حرم رسول اللہ ﷺ واحدثوا فیہ واٰووا المحدثین فاستوجبوا لعنۃ اللہ ولعنۃ رسول اللہ مع ما نالوا من قتل المسلمین بلا ترۃ ولا عذر فاستحلوا الدم الحرام واحلوا البلد الحرام والشہر الحرام فخرجت فی المسلمین اعلمہم ما اتی ہؤلاء وما الناس فیما وراءنا وما ینبغی لہم من اصلاح ہذہ القصۃ وقرأت لا خیر فی کثیر من نجواہم الا من امر بصدقۃ او معروف او اصلاح بین الناس ومن یفعل ذالک ابتغاء مرضات اللہ فسوف نؤتیہ اجرا عظیما فہذا شأننا الی معروف نأمرکم بہ ومنکر

تنہا کمرہ [1]

وہ غنڈوں اور اپنے قبیلوں سے نکلے ہوئے لوگوں نے حرم رسول میں جنگ کی، اس میں بدعت پھیلائی اور بدعتیوں کو جگہ دی اس طرح اللہ اور اس کے رسول کی لعنت کو اپنے اوپر واجب کر لیا۔ ساتھ ہی انہوں نے مسلمانوں کے امام کو بغیر کسی ظلم اور جائز وجہ کے قتل کیا ہے۔ پس بیک وقت انہوں نے خون ناحق کو حلال کیا اور اسے بہایا اور مال و دولت کو لوٹا جس کا انہیں حق نہیں تھا۔ محترم مدینے اور محترم مہینے کی حرمت کو ختم کیا۔ میرے نکلنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو بتاؤں کہ ان فتنہ بازوں نے کیا کیا ہے۔ اور ہمارے پیچھے لوگ کس حال میں پڑے ہوئے ہیں اور ان حالات میں انہیں کس قسم کی اصلاح کرنی چاہیئے؟ پھر حضرت عائشہؓ نے یہ آیت پڑھی (جس کا ترجمہ یہ ہے): "ان کی بیشتر سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے۔ مگر وہ جو خیرات یا بھلائی یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم دے اور جو شخص اللہ کی رضا کی خاطر ایسا کرے گا ہم اس کو عنقریب بڑا اجر دیں گے" اور کہا یہ ہے ہماری پوزیشن کہ ہم تم کو بھلائی کا حکم دے رہے ہیں اور برائی سے روک رہے ہیں"

قعقاع نے پوچھا "ام المومنین! آپ کس غرض سے یہاں آئی ہیں؟ جواب دیا:-

ای بنی الاصلاح بین الناس [2]

"اے بیٹے! لوگوں کے درمیان اصلاح کے لیے آئی ہوں"

یہ تصریحات بتاتی ہیں کہ ان کے سامنے نہ تو کسی قسم کے اقتدار کا حصول تھا

---

[1] الکامل لابن الاثیر جلد ۳ صفحہ ۸۹، طبری جلد ۵ صفحہ ۱۶۶ ۔

[2] الکامل جلد ۳ صفحہ ۹۹، البدایۃ والنہایۃ جلد ۷ صفحہ ۲۳۷ ۔

اور نہ وہ کوئی منصوبہ بنا کر حضرت علیؓ سے جنگ کے لیے روانہ ہوئی تھیں بلکہ وہ صرف یہ چاہتی تھیں کہ اپنے اثر و رسوخ سے امت کو اصلاح حال کی طرف متوجہ کریں۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:۔

ان عائشۃ لم تقاتل ولم تخرج لقتال وانما خرجت بقصد الاصلاح بین المسلمین وظنت ان فی خروجھا مصلحۃ للمسلمین[1]

"حضرت عائشہؓ نے نہ تو جنگ کی اور نہ وہ جنگ کی غرض سے چلی تھیں، وہ تو صرف مسلمانوں کی اصلاح کے ارادے سے گھر سے نکلی تھیں کیوں کہ وہ خیال کر رہی تھیں کہ ان کے گھر چھوڑنے میں مسلمانوں کی بھلائی ہے"

اس میں شک نہیں کہ بعد میں حضرت عائشہؓ کو حضرت علیؓ سے جنگ بھی کرنی پڑی لیکن اس میں ان کے قصد و ارادے کا دخل نہیں تھا بلکہ حالات نے ان کو اس میں مبتلا کر دیا تھا۔

اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ گو ان کو اپنے ہم خیال لوگوں میں قائد اور رہنما کی حیثیت حاصل تھی، ان ہی کی مرضی سے تمام معاملات طے ہوتے تھے اور کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر طے نہیں پاتا تھا، لیکن اس کے باوجود تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ایک مشیر اور بہی خواہ سے آگے بڑھ کر قیادت و رہنمائی کا بھی دعویٰ کیا ہو اور جو لوگ آپ کے اشارے پر جان و مال لٹانے کے تیار ہی نہیں تھے بلکہ عملاً لٹا رہے تھے وہ آپ کو قانوناً اپنا خلیفہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے حتیٰ کہ نماز حضرت طلحہؓ پڑھائیں یا حضرت زبیرؓ، اس مسئلے پر ان لوگوں میں اختلاف ہوا اور حضرت

[1] منہاج السنۃ جلد ۲ صفحہ ۱۸۱۔

عائشہؓ ہی کے مشورے سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اس کام پر مامور کیا گیا لیکن کسی نے اس منصب کے لیے حضرت عائشہؓ کا نام تجویز تک نہیں کیا، حالانکہ نماز کی امامت، قیادت ملت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ یہ سب کچھ ان لوگوں کے درمیان ہوا جو آپ کے مخالف نہیں بلکہ مؤید و ناصر تھے اور جن کے نزدیک آپ کی دینی حیثیت حضرت طلحہؓ و زبیرؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ سے کہیں زیادہ تھی۔

بہرحال یہ واقعہ انتہائی ہنگامی حالات کا نتیجہ تھا جس میں حضرت عائشہؓ کو ایسے اقدامات کرنے پڑے جس کی توقع عام حالات میں ان سے ہرگز نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایسے ایک واقعہ کو ہر دور کے لیے مستقل سند سمجھنا ایسے ہی ہے جیسے کسی پیاسے کو شراب پیتے دیکھ کر اس کے جواز کا فتویٰ صادر کر دیا جائے۔

جنسی تعلقات

عہدِ قدیم سے دورِ جدید تک

جنسی تعلق کی نوعیت کیا ہو؟ یہ سوال اتنا ہی قدیم ہے جتنا قدیم کہ خود انسان۔ اس سوال کا محرک جنسی خواہش ہی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے بقائے نسل کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ کیونکہ اب تک انسان سوائے جنسی تعلق کے کسی ایسے طریقے سے واقف نہیں ہے جس کے ذریعہ اپنی نسل کو باقی رکھ سکے۔ اگر یہ تعلق منقطع ہو جائے تو نسل انسانی کا سلسلہ بھی رک جائے گا۔ اسی لیے دورِ قدیم کا توہم پرست انسان جنسی جذبے کو ایسی غیبی قوت خیال کرتا تھا جو اس کی موت و حیات پر قدرت رکھتی ہے۔ چنانچہ مصر، سوڈان، مغربی افریقہ، یورپ اور ایشیا کی بیشتر قوموں میں اس قوت کے مقابلے میں اپنی بے بسی و بے چارگی کا شدید احساس پایا جاتا تھا اور وہ اپنی نسل کو جنسی قوت کے غضب اور غصے سے بچانے کے لیے اس کی رضاجوئی اور خوشنودی کو ضروری سمجھتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے بعض بعض قوموں نے ایسی مورتیاں بنائی تھیں جن سے صنفی تعلقات پوری طرح نمایاں تھے۔ بہت سے قبائل اور قوموں کے بتوں کی ہیئت ہی اعضاءِ جنسی کی سی ہوتی تھی کیوں کہ اعضاءِ جنسی کے متعلق یہ تصور تھا کہ وہ اس غیبی قوت کے مظہر ہیں جو انسانی نسل کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ اظہارِ عقیدت کے لیے ایسی چیزوں کو منتخب کیا جاتا تھا جو ان اعضاء سے مشابہت رکھتی ہیں یا جن سے کسی نہ کسی طرح جنسی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسی قومیں تو بہت سی ملیں گی جن کے مراسم خوشی و غم

میں جنسی عنصر شامل ہے۔ آج بھی ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کتنے ہی ایسے غیر متمدن قبائل ہیں، جنسی جذبے کی پرستش جن کے مذہب کے ایک ضروری جزو کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

یہ سب کچھ انسان کی اس شدید خواہش کا نتیجہ تھا کہ اس کی اولاد باقی رہے تاکہ زندگی کی سرگرمیوں میں اس کا ساتھ دے۔ دشمن کے مقابلے میں اس کی حفاظت کرے، تلاش معیشت میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن جب وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے سامنے بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کیا اپنی تمام اولاد کو باقی رکھے یا صرف ان ہی کو جو اس کے لیے کارآمد اور مفید ہوں؟ ان کی پرورش اور ساخت و پرداخت کون کرے؟ آیا یہ صنف اناث کی ذمہ داری ہے یا صنف ذکور کی یا دونوں اس میں شریک ہیں؟ پھر ذرائع معیشت اور مال و اسباب کی تقسیم ان کے درمیان کیسی ہو؟ یہی مسائل پھیل کر خاندان اور قبیلہ اور قوم و ریاست کی شکل اختیار کرتے رہے ہیں اور ان ہی سے ان کی حیثیت بھی متعین ہوتی رہی ہے۔ قبائلی زندگی کبھی ماں کے گرد گھومتی تھی۔ باپ، محنت مشقت کر کے معاش فراہم کرتا اور ماں پوری مالکانہ حیثیت میں اس کو اولاد اور دیگر افراد خاندان پر خرچ کرتی حتیٰ کہ اولاد بھی ماں ہی کی طرف منسوب کی جاتی۔ کہیں سلسلۂ پدری اور خاندان پر مرد کے کنٹرول کا ثبوت ملتا ہے اور کہیں ماں باپ مل جل کر مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

مسائل کے حل کی ان مختلف صورتوں کے ساتھ ساتھ جنسی تعلق کی نوعیتیں بھی بدلتی رہی ہیں۔ کہیں اس تعلق کی نوعیت بالکل وقتی رہی ہے اور کہیں اس کو مستقل اور پائیدار رشتہ سمجھا گیا ہے۔ کسی قوم کے نزدیک اس کے لیے بہت سے حدود کو قبول کرنا پڑتا تھا اور کسی کے ہاں محض طرفین کی خواہش اس کو جائز کر دیتی تھی۔ کہیں یک زوجگی کا رواج تھا، اور کہیں ایک عورت سے خاندان کے سب ہی مردوں کو متمتع ہونے کا حق تھا۔ کہیں تعدد ازدواج پر عمل تھا اور کہیں تو ہر ازدواج

کا طریقہ رائج تھا غرض کوئی ایک ضابطہ نہیں تھا جس پر تمام قومیں کاربند رہی ہوں۔

ان مختلف طریقوں کے بارے میں یہ خیال کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ یہ وقت کے سماجی و معاشی تقاضوں کے تحت وجود میں آئے ہیں۔ ان میں سے بعض کو انسان نے یقیناً اپنے مخصوص حالات کی بنا پر اختیار کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بعض طریقوں کا رواج محض جنسی آسودگی کے لیے ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جنسی داعیات بہت شدید ہوتے ہیں جن پر قابو پانا انتہائی دشوار ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا بالکل سادہ لوحی ہے کہ ان کی تسکین میں انسان نے سماج کے مفاد کی رعایت کی ہو گی۔ بلکہ جہاں تک ہمارے قریبی مشاہدے اور تاریخی حقائق کا تعلق ہے ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنسی خواہش سماجی تقاضوں پر غالب رہی ہے جس کی وجہ سے سماج کو سخت نقصانات اٹھانے پڑے ہیں۔ ہزارہا زندگیاں تباہ ہوئی ہیں۔ انسانوں کے درمیان سے سکون اور چین رخصت ہوا ہے۔ امن و امان کے بجائے بدامنی اور خوف و ہراسانی پھیلی ہے۔ ناچاقی اور اختلافات اور قتل و خونریزی عام ہوئی ہے۔ یہ سب نتیجہ رہا ہے جنسی جذبات کے پیچھے دوڑنے کا۔

رہبانیت

ان حالات نے رہبانیت اور تجرد پسندی کو جنم دیا۔ امن و امان اور انسانیت کی نجات اسی میں نظر آنے لگی کہ جنسی جذبات ہی کو دبا دیا جائے۔ کیونکہ جب تک فتنہ و فساد کا یہ سرچشمہ بند نہ ہو گا سکون اور اطمینان نہیں مل سکتا۔ اس نقطۂ نظر کو مصر، یونان، ہندوستان، چین اور یورپ وغیرہ میں خوب فروغ ہوا۔ اور جہاں بھی یہ نقطۂ نظر پہنچا اس نے انسان کو جنسی خواہش سے پھیرنے کی کوشش کی حتیٰ کہ جنس مقابل ہی سے شدید نفرت پیدا کر دی اور اس سے دوری اور کنارہ کشی کو انسانیت کی معراج اور خیر و فلاح کا ذریعہ قرار دیا۔

چنانچہ آپ مسیحیت کو لیجیے جو حضرت مسیح کے بعد تجرد پسندی اور رہبانیت

میں تبدیل ہو گئی تھی اس کا اصل الاصول ہی یہ قرار پایا کہ جنسی تعلقات سے احتراز کیا جائے اور مسیحیت کے علمبردار اس سے اس طرح بچتے تھے جیسے کوئی شخص گندگی سے گزرتے ہوئے اپنا دامن بچائے رکھے۔

چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ مشہور امام رہبانیت سیویس جب نہایت ضعیف اور اپاہج ہو گیا تو اس کی انتہائی کہنہ سنی پر نظر کر کے اس کے تلامذہ و رفقاء نے چاہا کہ وہ جنگل چھوڑ کر کسی بستی میں سکونت اختیار کرے۔ وہ اس درخواست کو قبول کرنے پر راضی ہو گیا لیکن شرط یہ پیش کی کہ وہ بستی ایسی ہو جس میں کبھی کسی عورت سے دوبدو ہونے کا احتمال نہ ہو۔ ایسی بستی کا وجود ظاہر ہے کہ ناممکنات سے تھا چنانچہ بالآخر وہ بدستور جنگل ہی میں مقیم رہا اور وہیں جان دے دی۔

سینٹ بیسل نے بجز کسی شدید مجبوری کے عورت کا چہرہ دیکھنا اپنے اوپر حرام کر لیا تھا سینٹ جان نے ۴۸ سال تک عورت کی صورت نہیں دیکھی بالآخر اس کی بیوی نے مجبور ہو کر اس کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر وہ اسے دیکھنے نہ آئے گا تو وہ اپنی جان دیدے گی۔ یہ سُن کر اُس نے جواب دیا کہ آج رات کو جس وقت تم اپنی خواب گاہ میں ہو گی میں آؤں گا۔ اور اس وعدہ کا وفا یوں ہوا کہ بیوی نے رات کو اسے خواب میں دیکھ لیا۔

ملکہ زنوبیہ کبھی اپنے شوہر کے ساتھ مباشرت پر راضی نہ ہوئی بجز اس صورت کے جب ایسا کرنا ولیعہد سلطنت کو وجود میں لانے کے لیے ضروری ہو گیا۔ پاپیشا کی گو شادی ہو گئی تھی تاہم وہ عمر بھر باکرہ رہی یعنی شوہر کو اس نے کبھی اپنے ساتھ صحبت نہ کرنے دی۔

جنس مقابل سے نفرت اور بیزاری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ یہ راہبین ماؤں اور بہنوں تک سے بھاگنے لگے تھے جن کی رفاقت کو دنیا نے ہمیشہ باعث عزت و افتخار سمجھا ہے گویا ان کی قربت بھی ان کے لیے ایک عذاب تھی۔

ایک راہب صاحب سفر کر رہے تھے اور اپنی والدہ کو بھی اپنے ہمراہ

بیٹے ہوئے تھے۔ راستے میں ایک چشمہ پڑا جس پر کوئی پل نہ تھا۔ حضرت نے جلدی جلدی اپنے ہاتھ اور سارے جسم کو کپڑے میں خوب کس کر لپیٹنا شروع کیا۔ ماں نے متحیر ہو کر سبب پوچھا تو جواب دیا تمہیں کندھے پر بٹھا کر اس پار کرنا ہے، ڈر ہے اگر کہیں میرا جسم تمہارے جسم سے مس ہو گیا تو میرا سارا کیا کرایا ایک دم میں رائگاں جائے گا۔

سینٹ جان کی ہمشیرہ کو اس سے بے حد انس تھا۔ جب سینٹ مذکور کو بادیہ نشینی اختیار کیے بہت زمانہ گزر گیا تو ہمشیرہ کے دل میں دیکھنے کا بہت اشتیاق ہوا۔ بلانے کے بہت سے خطوط لکھے مگر ادھر سے انکار ہی رہا آخر مجبور ہو کر خود جنگل میں جا کر ملنے کا ارادہ کیا۔ سینٹ مذکور کو وحشت ہوئی اور خط میں لکھ بھیجا کہ میں خود ہی آتا ہوں۔ چنانچہ آپ آئے ضرور مگر اس قدر تبدیل ہیئت کے ساتھ کہ بہن نے پہچانا تک نہیں۔ اسی حالت سے واپس چلے گئے اور بہن کی شکوے کے جواب میں لکھ بھیجا۔ میں آیا تو تھا مگر مسیح کے فضل و کرم سے تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ اب ہرگز کبھی میرے دیدار کا قصد نہ کرنا۔

سینٹ پیمن کی بابت یہ روایت ہے کہ اس نے مع اپنے چھ بھائیوں کے دفعۃً ترک خاندان کر کے جنگل کی راہ لی۔ جس ضعیف ماں کی ساتوں اولادیں اسے اک بارگی چھوڑ دیں اس کے دل پر کیا کچھ گزر گئی ہو گی۔ غرض بے تاب ہو کر خود بھی جنگل میں آئی۔ یہاں وہ ایسے وقت پہنچی جب کہ یہ لوگ اپنے حجرے سے نکل کر گرجا جا رہے تھے، ماں کی صورت دیکھتے ہی سب دہشت زدہ ہو کر پلٹے۔ ماں نے فوراً تعاقب کیا لیکن کبر سنی کے پاؤں جوانی کے پاؤں کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے اور قبل اس کے کہ ماں دروازے پر پہنچے، صاحبزادوں نے اندر سے حجرہ بند کر لیا اب حالت یہ تھی کہ ضعیف و ناچار ماں دروازے پر کھڑی اپنی جگر دوز چیخوں سے جنگل کو ہلائے دیتی تھی۔ اسی حالت میں سینٹ پیمن نے دروازے کے قریب آ کر اس آہ و شیون کا سبب پوچھا۔ ماں نے ہچکیاں لے لے کر تقریر

شروع کی کہ یہ سارا صدمہ تمہارے منہ دیکھنے کا ہے۔ کیا تم مجھے نہیں جانتے میں تمہاری ماں ہوں؟ کیا میں نے تمہاری رضاعت نہیں کی؟ تمہیں پال کر اتنا بڑا نہیں کیا؟ کیا میرے ان احسانات کا یہی معاوضہ تھا؟ کیا میرے سارے حقوق تم نے بھلا دیئے؟ یہ ساری تقریر بے اثر رہی۔ اہلِ زہد کی طرف سے زیادہ سے زیادہ یہ جواب ملا کہ تم اپنی موت کے بعد ہی ہمیں دیکھ سکو گی یہاں تک کہ دکھیاری ماں کو یہیں سے تسلی پا کر ناکام واپس جانا پڑا۔

سینٹ سیموریل کو ترک خانماں کیے جب ستائیس سال گزر چکے، اور سینٹ موصوف کی ماں کو جنگل میں ان کی قیام گاہ کا پتہ معلوم ہوا تو وہ ملاقات کے لیے خود جنگل میں آئی۔ لیکن اس کی تمام تقریریں، خوشامدیں، آہ وزاریاں سب بیکار گئیں اور سینٹ موصوف نے کسی طرح ملاقات کی ہامی نہیں بھری۔ آخر جب دیکھا کہ ماں کی بے قراری حد سے گزرتی جاتی ہے تو یہ کہلا بھیجا کہ میں عنقریب ملنے آتا ہوں، لیکن شبانہ روز اس وعدے کے گزر گئے یہاں تک کہ اسی حجرے کے دروازے پر فرطِ یاس سے ماں نے دم توڑ دیا۔ [۱]

مسیحی مذہب کے ان دو تین واقعات سے دوسرے راہبانہ مذاہب کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ان مذاہب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ جنسی جذبات کی بے اعتدالیوں کا علاج نہیں تجویز کرتے بلکہ ان کے خلاف بغاوت کی تعلیم دیتے ہیں۔ حالانکہ انسان کے فطری جذبات کو دبایا اور کچلا نہیں جاسکتا اور اگر ان کو دبایا جائے تو وہ غلط رُخ سے ابھرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے جن لوگوں نے جنسی مطالبے کے سامنے مصنوعی بند باندھنے کی کوشش کی وہ غیر فطری وغیر قانونی طریقوں سے اس کی تکمیل پر مجبور ہوئے۔

---

[۱] یہ واقعات تاریخ اخلاق یورپ حصہ دوم سے لیے گئے ہیں۔

لیکی اپنی کتاب "تاریخ اخلاق یورپ" میں لکھتے ہیں ۔

" پاپائے اعظم جان بست وسوم زناکاری اور خود اپنی ماں بہن کے ساتھ زنا کاری کے مرتکب ہوئے ۔ کنٹربری کے اسقف ۱۱۷۱ء میں صرف ایک موضع میں ۷۰ بچوں کے والد نکلے ! اسپین کے ایک اسقف ۱۱۳۰ء میں ۷۰ کنیزیں رکھے ہوئے تھے ۔ ہینری سوم سیٹر کے پادری کی ۷۰ ناجائز اولادیں ۱۲۷۴ء میں نکلیں ۔ ان سب کو مستثنیات سمجھ کر تھوڑی دیر کے لیے ان سے قطع نظر کر بھی لیجیے تاہم اسے کیا کیجیے گا کہ اس زمانے کے پادریوں کی عام بدچلنی و شہوت پرستی کے ثبوت میں مستند شواہد کے دفتر موجود ہیں ۔ اچھوتیوں کی خانقاہیں اب خانقاہیں نہیں رہی تھیں بلکہ حرام کاری کے اڈے اور ناجائز بچوں کے قبرستان تھے ۔ حرام کاری و شہوت پرستی کے جوش میں محرمات وغیر محرمات کی تمیز اٹھ گئی تھی ۔ چنانچہ بار بار اس طرح کے قوانین کے نفاذ کی ضرورت پیش آتی رہی کہ پادری اپنی ماؤں اور بہنوں سے الگ رہیں ۔ اغلام اور شاہد بازی کی گو مسیحیت نے بیخ کنی کی ، لیکن خانقاہوں کی چار دیواری کے اندر اس کی سرپرستی قائم رہی ۔ خود ناصحین کی یہ حالت تھی کہ وہی سب سے زیادہ آلودہ معاصی رہتے تھے ۔ بارہویں صدی میں پاپا صاحب کے ایک سفیر انگلستان میں وعظ کے لیے تشریف لائے ۔ کلیسا کے اخلاقی انحطاط پر انہوں شدومد سے وعظ کہا لیکن ابھی اس کو چند گھنٹے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے خلوت کدے میں ایک طوائف کے ساتھ لطف ہم آغوشی حاصل کر رہے تھے ۔ یہ سب کیا تھا ؟ وہی ازدواج کو ممنوع قرار دینے کا وبال ۔ ساری خرابیوں کی جڑ یہی تھی کہ شادی و نکاح کے پاک و فطری طریقے کے انسداد کی

کوشش کی جاتی تھی۔ پانی کے بہاؤ کے قدرتی راستے کو روکیے گا تو وہ حوض کے اندر لامحالہ گندگی و تعفن پیدا کر دے گا۔"

غیر فطری جدوجہد کے ذریعہ ان سیاہ اعمالیوں سے آدمی اپنا دامن بچا بھی لے تو اس کا مزاج اور طبیعت اس جدوجہد کو قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسان کی ساخت اور سرشت ہی ایسی ہے کہ اس کے اندر جنسی داعیات شدت کے ساتھ ابھرتے رہتے ہیں۔ ان داعیات کی تسکین ہی سے اس کو سکون اور چین ملتا ہے۔ اس کے بغیر اس کے جذبات و احساسات اور فکر و مزاج کا اعتدال پر رہنا انتہائی دشوار ہے بلکہ بعض اوقات اس کا آدمی پر اتنا شدید ردعمل ہوتا ہے کہ اس کا سارا فکری و جسمانی نظام مختل ہو جاتا ہے۔

مارچ ۱۹۷۵ء کو دماغی امراض کے برطانوی ماہرین کا ایک گروپ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ "اگر سکون قلب چاہتے ہو اور بہت سی دماغی بیماریوں سے بچنا چاہتے ہو تو شادی کر لو۔"

اقوام متحدہ کے تحت دنیا کے سترہ نمائندہ ملکوں یعنی امریکہ، انگلستان، بلجیم، مصر، آسٹریلیا، بھارت، پاکستان وغیرہ نے تحقیق کی، مردم شماری کے رجسٹروں کی چھان بین کی اور پتہ چلایا کہ اوسط عمر کس قسم کے لوگوں کی زیادہ ہے۔ اس تحقیق کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ کنواروں اور رنڈوؤں کے مقابلے میں شادی شدہ مردوں کی عمر کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ ان تمام ملکوں کی اگر اوسط عمر نکالی جائے تو شادی شدہ مردوں کی اوسط عمر تقریباً ۷۵ برس نکلتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں غیر شادی شدہ مرد صرف ۳۹ برس کی اوسط تک زندہ رہتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ اوسط عمر شادی شدہ عورتوں کی ہے۔

جنسی تعلق سے دوری کے نقصانات فرد کی ذات تک محدود نہیں رہتے بلکہ اس کے پیچھے کام کرنے والی روح آدمی کے سماجی تعلقات کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی تعلق اس لیے ناجائز اور مبغوض قرار پائے گا کہ اسے انسانوں

کی بدعملیوں نے ناپاک کر دیا ہے تو دنیا کا کون سا انفرادی و اجتماعی رشتہ ہے جو ہر طرح کی آلودگیوں سے محفوظ ہے۔ ماں اور بچے کے تعلق کو فطری تعلق سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں بھی ہزارہا خرابیاں پیدا ہوئی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں کیا ان خرابیوں کی وجہ سے ماں کی گود سے بچے کو چھین لیا جائے؟

جنسی جذبے کو دبانے کا ایک نتیجہ تمدن کا زوال بھی ہے۔ کیونکہ تمدن کی ترقی میں اس جذبے کو بہت بڑا دخل ہے۔ آدمی اپنے جذبات کی آسودگی محض سادہ طریقے سے نہیں چاہتا بلکہ اس میں رنگینی اور کیف پیدا کرنا چاہتا ہے۔ بازاروں کی رونق، تفریح گاہوں کے دلفریب مناظر، عالیشان عمارتوں اور دیگر تمدنی مظاہر کے پیچھے آدمی کی یہ خواہش بھی کام کرتی ہے کہ اس کے گرد ایسا ماحول رہے جس سے جنسی لذت میں اضافہ ہو سکے۔ اس جذبے کو مٹانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمدنی ترقی کے ایک موثر عامل کو ختم کر رہے ہیں۔

تجرد پسندی کی سب سے بڑی اور اہم خرابی یہ ہے کہ وہ نسلِ انسانی کی دشمن ہے۔ قدرت نے دو صنفوں کے درمیان کشش اس لیے رکھی ہے کہ اس سے ایک تیسرا وجود پیدا ہو جو ان کی قائم مقامی کرے۔ قدرت اس جذبے کے ذریعے یہ اعلان کر رہی ہے کہ یہاں حقِ زیست صرف ان ہی انسانوں کو نہیں ہے جو اس وقت موجود ہیں اور نہ ان کے بعد بساطِ انسانیت تہ کی جانے والی ہے، اس لیے اس جنسی کشش کو نوعِ انسانی کے بقا کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ لیکن ایک تجرد پسند، قدرت کے اس اعلان کا جواب یہ دیتا ہے کہ خود میرا وجود زمین کے سینے پر بار ہے۔ تمہاری آواز پر لبیک کہوں تو میری روح ناپاک ہو گی اور میرا نفس آلودۂ معصیت ہو جائے گا۔ اگر یہ چمن اجڑتا ہے تو اجڑنے دو۔ میں اپنا دامن کانٹوں سے الجھا نہیں سکتا۔

اباحیت پسندی

زمانہ قدیم ہی سے رہبانیت کے ساتھ ساتھ اس کے بالکل برعکس ایک

دوسرا نقطۂ نظر بھی کام کرتا رہا ہے، اور وہ ہے اباحت پسندانہ نقطۂ نظر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب جنسی داعیہ ایک فطری داعیہ ہے تو دوسرے داعیاتِ فطرت کی طرح اس کی تسکین کا سامان ہونا چاہیئے۔ اس میں صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز کی قید بے معنی ہے کیوں کہ انسان کے فطری تقاضوں پر پابندی عائد کرنا اس کے ساتھ ظلم ہے۔ اس لیے اس کو یہ حق ملنا چاہیئے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی خواہش پوری کرے۔

رہبانیت، شہوت پرستی اور اس کی تباہ کاریوں کے خلاف ایک فراری طرزِ عمل ہے تو اباحت پسندی انسان کے عزم و حوصلہ کی شکست اور اس کے جذبۂ شر کے مقابلے میں جذبۂ خیر سے مایوسی کا اعلان ہے۔ اس نظریے کو تسلیم کر لینے کے بعد ہر طرح کی عیاشی اور لذت کشی کے لیے وجہِ جواز ہاتھ آجاتی ہے۔ اسی لیے اس کو مختلف ادوار میں انتہائی فروغ ہوا۔ ہر جگہ زناکاری اور عیاشی کے اڈے قائم ہوئے۔ ہوس رانی عام ہوئی اور ناجائز تعلقات اور اس کے نتائج خوشی خوشی برداشت کیے گئے۔ یہاں تک کہ اس تصور نے سوسائٹی میں ایک مستقل عصمت فروش طبقے کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیا اور اس کی ہر طرح ہمت افزائی کی تاکہ جنسی تسکین کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے اور آزادی کے ساتھ ہر وقت خواہشات کی تکمیل ہوسکے۔

سینٹ آگسٹائن اس طبقے کی ضرورت کو اس طرح ثابت کرتا ہے:۔

"کسبیوں کے پیشے کو نہ روکو ورنہ شہوت رانیاں تمام سوسائٹی کو تہ و بالا کر دیں گی"۔

سسرو جیسا حکیم اور فلسفی اپنی ایک تقریر میں کہتا ہے:۔

"اگر ہم میں سے کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ نوجوانوں کو طوائفوں کی صحبت سے بالکل محترز رہنا چاہیے تو میں کہوں گا کہ اس کا یہ خیال بہت ہی سخت ہے۔ آج تک کس نے اس کی پابندی کی

ہے اور آج کل کیا قدما میں کب کوئی اس خیال کا گذرا ہے؟
کب اور کس زمانے میں کسی نے اس کے جواز پر شبہ کیا ہے؟"

قطع نظر اس بحث سے کہ یہ نظریات انسان کے جنسی اخلاقیات پر کس حد تک اثر انداز ہوئے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ کے بیشتر ادوار میں جنسی بے راہ روی عام رہی ہے

کتاب مقدس انجیل میں لکھا ہے کہ ایک دن یسوع مسیحؑ کے فقیہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا اے استاذ! یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے پس تو اس عورت کی نسبت کیا کہتا ہے؟ (مسیحؑ نے) ان سے کہا، جو تم میں بے گناہ ہو وہی پہلے اس کے پتھر مارے۔ یہ سن کر بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک ایک ایک کر کے نکل گئے اور یسوعؑ اکیلا رہ گیا" (یوحنا باب ۸) کیونکہ ان میں سے کسی کا دامن بھی اس گناہ سے پاک نہ تھا (جنسی آوارگی مختلف ناموں سے پائی جاتی رہی ہے، کبھی اس کو سماجی و تمدنی ضرورت کا نام دیا گیا، کبھی اس کو تقاضائے فطرت کہا گیا اور کبھی اس نے مذہبی رنگ اختیار کیا ہے لیکن اس کے پیچھے زیادہ تر انسان کی خواہش نفس کام کرتی رہی ہے)

اسلام کے آنے سے پہلے کے عرب کا حال حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں جو بخاری اور ابوداؤد جیسی صحیح کتابوں میں موجود ہے کہ عرب میں جنسی تسکین کے چار طریقے تھے۔ پہلا طریقہ تو باقاعدہ نکاح کا تھا۔ جو شخص کسی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا اس کے سرپرست کے پاس پیغام بھیجتا۔ اگر پیغام قبول کر لیا جاتا تو مہر ادا کر کے اس سے رشتہ قائم کر لیتا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کسی شریف اور مشہور آدمی کا نطفہ حاصل کرنے کے لیے مرد اپنی بیوی کو اس کے ہاں رات گزارنے کا حکم دیتا اور جب تک حمل ظاہر نہیں ہوتا وہ بیوی سے الگ رہتا۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ دس سے کم اشخاص ایک عورت سے تعلق رکھتے اور اس تعلق کے نتیجہ میں جو اولاد

پیدا ہوتی عورت اس کو ان میں سے کسی ایک کے نام منسوب کر دیتی اور وہ اسی کی ہو جاتی۔ چوتھا طریقہ یہ تھا کہ عرب میں باقاعدہ بیسوائیں تھیں جو اپنے دروازوں پر جھنڈے نصب کر رکھتی تھیں ان سے فائدہ اٹھانے کی ہر شخص کو اجازت تھی۔ ایسی عورتوں کے جو بچے ہوتے وہ قیافہ شناس کی مدد سے ان سے تعلق رکھنے والے طبقہ میں سے کسی کی طرف منسوب کر دیے جاتے اور اس کو لامحالہ قبول کرنا پڑتا تھا۔

خود ہمارے ہندوستان میں جنسی تعلق کے ایک دو نہیں آٹھ طریقے رائج تھے اور کمال یہ کہ یہ سب جائز اور صحیح سمجھے جاتے تھے۔

بعض اوقات بانجھ عورتیں اولاد حاصل کرنے کے لیے ہفتوں پجاریوں کے ساتھ شب باش ہوتی تھیں اور یہ سوسائٹی میں بالکل معیوب نہیں تھا۔

سید شریف الدین سمہودی نے اپنی کتاب "وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ" میں مدینہ کے ایک یہودی بادشاہ کا ذکر کیا ہے جس نے یہ قانون نافذ کر رکھا تھا کہ جو بھی لڑکی بیاہی جائے رخصتی سے پہلے لازماً اس کے ساتھ ایک رات گزارے۔

یہ ایک تفصیلی بحث ہے کہ قدیم ادوار میں جنسی آوارگی کہاں کہاں اور کن کن شکلوں میں پائی جاتی تھی۔ یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ جنسی بے راہ روی اور اباحت پسندی کسی دور اور کسی علاقہ کے ساتھ مخصوص نہیں رہی ہے، بلکہ تقریباً ہر دور اور ہر علاقہ میں پائی گئی ہے۔

دورِ جدید

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اباحت کے تصور کو موجودہ دور سے پہلے کبھی قبولِ عام نہیں حاصل ہوا۔ کیونکہ اب تک ہزار بد اخلاقیوں کے باوجود اخلاق و شرافت اور طہارت و تقویٰ ہی کو انسانیت کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ یہ دورِ حاضر کا وصف امتیاز ہی ہے کہ اس نے استدلال کی پوری قوت کے ساتھ دعویٰ کیا کہ انسان بھی دوسرے حیوانات کی طرح ایک حیوان ہے جو

جو اپنے اندر کچھ خواہشات اور داعیات رکھتا ہے۔ ان خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اس کو چند لمحات حیات حاصل ہیں جن کے ختم ہونے پر وہ عدم کے پردے میں چھپ جائے گا۔ اسے جو کچھ داد عیش دینی ہے اور لطف زیست حاصل کرنا ہے اسی وقفۂ زندگی میں حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا انسان کو اپنی خواہشات اور جذبات کا مرقد تیار کرنے کے بجائے ان کو تیز سے تیز کرنا چاہیے تاکہ اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی مرغزار سے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے، اور وہ دنیا سے اس حال میں نہ جائے کہ اس کی تمنائیں اور ولولے ماتم کناں رہ جائیں۔

"زنا" کو مذہبی تنگ نظری نے اس قدر گھناؤنا اور مکروہ بنا دیا ہے کہ اس کے ساتھ بدکاری، معصیت اور انتہائی متعفن کردار نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے ورنہ "زنا" کے تجزیے کے بعد صرف اتنی سی بات سامنے آتی ہے کہ انسان نے اپنے ایک فطری مطالبہ کی تسکین میں ان حدود و قیود کی پابندی نہیں کی جو مصنوعی طور پر اس کے اطراف کھڑے کر دیے گئے ہیں۔ ان حدود کی مخالفت کوئی جرم نہیں جس پر کسی کو غلط کار کہا جا سکے جس طرح کسی حیوان کے متعلق یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اپنی خواہشات کس طرح پوری کرتا ہے اسی طرح انسان کے متعلق بھی یہ سوال فضول ہے کہ اس نے اپنے جذبات کی آگ بجھانے میں کن حدود کی پابندی کی اور کن حدود کی پابندی نہیں کی۔ یہاں جو بات دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ اس کے اس عمل سے کسی دوسرے انسان کا نقصان ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر اس کا کوئی عمل فرد یا سماج کے لیے ضرر کا باعث بن رہا ہے تو یقیناً اسے ممنوع ہونا چاہیے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اس کو جائز نہ قرار دیا جائے۔

اس فلسفے نے بہیمیت کی تمام صفات کو انسان کی فطرت اور اس کا خاصہ ثابت کر دکھایا۔ بندگیٔ نفس اور خواہشات کی غلامی کے جواز میں دلائل

فراہم کیے تاکہ انسان کے اندر سے ضمیر نام کا وہ کانٹا نکل جائے جو معصیت کے ارتکاب پر خلش پیدا کرتا ہے اور شہوت پرستی کے لیے اس کا دل اس طرح کھل جائے جیسے وہ کارِ ثواب انجام دے رہا ہو۔ چنانچہ اب وہ پورے شرح صدر کے ساتھ تہذیب و تمدن کا ایسا نقشہ بنانے میں مصروف ہے جس کے ایک ایک نشان سے عیاشی اور صنفی خواہش نمایاں ہے تاکہ وہ دیکھے تو مناظر عیش دیکھے۔ اس کے کان آشنا ہوں تو نغمات کیف و طرب سے، اور فکر و دماغ کی قوتیں صرف ہوں تو تکمیلِ خواہشات کی راہ میں عورت اور مرد کا آزادانہ اختلاط، فحش لٹریچر، اخلاق فروش تعلیم، عریاں تصاویر، گندے سینما، نشہ آور چیزوں کا استعمال، غرض شہوانیت کی آگ کو بھڑکانے والا وہ کونسا ذریعہ ہے جسے موجودہ انسان نے اختیار نہ کیا ہو؟

ہفت روزہ "ایشیا" لاہور کے نامہ نگار خصوصی مقیم لندن کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"صبح سویرے آنکھ کھلنے پر وہ (طالب علم) کھڑکی کے پاس لگی ہوئی سینگی ———————— میں منہ دھونے کے لیے جاتا ہے تو نیچے سڑک پر عورتیں گروہ در گروہ جاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جب وہ ناشتہ کر کے کالج جانے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے تو جھاڑ پونچھ کرنے والی خادمہ آ دھمکتی ہے۔ کسی مکان میں بوڑھی خادمہ ہوتی ہے لیکن کسی میں بالکل نوجوان اور بدکردار دفتر جانے کا وقت ہے، ٹکٹ کے لیے قطاریں لگ رہی ہیں، وہ بھی ایک قطار میں کھڑا ہے، قطار میں اس کے سامنے یا اس کے پیچھے ضرور عورت ہے یہاں غضِ بصر کا کیا سوال اجسام کو جدا رکھنا بھی کارنامہ ہے۔ لفٹ میں داخل ہوا، لفٹ اس طرح بھری جاتی ہے جس طرح ہمارے ہاں بھیڑ کے وقت

بسیں، بالکل ٹھسا ٹھس۔ یہاں اجسام علیحدہ رکھنے کا امکان ہی نہیں۔ یہاں سوال نگاہوں کا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں آدمی سامنے دیکھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سامنے والی کے چہرے کو گھورے، لہٰذا وہ لفٹ کی چھت کی طرف دیکھتا ہے، وہاں تجارتی اشتہارات ہیں۔ ہر اشتہار میں عورت نمایاں ہے اور خطرناک حد تک نمایاں، کئی ایک بڑے بڑے اور بہت جاذبِ نظر اشتہارات ہیں۔ یہ عورتوں کے اندرونی کپڑے بنانے والی دکانوں کے ہیں۔ کسی میں عورت کو صرف اس کے اندرونی کپڑوں میں دکھایا گیا ہے۔ کسی میں ان کپڑوں کو پہنتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ برہنگی بذاتِ خود فتنہ ہے لیکن ان میں برہنگی کو عظیم تر فتنہ بنا دیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ غریب جلدی سے اشتہارات سے نظریں ہٹا کر اپنے سامنے والی عورت کو ہی مجبوراً دیکھتا رہتا ہے۔ یہاں گاڑی میں بھی لفٹ والا معاملہ ہے نشستیں پُر ہیں ہجوم میں وہ بھی پھنسا کھڑا ہے۔ لیکن ہجوم میں زیادہ تر عورتیں، اور وہ خود کسی عورت پر اپنا بوجھ ڈالے کھڑا ہے۔ (کالج میں) ایک کرسی پر وہ جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں ہال بھر گیا اس کے دونوں طرف نہیں تو کم از کم ایک طرف کوئی لڑکی آن بیٹھتی ہے۔ شانہ سے شانہ مل رہا ہے۔ کبھی ٹانگیں لڑ رہی ہیں، کبھی بازو ٹکرا رہے ہیں اور شانے رگڑ رہے چھل رہے ہیں" ۲۸ / مارچ ۱۹۵۷ء۔

(گزشتہ دنوں اٹلی کی ایک عدالت میں ایک عورت اس الزام میں پیش ہوئی کہ وہ صرف زیر جامہ پہن کر سڑکوں میں پھرتی ہے، عدالت نے اسے یہ کہہ کر بری کر دیا کہ ایک خوبصورت عورت کا برہنہ جسم کسی خرابی کا باعث نہیں۔

”نیویارک ٹائمز“ کے ایڈیٹر جاپان کے دورے پر گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر انہوں نے اپنے دورے کے تاثرات شائع کیے ہیں۔ ”دنیا کا ٹوہلاں شہر ٹوکیو“ کے عنوان کے تحت انہوں نے لکھا ہے:-

”مجھے ایک جاپانی اخبار نویس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔
وہاں جس حادثے سے دوچار ہوا اس سے مجھے خاصی پریشانی ہوئی۔
میں گھنٹی بجا کر دروازے پر کھڑا اندر سے آنے والے کا منتظر تھا۔
کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خاتون بھیگے ہوئے بالوں کے ساتھ بالکل
مادر زاد برہنہ آموجود ہوئیں۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ وہ جرنلسٹ
گھر پر نہیں ہیں اور یہ خاتون ان کی بیوی ہیں جو نہاتے نہاتے
ہوئے اٹھ کر انہیں یہ بتانے آئی تھیں۔“
اپنے اسی مضمون میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:-

”رات میں ایک دعوت پر جانے کا اتفاق ہوا۔ عام طور
جاپانی میزبان اپنے مہمان کو اعلیٰ قسم کے ہوٹلوں ہی میں مدعو
کرتے ہیں، لیکن اس میزبان نے مجھے خلاف معمول گھر پر
مدعو کیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو ناچ گانا شروع ہوا جس کا
اہتمام میزبان نے کر رکھا تھا۔ مہمانوں میں ایک صاحب شراب
سے زیادہ بہک گئے۔ حاضرین میں سے اٹھ کر ایک لڑکی کے
ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا اور پھر جب ان صاحب نے اس
لڑکی کے ایک ایک کر کے کپڑے اتار کر اسے برہنہ کر دیا تو ان
صاحب کی اس حرکت پر میزبان اور مہمانوں کا مارے ہنسی کے
برا حال تھا۔“

اب تو اس عریانی اور آزادانہ اختلاط کی وبا عبادت گاہوں تک گھس گئی ہے جنوبی روڈیشیا کے ایک گاؤں کے متعلق خبر ہے کہ وہاں کے ایک

گرجا گھروں میں برادرانہ محبت کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایک افسوسناک طریقے سے کام لیا جا رہا ہے وہ یہ کہ عبادت شروع ہونے سے پہلے تمام مرد عبادت گاہ میں موجود عورتوں سے بغل گیر ہو کر آپس میں پیار کرتے ہیں۔ تھوڑے سے دنوں میں نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جس عبادت گاہ میں مردوں کی تعداد تین چار سے زیادہ کبھی نہ ہوتی تھی۔ اب اس میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ چرچ کے منتظمین کو عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ کئی ایک اور کمرے بنانے پڑے ہیں۔

اب موجودہ اخلاق سوز سینماؤں کا حال ایک پورے کمیشن کی زبانی سنئیے جس کو حکومت امریکہ نے اپنے ملک میں جرائم کی روک تھام کے لیے مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ جنسی جرائم، زنا بالجبر، اغوا، رقابت میں قتل، امراض خبیثہ اور مار دھاڑ کا بہت بڑا سبب وہ فلمیں ہیں جو "ہالی وڈ" میں تیار کی جاتی ہیں۔ کمیشن نے مزید کہا ہے کہ اگر ان فلموں پر کڑا احتساب نہ کیا گیا تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ سارا امریکہ غنڈوں، قاتلوں، زانیوں اور ڈاکوؤں کی بستی بن جائے گا۔ کمیشن نے کہا ہے کہ ان فلموں کی وجہ سے ڈاکو ہمارے نوجوانوں کے ہیرو بن رہے ہیں۔ نوجوان طبقے نے نہایت شوق سے ڈاکوؤں کے لباس کو پہننا شروع کر دیا ہے۔ اغوا اور زنا بالجبر مردانگی کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ لڑکیاں اسکولوں اور کالجوں سے والدین کو اطلاع دیئے بغیر بھاگ جاتی ہیں۔ کمیشن کو اس بات کا بے حد رنج ہے کہ امریکی کردار جو کبھی ساری دنیا کے لیے "قابل تقلید تھا آج پستی اور ابتذال کی انتہائی حد کو پہنچ چکا ہے۔

فحش نگاری تو اب یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ قانون کے ذریعہ بھی اس کی اصلاح دشوار ہوتی جا رہی ہے۔

جولائی ۱۹۵۷ء کی خبر ہے کہ فلو زنڈا (امریکہ) کی سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا تھا کہ امریکی آئین فحش نگاری کی اجازت نہیں دیتا۔ اس فیصلہ پر نکتہ چینی

کرتے ہوئے امریکہ کے ایک فحش نگار مصنف (فلاویلی) نے لکھا ہے کہ فحاشی پسند امریکہ میں قانون، فحش نگاری کو نہیں روک سکتا۔ مصنف نے کہا ہے کہ امریکی قوم فحش مذاق کے منظر میں پروان چڑھی ہے۔ لہذا فحاشی پر پابندیاں مذاق بن کر رہ گئی ہیں۔ امریکی قوم سب سے زیادہ مسائل میں الجھی ہوئی ہے اور سب سے زیادہ جنسیات سے ڈرتی ہے۔ اور اس سے لذت اندوز بھی ہوتی ہے۔ مصنف فلاویلی نے کہا ہے کہ مختصراً ہم ایک فحش قوم ہیں۔ یہ سمجھنا کہ ہم سزا کے ذریعہ فحاشی کو روک سکتے ہیں جسے پڑھ کر پارساؤں کے جنسی جذبات بھڑک اٹھتے ہیں (انتہائی سادہ لوحی ہے)

منشیات کا استعمال اس قدر بڑھ گیا ہے کہ فرانس میں شراب نوشی کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۲۲ فی صدی فرانسیسی مرد اور ۶۰ فی صدی عورتیں محض شراب استعمال کرتی ہیں اس کے برعکس ۸۲ فی صدی مرد اور ۶۰ فی صدی عورتیں محض شراب استعمال کرتی ہیں۔ محض شراب استعمال کرنے والوں کے علاوہ کچھ مردوں اور عورتوں کی تعداد ایسی بھی ہے جو شراب اور پانی ملا کر پیتی ہے۔ ان میں ۹ فی صدی عورتیں اور ۴ فی صدی مرد شامل ہیں۔ کمیٹی نے کہا ہے کہ گزشتہ دس سال میں کثرت مے نوشی سے مرنے والوں کی تعداد میں بارہ گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

شراب کی پیداوار کا یہ حال ہے کہ امریکہ میں اسکاچ وسکی تیار کرنے والے مختلف کارخانوں میں مارچ کے آخر تک ۲۴ کروڑ تیس لاکھ گیلن وسکی کا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا اور اس کی فروخت نے تمام سابقہ ریکارڈ مات کر دیئے تھے موجودہ اسٹاک آئندہ دس سالوں کی کھپت کے لیے کافی ہے۔ سکاچ وسکی کی پوری صنعت نے ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو ختم ہونے والے سال میں ۲ کروڑ ۷۵ لاکھ اسی ہزار گیلن وسکی فروخت کی۔ یہ ایک برس قبل کی فروخت سے ایک لاکھ ساٹھ ہزار گیلن زیادہ ہے۔ اس میں ۷۰ لاکھ پچاس ہزار گیلن شراب دیگر ملکوں کو برآمد کی

گئی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ امریکہ میں وسکی کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔

مغربی جرمنی کے ایک شراب خانے کے مالک کے متعلق خبر ہے کہ وہ ہر سال اپنی سالگرہ کے موقع پر بیئر شراب کا ایک چشمہ جاری کرتا ہے جس سے ۱۸ سال سے اوپر ہر ایک مرد اور عورت کو مفت شراب پینے کی اجازت ہوتی ہے۔ چنانچہ گذشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی اس نے شراب کا چشمہ پر کروایا۔ یہ چشمہ متواتر سات گھنٹوں تک چلتا رہا اور تقریباً ۲۵۰۰۰ ہزار اشخاص (مرد و زن) نے اس چشمے سے مفت شراب پی۔ بتایا گیا کہ محکمہ ڈاک وتار نے اس خاص موقع کے لیے یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیے جن پر اس چشمے کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

یہ وہی شراب ہے جس کے متعلق انسداد مے نوشی کے بین الاقوامی ادارے کے صدر ڈاکٹر رابرٹ پیرس نے کہا ہے کہ شہوانی جرائم ۵۰ سے ۷۵ فی صدی تک شراب نوشی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

اس شراب پر صرف برطانیہ میں سالانہ ۱۲½ ارب روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اتنا روپیہ وہاں کے بہت سے اہم تعمیری کاموں میں بھی صرف نہیں ہوتا۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عیاشی اور بہیمیت کی پرورش کے بے شمار ساز و سامان پر کتنی دولت ضائع جاتی ہوگی۔ اگر کوئی قوم اس کو ملکی ترقی اور خوش حالی لگائے تو ملک کو چین اور راحت کا گہوارہ بنا سکتی ہے۔

اس ہیجان خیز اور شہوت انگیز ماحول میں کسی کا اپنے جذبات پر قابو رکھنا انتہائی دشوار ہے۔ چنانچہ یہی ہو رہا ہے کہ اس تہذیب کا پالا ہوا انسان حیوانوں کی طرح ان حدود و قیود کو توڑتا جا رہا ہے جو شہوت پرستی کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔

پیرس کے متعلق چند سال قبل ڈیلی مرر نے لکھا تھا کہ پیرس میں ۹۰ سے ۹۵ فی صدی شادیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں فریقین کے مابین قبل از نکاح تعلقات پیدا ہو چکے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں فرانس کے میڈیکل بورڈ نے اس سے بھی آگے بڑھ کر پورے فرانس کے بارے میں اعلان کیا کہ اس کی گودی میں ایک بھی باعصمت عورت نہیں اور اہلِ فرانس کو اس بات پر فخر ہے۔

فرانس کو فخر کے لیے بس اتنی سی بات حاصل نہیں ہے اس کی گودی میں کوئی باعصمت عورت نہیں بلکہ اس کے سرِ افتخار کو بلند رکھنے کے لیے ایک مستقل طبقہ موجود ہے جس کا مقصد ہی فرانس کی عزت کو دوبالا کرنا اور اس کی امامت کو باقی رکھنا ہے۔

اس طبقے کا حال ایک سینتالیس سالہ جج مارشل سیکوٹ نے جو دس سال تک پولیس کے محکمۂ تفتیش کے نائب صدر بھی رہ چکے ہیں اپنی ایک تازہ ترین کتاب "عصمت فروشی" میں لکھا ہے:-

"پیرس میں شام ہوتے ہی آٹھ ہزار عصمت فروش عورتیں اپنے ہوٹلوں یا مکانوں سے نکل کر اپنا کاروبار شروع کر دیتی ہیں اور دوپہر سے ہی دو ہزار عورتیں سڑکوں پر امنڈ آتی ہیں۔ ہر رات ان دس ہزار عورتوں کو تقریباً پچاس ہزار گاہک ملتے ہیں۔ ہر سیاح انہیں بوشن ڈی بولون کے پارکوں میں موٹر اس کی دھندلی روشنی میں اور موٹمار نبطر پیرس کے ویسٹ اینڈ کے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں پاتا ہے"

اب ذرا برطانیہ کا حال دیکھیے:-

پولیس کمشنر سرجان نائٹ بورو نے ۱۹۵۶ء کے متعلق ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ زنا بالجبر کے جتنے واقعات اس سال ہوئے اتنے جنگ کے بعد سے اب تک کسی سال میں نہیں ہوئے تھے ۱۹۳۸ء میں اس سلسلے میں جتنے واقعات ہوئے تھے گزشتہ سال ان سے تگنے سے بھی ۲۵ واقعات زیادہ

یہ ستمبر ۱۹۵۷ء کو پندرہ ممبروں کی ایک کمیٹی سے جس میں بیرسٹر، ڈاکٹر، پادری اور تین خاتونیں شامل تھیں اور جس کے صدر ایڈنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سرجان وولفنڈن تھے، تین سال کے بعد اپنی ضخیم رپورٹ برطانیہ کی اخلاقی حالت پر شائع کی بیسوائی اس کمیٹی کے نزدیک ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور بیسوائیں صرف ایک طبعی مانگ یا طلب کو پورا کر رہی ہیں۔ اس کے نزدیک بیسوائی کی محرکات میں طمعِ زر بھی شامل ہے۔ لیکن بہرحال لڑکیاں اور عورتیں اس پیشے میں اپنے پورے ارادے ہی سے داخل ہوتی ہیں۔

مردوں کے باہمی تعلقات کی کثرت کو دیکھ کر کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ بالغ مردوں کے درمیان لواطت اگر باہمی رضامندی سے ہو تو اب اسے کوئی جرم نہ قرار دیا جائے اس لیے کہ شہریوں کی نجی زندگی میں قانون کو دخل دینے کی حاجت نہیں۔

اسی سال ۱۹۶۰ء میں برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ برطانیہ میں ہر تین عورتوں میں ایک عورت ایسی موجود ہے جسے خود یہ اقرار ہے کہ شادی ہونے سے پہلے اس کے جنسی تعلقات رہ چکے ہیں۔ برطانیہ میں ہر بیس بچوں میں ایک بچہ ناجائز اولاد ہوتا ہے۔ ایسے بہت سے واقعات درج کرنے کے بعد رپورٹ کا ایک مرتب ڈاکٹر چیسر یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا اس زمانے میں عصمت دور انکار اور فرسودہ شے بن چکی ہے؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے۔ اس میں تو خیر مجھے شک ہے مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم اسی منزل کی طرف جا رہے ہیں ـــــ ویسے فطرت کو عصمت سے کوئی مطلب بھی نہیں ہے اسے تو سلسلہ تولید سے غرض ہے۔ سچی اور کھری عصمت تو ہمارے باطن سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں یہ اختیار حاصل ہے کہ ہم جو راستہ چاہیں اختیار کرلیں۔"

جنسی لذت دنیا کی بہت سی لذتوں سے زیادہ پُرکیف اور پُرکشش ہوتی ہے۔ اس لذت سے انسان کو عفت وعصمت کا تصور ہی باز رکھ سکتا ہے۔ اس تصور کے فرسودہ قرار پانے کے بعد جنسی داعیات آدمی کے فکرو خیال اور سعی وجہد پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ اس کو جنسی تسکین کے علاوہ اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں اسی لذت کی تلاش میں صرف ہونے لگتی ہیں۔ چنانچہ خود اس شہوت پرست تہذیب کے علمبرداروں کو اعتراف ہو چلا ہے کہ اب ان کی توجہ زندگی کے حقیقی مسائل سے ہٹتی جا رہی ہے۔ لذت پسندی، مزاج اور طبیعت کا جزو بن گئی ہے اور ایسے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی جو دقت طلب اور توجہ کے چاہنے والے ہیں۔ جفاکشی، محنت طلبی، صبرو استقلال جیسی اعلیٰ صفات جن کے ذریعہ انہوں نے عزت و سربلندی حاصل کی تھی اب ایک ایک کرکے ان سے رخصت ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر الیکسس کارل اپنی کتاب میں رقمطراز ہے:-

"مشینی ایجادات میں اضافہ کر دینے سے حالات کو کچھ بھی بہتر نہیں بنایا جاسکتا۔ اسی طرح اس معاملے میں طبیعات، فلکیات اور کیمیا کے اکتشافات کو بھی اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ آدمی کو اب توجہ خود اپنے اوپر اور اپنی ذہنی اور اخلاقی نااہلیت پر منعطف کرنی چاہیئے۔ اپنے تمدن میں لذت، تعیش، جمالیت، وسعت اور پیچیدگیاں بڑھاتے چلے جانے سے کیا حاصل جب کہ اس تمدن کو اپنے حقیقی مفاد کے رخ پر لے جانے میں خود ہماری اپنی کمزوریاں مانع ہو رہی ہیں۔ درحقیقت یہ کوئی مفید صورت نہیں ہے کہ ایک ایسے طریق زندگی کے بنانے پر دیدہ ریزی کی جائے جو اخلاقی زوال کا اور عظیم نسلوں کے صالح ترین

عناصر کے خاتمے کا موجب ہو رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیز رفتار کے بحری جہاز زیادہ آرام دہ گاڑیاں سستے ریڈیو اور بعید تر سیاروں کا مشاہدہ کرنے کے لیے دوربینیں بنانے چلے جانے سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ ہم اپنے اوپر زیادہ توجہ صرف کریں۔"

اخلاقی حس کو جدید معاشرے نے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم نے اس کے مظاہر کو دفعتہً ہر طرف سے دبا دیا ہے۔ غیر ذمہ دارانہ پن سب کی رگوں میں خوب رچ بس گیا ہے۔ وہ لوگ جو بھلے اور برے میں تمیز کرتے ہیں، جو مشقت کرتے ہیں، جو دوراندیش ہیں وہ بے چارگی میں مبتلا رہتے ہیں اور اس طرح دیکھے جاتے ہیں جیسے وہ حقیر ہوں۔ اگر کوئی عورت جو متعدد بچے رکھتی ہے ذاتی مستقبل بنانے کے بجائے اپنے بچوں پر توجہ صرف کرتی ہے تو پست دماغ شمار ہوتی ہے۔ ہم جنسی اور زنا پورے زوروں پر ہے اور جنسی اخلاقیات بالکل بالائے طاق رکھ دیئے گئے۔ نفسیاتی تجزیہ کار مردوں اور عورتوں کے ازدواجی روابط کے نگران ہیں، غلط اور صحیح، حق اور ناحق کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رہا۔ جرائم پیشہ لوگ عام آبادی کے درمیان آزادی سے پنپ رہے ہیں اور کوئی ان کی موجودگی پر اعتراض اٹھانے والا نہیں۔"

اس اخلاقی زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے علم طبیعیات کی ایک ماہر خاتون مسز ڈیسن کہتی ہیں

"ہماری تہذیب کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ اس کی بنیادوں میں ضعف آگیا ہے اور اس کے شہتیر ہل رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ ساری عمارت کب پیوند خاک ہو جائے ؟ ہم گزشتہ

کئی سال سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ نظم و ضبط کی پابندیاں اختیار کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ اس کے بقا کی بس ایک ہی صورت باقی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول پر پابندی عائد کی جائے کیونکہ اس تہذیب کے لوگوں کی تمام تر توجہات آزاد جنسی تعلقات، قحبہ گری اور عصمت فروشی مختصر یہ کہ جنسی خواہشوں پر مرتکز ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس لیے ان کی سازی تعمیری صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ اس معاملے میں اور بھی طرح طرح کی بے اعتدالیاں دیکھنے میں آتی ہیں جیسے مردوں اور عورتوں کا خود اپنے ہی ہم جنسوں کی طرف مائل ہونا، انسانی صلاحیتوں کا یہ زیاں بڑا ہی تشویشناک ہے۔

جنسی تعلقات کی یہ نوعیت اور اس کے ان بدترین آثار و نتائج کو دیکھ کر ہمارے ذہنوں میں یہ سوال ابھر آتا ہے کہ آیا یہ ہماری تہذیب کے ملیامیٹ ہونے کے شواہد ہیں یا اسباب۔ میری یہ رائے ہے کہ یہ رائے ہے کہ یہ آثار و شواہد بھی ہیں اور اسباب بھی۔"

پروفیسر پیٹریم سارو کن اپنی کتاب "امریکی جنسی انقلاب" مطبوعہ ۴ جنوری ۱۹۵۷ء میں فرماتے ہیں:۔

"امریکہ والے جنسی انارکی کی طرف دوڑے جا رہے ہیں جو زوال کی علامت ہے۔ جس طرح قدیم یونان و روما میں گزر چکا ہے" پروفیسر کے الفاظ ہیں کہ "جنس کے سیلاب عظیم نے ہمیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ہماری تہذیب کے ہر شعبے میں ہماری معاشرتی زندگی کے ہر ہر خانے میں وہ گھس آیا ہے۔ موصوف یہ بھی کہتے ہیں کہ امریکہ کی سیاسی زندگی تک شہوانیت

کی لہروں کی مدّ میں آچکی ہے اور جنسی رشوت اور جنسی استحصال بالجبر ایسے ہی
عام ہو چکے ہیں جیسے مالی رشوتیں۔ موصوف کے بقول جنسی بدنامی
والی شخصیتیں اور ان چھو سفارتی عہدوں پر ہیں اور عیاش لوگ کہیں
بلدی افسر ہیں کہیں وزیر سلطنت اور کہیں سیاسی پارٹی کے لیڈر۔ ہمارے
پبلک حکام میں بڑی کثرت سے آوارہ منش لوگ موجود ہیں۔ فطری اور
غیر فطری دونوں قسم کی عیاشیوں میں مبتلا۔ طلاق کے روز افزوں اعداد
شہوانی جرائم میں اضافہ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور ادب و اشتہار،
ہر شعبے میں جنس کا زور و شور امریکیوں کے حق میں تباہی کا پیش خیمہ ہے۔
اب ہمارا ماحول ایسا ہو گیا ہے جو برہنگی یا نیم عریانی سے بھرا ہوا ہے
یہاں تک کہ تجارتی اشتہاروں میں بھی شہوانیت کی آمیزش لازمی ہو
گئی ہے اور ہمارے تمدن میں جنس ایسی رچ بس گئی ہے کہ امریکی
زندگی کے ہر مُو سے ٹپکنے لگی ہے۔"

اب آپ ایک شہوت پرست انسان کے طبعی و نفسیاتی حالات کا جائزہ لیجیے
اور دیکھیے کہ وہ کس طرح مہلک اور تباہ کن جراثیم کی اپنے اندر پرورش کرتا رہتا ہے۔

(۱) شہوت پرستی کا پہلا اثر تو انسان کی جسمانی توانائی اور قوت پر پڑتا ہے۔ قدرت
نے انسان کو کچھ قوتیں عطا کی ہیں۔ یہ قوتیں لامحدود نہیں بلکہ محدود ہیں۔ ان قوتوں کے
مسرفانہ استعمال سے اس کی توانائیوں کا گھٹ جانا لازمی ہے۔

شہوانی قوت انسان کی توانائی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اتنا بڑا ذریعہ کہ
اس سے بہت سے نئے وجود جنم پا سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی اس قوت کو ضائع
کرتا ہے تو اپنے اندر سے اتنی بڑی قوت نکال پھینکتا ہے جو اس جیسی کئی ایک
زندگیوں کا باعث بن سکتی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غلط طریقہ پر شہوت رانی
انسان کی طبعی قوتوں کو کس قدر تباہ کرتی ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ہر طرح کا
جسمانی اختلال آج تک یقینی سمجھا جاتا ہے۔

(۲) اس کا دوسرا نتیجہ نسلِ انسانی سے غفلت ہے۔ آدمی کا جو مطمحِ نظر ہوتا ہے اسی سے اس کو دلچسپی ہوتی ہے اور اسی کے لیے وہ اپنا وقت اور صلاحیت صرف بھی کرتا ہے۔ اگر وہ عیاش ہے تو اس کی زندگی کا مرکزی نقطہ عیش و عشرت ہی ہوگا۔ اسی کے لیے اس کی تگ و دَو اور جد و جہد ہوگی، اس کی گفتگو، اس کا فکر و عمل، اس کی صحبتیں، اس کی وضع قطع، اس کا لباس، اس کی معاشرت، غرض ہر چیز اسی مقصد کے اطراف پر گھومے گی اور عیش پرستی اس کے دل و دماغ پر اس قدر چھا جائے گی کہ ممکن نہیں کہ وہ بچے کی ساخت و پرداخت کے لیے اپنی عیاشی کو قربان کر دے اور ایک لمبے عرصے تک ہر قسم کی زحمتیں اور تکلیفیں برداشت کرتا رہے۔ اس کی تو مسلسل یہی کوشش ہوگی کہ عیش و لذت میں مخل ہونے والی اس مخلوق سے کسی نہ کسی طرح نجات مل جائے۔

الکزس کیرل لکھتا ہے :-

"بہترین ترقی یافتہ قوموں کے اندر افزائشِ نسل کی رفتار گر رہی ہے اور نئی نسل کے حاصل گھٹیا ہیں۔ عورتیں برضا و رغبت الکوہل اور تمباکو کے ذریعہ اپنے آپ کو گھلا رہی ہیں۔ وہ اپنے بدن کو زوائد نزاکت سے آراستہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو نہایت خطرناک غذائی پابندیوں کے حوالے کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بچے ہونے کے خلاف ہیں۔ یہ مفاسد نتیجہ ہیں ان کی تعلیم کا، تحریک نسواں کی ترقی کا اور کوتاہ نظر خود غرضی کا۔"

(۳) اس خود غرضی کی انتہا یہ ہے کہ ماں جسے رافت و محبت کا پیکر سمجھا جاتا تھا، ضبطِ ولادت کے نام پر اپنی اولاد کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ اسقاط تو اب گویا کوئی عیب ہی نہیں رہا۔ اس قومی خدمت کے لیے ڈاکٹروں کی خدمات ہر وقت موجود ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی بدنصیب اولاد بچ جائے تو سڑکوں، اسپتالوں میں اپنی گود خالی کر کے آگے بڑھ جانے میں عیاش ماں کو کوئی عار

محسوس نہیں کرتی اور موجودہ عیش پرور تہذیب ہے کہ اس سنگ دلی کو جرم قرار دینے کے بجائے اس کو سوسائٹی کا فطری مسئلہ قرار دے کر مختلف طریقوں سے اسے حل کرنے میں مصروف ہے۔

"ایسوشی ایٹڈ پریس آف امریکہ کی رپورٹ کے مطابق ہر سال دو لاکھ سے زیادہ تعداد میں ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں۔ ناجائز پیدائش کی اس رفتار پر قابو پانے کے لیے بعض فرقوں اور اکثر حکام میں یہ تجویز ہے کہ مسلمہ راستوں سے بے راہ ہونے والی تمام عورتوں کو مکمل طور پر بانجھ بنا دیا جائے۔ بعض حلقوں میں یہ تجویز زیر بحث ہے کہ ایک سے زیادہ ناجائز بچے کرنے والی ماؤں کی امداد کی رقم کم کر دی جائے۔

"واشنگٹن ڈی سی میں غیر شادی شدہ دس بچوں کی ماں کو ۹ بچوں کی پرورش کے لیے سرکاری فنڈ سے امداد دی جاتی ہے۔ دوسری طرف عمرانیات کے ماہر اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ان نوجوان عورتوں کی جو شادی کے بغیر بچے پیدا کرتی ہیں، ذلت، گناہ، خوف و ہراس کو دور کرنے اور ان کی پریشانیوں کے مداوا کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔ بچوں بیورو کی چیف، مسز کیتھرائن بی مشنگر کی رائے کے مطابق غیر شادی شدہ مائیں جس بحران سے دوچار ہیں تعزیر میں اس کا کوئی حل نہیں ہے۔"

کہا یہ جاتا ہے کہ نسلِ انسانی سے غفلت کا سوال اس وقت تک ہے جب تک کہ اس کی نگہداشت اور تربیت کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اگر حکومت اس میں کامیاب ہو جاتی ہے تو انسانیت کے ساتھ اس سے زیادہ بھلائی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ حکومت بے شمار ذرائع و وسائل کی مالک ہے۔ وہ بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا جیسا انتظام کر سکتی ہے اس کا عشر عشیر

بھی خوشحال سے خوشحال والدین کے لیے ممکن نہیں کتنے ایسے افراد ہیں جو
خود ہی نانِ شبینہ کے محتاج ہیں وہ اپنی اولاد کی خواہ وہ کتنی ہی ذہین وفطین اور
قابل ہی کیوں نہ ہو کیا انتظام کر سکتے ہیں ؟ حکومت یہ طاقت رکھتی ہے کہ ان کو
مفلسی ونا داری کا شکار ہونے سے بچالے اور ان کی صلاحیتوں کو نشوونما دے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انسانیت کے ساتھ خیرخواہی اور بھلائی نہیں
بلکہ وہ انتہائی ظلم وزیادتی ہے جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ انسان کوئی پتھر
نہیں کہ سنگ تراش اپنی صناعی کے زور سے اس کی کوئی حسین مورتی تیار کرلے
بلکہ وہ جذبات واحساسات اور عقل وشعور کا مجموعہ ہے۔ کسی انسانی جان کی
پرورش اور اس کے اخلاق کی تعمیر وہی شخص کر سکتا ہے جو اس کے جذبات
کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے جو اس کی خوشی اور غم کو تحلیل کر دے
یہ جذبہ ان ہی افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے اس کو ولادت و پرورش میں ہزار ہا مصیبتیں
سہی ہیں اور بچہ جن کے جسم وجان کا ایک جزو ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص ان مراحل
سے نہ گزرے اور جس کو سوائے اس کے کچھ احساس نہ ہو کہ گوشت پوست
کا ایک لوتھڑا اس کے حوالے کر دیا گیا ہے وہ یہ جذبات کہاں سے لائے گا!
بچہ کو دایہ دودھ تو پلا سکتی ہے لیکن اس کے بس میں نہیں کہ ان پاکیزہ جذبات
کو بھی بچے کے حلق کے نیچے اتار دے جن کا مخزن صرف ماں کا سینہ ہوتا ہے
بلاشبہ حکومت اس کی سرپرستی کر سکتی ہے لیکن اس کے پاس وہ دستِ شفقت
نہیں ہے جسے قدرت نے باپ کے علاوہ اور کسی کو نہیں عطا کیا ہے۔ ماں
اپنے بچے کو صرف دودھ ہی نہیں پلاتی بلکہ ان جذبات کو بھی اتارتی ہے
جن کی وجہ سے ایک ناتواں وبے کس جان زندہ رہتی اور نشوونما پاتی ہے۔
اس کی لوریاں بچے کی نیند ہی کا سبب نہیں ہوتیں بلکہ عداوت ونفرت اور
کینہ وکدورت کے لیے موت کا پیغام ہوتی ہیں۔ باپ کی خشمگیں نگاہ اولاد
کو اطاعت وفرمانبرداری کا جو درس دیتی ہے قانون کے ہزارہا صفحات

اس کی طاقت نہیں رکھتے۔

(۴) قطع نظر اس سے کہ حکومت ماں باپ کا بدل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ آپ ان ماں باپ کے ذہن کا جائزہ لیجئے جو اپنا بوجھ معاشرے کے سر تھوپ کر الگ ہونا چاہتے ہیں۔ جو اپنی عیاشی کو اس لیے باقی رکھے ہوئے ہیں کہ انہیں اس کا بھگتان بھگتنا نہ پڑے گا۔ کیا ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے وقت، قوت اور صلاحیت کو قربان کریں گے۔ جو شخص معاشرے کی ڈھیل اور رعایت سے فائدہ اٹھانے میں شب و روز مصروف ہو کیا وہ معاشرے کو مضبوط بنانے کے لیے بھی کوشش کرے گا!

(۵) عیش پرست ذہن آدمی کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ جس سے حظِ نفس اٹھاتا ہے، جس کے جذبات سے آسودگی حاصل کرتا ہے اس کی مشکلات اور دکھ درد میں شریک ہو۔ وہ جس کو اپنی ناپاک خواہشات کا آلۂ کار بناتا ہے اسی سے صرفِ نظر کرنے لگتا ہے۔ وہ بھونرے کی طرح جب تک پھول میں رس ہے چوستا ہے اور جب خشک ہو جائے تو دوسرے کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔

چنانچہ اس ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ جنسی تعلقات میں کوئی استواری اور استحکام نہیں رہا۔ اس تعلق کے معنی ہمیشہ سے یہ سمجھے جاتے تھے کہ دو افراد نے باہمی الفت و محبت کا عہد باندھا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے غمگسار اور شریک رنج و راحت ہوں گے۔ ان کی زندگی وفاداری اور ہمدردی کی زندگی ہوگی۔ لیکن اب یہ تصور دھندلا پڑتا جا رہا ہے اور جنسی تعلق وقتی آسودگی کا ذریعہ بن گیا ہے۔ جب مقصد صرف تسکینِ نفس ہی ٹھہرا تو کیوں کوئی کسی ایک ہی کے ذریعہ کا پابند ہو جائے اور ہر طرح کی ناگواریوں اور تلخیوں کے باوجود اس پر قانع رہے! نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ :-

"امریکہ میں زیادہ سگریٹ پینے والے کی بیوی کو طلاق دے دی جاتی ہے۔ ایسے خاوند سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بیوی عدالت طلاق کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے جو شراب زیادہ پیتا ہے، اور ایسی بیوی بھی خاوند سے طلاق حاصل کر لیتی ہے جس کا خاوند روزانہ گھر لیٹ آتا ہے۔ ایک برطانوی بیوی نے عدالت سے شکایت کی ہے کہ اس کا خاوند اس کے چہرے پر سگریٹ کا دھواں پھینکتا ہے۔ میں کئی بار اسے منع کر چکی ہوں مگر میرے پروٹسٹ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس لیے مجھے اس سے الگ ہونے کی اجازت دی جائے۔ اور اب لاس اینجلز میں طلاق کا نہایت دلچسپ واقعہ ظہور میں آیا ہے۔ ایک نوجوان خوبصورت درمیانہ قد عورت نے عدالت میں بیان دیا ہے کہ میرا شوہر قمیص اور جوتے نہیں پہنتا لہذا میرا اس کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ امریکی عدالت کو بیوی کی اس دلیل میں بہت وزن نظر آیا اور اس نے شوہر سے طلاق دلا دی ہے۔ لندن کی ایک عدالت میں اس سے بھی نرالا اور دلچسپ مقدمہ پیش ہوا۔ خاوند نے بیوی کے خلاف یہ درخواست دی کہ وہ میرا انتظار کیے بغیر شام کا کھانا کھا لیتی ہے اور میں کئی بار بیوی سے اس کی اس عادت کے خلاف شکایت کر چکا ہوں بلکہ ایک دو بار میں نے اسے دھمکی بھی دی ہے کہ اگر وہ شام کا کھانا میرے ساتھ نہیں کھائے گی تو میں اسے طلاق دے دوں گا مگر میری دھمکیوں کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لہذا مجھے اس سے علیحدہ ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ خاوند کو بیوی کے اس سنگین جرم کی پاداش میں طلاق دینے کی اجازت دے دی گئی ہے۔"

ایک پاکستانی ایڈیٹر صاحب جنہوں نے ۱۹۵۴ء میں امریکہ کی سیاحت کی تحریر فرماتے ہیں:-

"ایک وکیل صاحب جو آج کل یہاں وکالت کرتے ہیں سات دفعہ یکے بعد دیگرے اپنی ایک ہی بیوی کو طلاق دے کر دوبارہ اس سے شادی کر چکے ہیں اور لطف یہ کہ ان کی یہ بیوی بھی وکالت کرتی ہے۔ اب پھر اس کو طلاق دے دی ہے۔"

(۷) بات اب صرف تفریق اور علیحدگی تک محدود نہیں رہی بلکہ ذوقِ تنوع نے اخلاق اور انسانیت کی تمام قدروں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور انسانوں کو جانوروں کی صف سے بھی نیچے گرا دیا ہے۔

۴۲ سالہ مسز فرانسین پیری مارٹن کو اپنے کو اس بنا پر قتل کرنے کے جرم میں دیکھنے گئی اور وہاں سے کئی نوجوان جن میں ایک چودہ سال کا لڑکا شامل تھا گھر بلا لائی۔ اُن لوگوں کے سامنے وہ برہنہ ہو کر ناچی۔

ایک عیاش مجرمہ کا جب اپنے شوہر سے جی بھر گیا تو اس کی نگاہ میں شوہر کی پانچ سالہ رفاقت کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی اور اس کو انتہائی بیدردی کے ساتھ قتل کر کے وہ اس طرح خوشی سے جھوم اٹھی جیسے کوئی کانٹا تھا جس کو اس نے نکال پھینکا ہو۔

پیری مارٹن کو تو اپنی اکتاہٹ کے مظاہرے کا موقع ملا لیکن امریکی فضائیہ کے ایک رکن رونالڈ ڈرین کو اپنی محبوبہ سے بے رغبتی کے اعلان کے بعد زندہ رہنے کی بھی اجازت نصیب نہیں ہوئی۔

رونالڈ ڈرین کی سولہ سالہ ٹلپنا سے ملاقات لوائرن کے مقام پر ایک ناچ گھر میں ہوئی۔ ۱۸ مہینے تک دونوں محبت کی پینگیں لڑاتے رہے اور پھر انہوں نے شادی کر لی۔ اس کے بعد ڈرین اپنی بیوی کو امریکہ لایا اور وہاں ان کے یہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ دو سال بعد ڈرین انگلینڈ میں ایک امریکی اڈے میں

بھیج دیا گیا۔ فلیپنا اور ڈین کے درمیان تقریباً ایک برس تک خط و کتابت ہوتی رہی مگر پھر ڈین نے خط لکھنے چھوڑ دیئے۔ چار مہینے بعد وہ امریکہ آیا تو فلیپنا کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی مگر ڈین نے اسے بتایا کہ وہ اسے طلاق دینے آیا ہے۔ انگلینڈ میں ایک انگریز لڑکی سے اس کی دوستی ہو گئی ہے اور وہ حاملہ بھی ہو چکی ہے۔ فلیپنا کی نگاہ میں زمین و آسمان گھومنے لگے اس نے اس کی بڑی منت سماجت کی مگر ڈین کے سینے میں ایک ہی دل تھا جس پر ایک وقت میں ایک ہی دلربا کا قبضہ ہو سکتا تھا چنانچہ وہ طلاق کے فیصلے پر جما رہا چھ دن تک اس کشمکش کے بعد ہمسایوں نے رائفل چلنے کی آواز سنی اور انہوں نے تو ڈین خاک و خون میں غلطاں دم توڑ چکا تھا۔

(۷) اسی طرح ایک محبوب کے مختلف چاہنے والوں کے درمیان جذبہ رقابت کا ابھرنا بھی قدرتی ہے۔ جہاں ایک عورت دس مردوں کی منظور نظر ہو اور ایک مرد دس عورتوں کا محبوب تو لازماً کشمکش پیدا ہو گی اور ہر ایک اپنے محبوب کے دل پر قبضے کے لیے دوسرے کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔

قوتوں کا ضیاع، نسل انسانی سے غفلت اور لاپرواہی، صبر و ضبط کی کمی، جذباتیت کا غلبہ اور تسلط، ایثار و قربانی کے بجائے خود غرضی اور استحصال کا جذبہ، اتحاد و الفت کا خاتمہ اور انتشار و اختلاف کا فروغ۔ یہ ہیں شہوت پرستی کے عمومی نتائج جن کا آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ کہ یہ نتائج فرد اور قوم کی تباہی کا پیش خیمہ نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو ان قوموں کو تباہ ہو جانا چاہیے جن کے اندر جنسی انارکی پوری طرح جڑ پکڑ چکی ہے اور شہوانیت کے بغیر جن کی تہذیب کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آج وہی قومیں فکر و فن، علم و تہذیب اور سیاست و تمدن میں رہنمائی کر رہی ہیں جو شہوت پرست بھی ہیں۔ یہ ایک سوال ہے جو شہوت پرستی کے نتائج پر غور کرتے وقت ہمارے سامنے آ

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جو قومیں حکمرانی کر رہی ہیں ان کو یہ مقام اس وقت حاصل ہوا ہے جب کہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ ان کی جنسی خواہش پر چھایا ہوا تھا۔ لذت کشی کے بجائے وقت پسندی کا غلبہ تھا اور خواہشات پر ان کو اتنا کنٹرول تھا کہ وہ اپنی قوتوں کو تعمیری کاموں میں صرف کر رہی تھیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہر طرح کے اخلاقی عیوب سے پاک تھیں بلکہ کامیاب بنانے والی خوبیاں ان میں دوسری قوموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھیں اور اب بھی زیادہ ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس تہذیب کی خاطر وقت، قوت، صلاحیت اور جان و مال کی اتنی بڑی بڑی قربانیاں دیں کہ ان کی ماتحت اقوام اس کا تصور بھی مشکل ہی سے کر سکتی ہیں۔ اگر کوئی محنتی اور جفاکش انسان کوئی عمارت تعمیر کر لیتا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ حیرت و استعجاب تو اس وقت ہوگا جب کہ کسی کاہل اور سست آدمی کے ذریعہ یہ کام انجام پائے۔

لیکن موجودہ تہذیب بڑی تیزی سے اپنا مقام کھو رہی ہے، اور اس کے اندر تباہی کے جرثومے داخل ہو چکے ہیں جو اس کو موت کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

اسلام اور جنسی تعلقات

جنسی مسئلہ کو حل کرنے میں آج تک بڑے بڑے مفکرین ناکام رہے ہیں اگر وہ اخلاق و سیرت کی طرف متوجہ ہوئے تو جذبۂ شہوت ہی کو "معصیت اولیں" سمجھ بیٹھے اور اس جذبہ کو اہمیت دینے لگے تو اخلاق و سیرت کی دنیا تباہ کر دی۔

صرف اسلام ایک ایسا فلسفہ پیش کرنے میں کامیاب ہے جو جنسی مسائل کو بھی پوری طرح حل کرتا ہے اور اخلاقی اقدار کو بھی مجروح نہیں ہونے دیتا۔ جذبات و خواہشات کی غلامی سے بھی بچاتا ہے اور ان کی تسکین کے جائز اور فطری طریقوں کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔

جنسی مسئلہ سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو، ہم پانچ عنوانات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں:۔

(۱) خدا ترسی کے راہبانہ نقطۂ نظر کی تردید۔

(۲) جائز حدود میں جنسی تسکین کی تاکید۔

(۳) حرام کاری کی ممانعت۔

(۴) فرد کی تربیت، اور

(۵) معاشرہ کی اصلاح۔

خدا ترسی کا راہبانہ نقطۂ نظر

سینٹ پال اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"پس میں یہ چاہتا ہوں کہ تم بے فکر رہو۔ بے بیاہا شخص خداوند کی فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح خداوند کو راضی کرے۔ مگر بیاہا ہوا شخص دنیا کی فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح اپنی بیوی کو راضی کرے۔ بیاہی اور بے بیاہی میں بھی فرق ہے۔ بے بیاہی خداوند کی فکر میں رہتی ہے تاکہ اس کا جسم اور روح دونوں پاک ہوں۔ مگر بیاہی ہوئی عورت دنیا کی فکر میں رہتی ہے کہ کس طرح اپنے شوہر کو راضی کرے۔ یہ تمہارے فائدے کے لیے کہتا ہوں نہ کہ تمہیں پھنسانے کے لیے۔ بلکہ اس لیے کہ جو زیبا ہے وہی عمل میں آئے اور تم خداوند کی خدمت میں بے وسوسہ مشغول رہو" اگر نتھیوں کے نام پولس رسول کا خط)۔

لیکن اسلام خدا کو راضی کرنے کے لیے ازدواجی زندگی کے مسائل سے بے فکر ہونا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ اگر ازدواجی تعلق لازماً خدا سے غافل کرنے والا ہوتا تو انسان اپنی ایک فطری خواہش کی تسکین کے لیے اس تعلق پر مجبور نہ ہوتا اور نہ تنہا اس تعلق کو انسانی نسل کی بقا کا ذریعہ بنایا جاتا بلکہ بعض ایسے جائز طریقے بھی بتائے جاتے جن سے یہ مقاصد حاصل ہو سکیں تاکہ اللہ کی رضا ڈھونڈنے والے ان پر عمل کرتے کیونکہ یہ اس کی حکمت کے منافی ہے کہ انسان کی فطرت جس عمل کے لیے تڑپ رہی ہے اس سے منع کرے اور اس کا کوئی بدل نہ تجویز کرے۔

کم از کم خدا کے وہ نیک بندے جو دنیا میں آئے ہی اس لیے تھے کہ خدا کی رضا جوئی کے طریقے بتائیں، کسی جائز طریقے سے بھی بیزار ہوتے اور جب تک اس دنیا میں رہتے جنسی تعلقات اور ازدواجی الجھنوں سے دور رہتے حالانکہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً ۚ (الرعد — ۳۸)

"ہم نے تم سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ان کو بیویاں اور اولاد بھی عطا کی"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، نکاح انبیاء کی سنت رہی ہے[1]

قرآن، رہبانیت کو تقرب الہی کا ذریعہ نہیں مانتا بلکہ یہ اس کے نزدیک خدا کی رضا جوئی کا ایسا طریقہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کی سند حاصل نہیں ہے جس کو انسانوں نے بطور خود گھڑ لیا ہے۔

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (الحدید)

"رہبانیت جس کو انہوں نے بطور خود ایجاد کر لیا ہے حالانکہ ہم نے ان پر نہیں بلکہ خدا کی رضا جوئی فرض کی تھی لیکن انہوں نے اپنے ایجاد کردہ دین کی بھی رعایت نہیں کی جیسی کہ اس کی رعایت کرنی چاہیئے"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لا صرورة في الاسلام[2]

"ترک نکاح اسلام میں نہیں ہے"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "تبتل" منع فرمایا[3]

حضرت سمرہ کی روایت ہے:-

ان النبی نھی عن التبتل[4]

---

[1] ترمذی، ابواب النکاح۔

[2] مسند احمد جلد اصفحہ ۳۱۲، ابوداؤد کتاب المناسک، باب لا صرورۃ فی الاسلام، مستدرک حاکم جلد ۱ صفحہ ۱۵۹

[3] نسائی کتاب النکاح، باب النہی عن التبتل۔

[4] ترمذی کتاب النکاح باب ما جاء فی النہی عن التبتل۔ نسائی کتاب النکاح۔ ابن ماجہ ابواب النکاح۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی نہ کرنے اور دنیا سے کٹ جانے سے منع کیا۔"

بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دیگر کتب حدیث کی روایت ہے، حضرت سعد فرماتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون کو تبتل سے روک دیا۔ اگر آپ ان کو اجازت دیتے تو ہم لوگ (یعنی حضرت سعد کے ہم خیال) بھی اپنے آپ کو خصی کر لیتے۔[1]

امام نووی رحہ نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے:۔

فان الاختصاء فی الآدمی حرام صغیرا کان او کبیرا۔

"آدمی کا خصی کر لینا خواہ چھوٹا ہو یا بڑا حرام ہے۔"

حضرت انسؓ فرماتے ہیں:۔

کان رسول اللہ یامرنا بالباءۃ و ینھانا عن التبتل نھیا شدیدا۔[2]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں شادی کا حکم دیتے تھے اور ترک نکاح سے منع فرماتے تھے۔"

سعد بن ہشام کو تجرد کی زندگی گزارنے کا خیال ہوا تو انہوں نے حضرت عائشہ رض سے مشورہ کیا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں سنا کہ "ہم نے تم سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ان کو بیویاں اور اولاد بھی عطا کی" اس سے معلوم ہوا کہ رہبانیت خدا کے مقرب بندوں کا طریقہ نہیں ہے) لہٰذا تبتل کا ارادہ ترک کر دو۔[3]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح لمن تاقت الیہ نفسہ۔

[2] سنن دارمی، کتاب النکاح، باب الحث علی التزویج۔

[3] نسائی، کتاب النکاح، باب النہی عن التبتل۔

حضرت ابن عباس رضؓ نے سعید بن جبیرؒ سے دریافت کیا۔ کیا تمہاری شادی ہو چکی؟ سعید نے جواب دیا نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا شادی کر لو۔ تجرد خدا ترسی کی علامت نہیں ہے۔ کیونکہ اس امت کے بہترین شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سب سے زیادہ بیویاں تھیں [1]

بخاری، مسلم اور نسائی وغیرہ میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ تین آدمیوں نے ازواج مطہرات میں سے کسی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق سوال کیا۔ جب انہوں نے آپ کی عبادت کا حال بیان کیا تو ان حضرات کو آپ کی عبادت بہت ہی مختصر معلوم ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے ہیں مختصر سی عبادت بھی آپ کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم سراپا تقصیر ہیں اس لیے ہمیں آپ سے کہیں زیادہ عبادت کرنی چاہیے۔ چنانچہ اسی تاثر کے تحت ایک نے کہا۔ میں آئندہ سے رات بھر نماز پڑھوں گا، سوؤں گا نہیں۔ دوسرے نے کہا میں مسلسل روزے رکھوں گا اور کبھی چھوڑوں گا نہیں۔ تیسرے نے کہا دنیا کا سارا جنجال شادی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لیے میں شادی ہی نہیں کروں گا اور اپنا سارا وقت عبادتِ الٰہی میں صرف کروں گا۔

اما واللہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہ لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی [2]

"قسم خدا کی میں تم میں سب سے زیادہ خدا ترس اور سب سے زیادہ تقویٰ والا ہوں۔ رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سو بھی رہتا ہوں

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب کثرۃ النساء

[2] بخاری، کتاب النکاح باب الترغیب فی النکاح۔

اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں (یہ میرا طریقہ ہے) پس جو شخص میرے طریقہ کو چھوڑ دے وہ مجھ سے نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:-

النکاح من سنتی فمن لم یعمل بسنتی فلیس منی[1]

"نکاح میری سنت ہے پس جو شخص میری سنت پر عمل نہیں کرتا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں"

مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص خدا ترسی کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ نکاح نہ کیا جائے تو وہ خدا ترسی کے اس تصور سے غافل ہے جس کو خدا کے پیغمبر نے پیش کیا ہے کیونکہ پیغمبر کو خدا کا خوف جس طرح راتوں میں سربسجود رکھتا ہے اسی طرح خدا ہی کا خوف اس کو ازدواجی تعلقات رکھنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ اس لیے جو شخص ان تعلقات کی استواری کی فکر کرتا ہے اور اس کے لیے مصروف جدوجہد رہتا ہے وہ اسلام کی نگاہ میں اپنے تقویٰ اور خشیت کا ثبوت دیتا ہے اور اس کو خدا کے ہاں اس سعی وجہد کا اجر ملے گا۔

عن ابی مسعود الانصاریؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا انفق المسلم نفقۃ علی اھلہ وھو یحتسبھا کانت لہ صدقۃ۔[2]

"ابو مسعود انصاری رضؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب ایک مسلمان خدا کے ہاں ثواب کی نیت سے اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے"

بیوی بچوں کے لیے کمانے اور خرچ کرنے کو عموماً دنیاداری کا کام سمجھا جاتا ہے۔ اسی غلط خیال کی تردید کے لیے آپ نے اس خرچ کو لفظ "صدقہ"

---

[1] ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب ماجاء فی فضل النکاح۔

[2] بخاری کتاب النفقات وفضل النفقۃ علی الاھل، مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ والصدقۃ علی الاقربین۔

سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی جس طرح ایک شخص خدا کی راہ میں انفاق کے ذریعہ مستحق اجر ہوتا ہے اسی طرح اہل وعیال پر اپنی دولت صرف کرنے والا بھی اجر و ثواب کا حق دار ہو گا۔

اسی مفہوم کو آپ نے اور وضاحت کے ساتھ دوسرے مقام پر بیان کیا ہے۔

ولست تنفق نفقۃ تبتغی بھا وجہ اللہ الا اجرت بھا حتی اللقمۃ تجعلھا فی امرأتک[1]

"تم اللہ کی خوشنودی کے لیے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو اس کا تمہیں ضرور اجر دیا جائے گا یہاں تک کہ تمہیں اس لقمہ کا بھی اجر ملے گا جسے تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو۔"

اس سے بھی آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

دینار انفقتہ فی سبیل اللہ ودینار انفقتہ فی رقبۃ و تصدقت بہ علی مسکین ودینار انفقتہ علی اھلک اعظمھا اجرا الذی انفقتہ علی اھلک[2]

"جو دینار تم نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا جو کسی غلام کو آزاد کرنے میں صرف کیا جو کسی مسکین پر صدقہ وخیرات کیا اور جو اپنے بیوی بچوں پر خرچ کیا ان سب میں اس دینار کا اجر و ثواب زیادہ ہے جسے تم نے اپنے بیوی بچوں پر خرچ کیا۔"

سعد بن ہشام رضؓ نے یہ سوچ کر کہ بال بچوں سے لگاؤ خدا سے تعلق کی راہ میں رکاوٹ ہے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور زمین فروخت کر کے پیسہ بھی جہاد

---

[1] بخاری، مسلم، کتاب الوصایا واللفظ للآخر۔

[2] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال۔

میں لگانا چاہتے تھے کہ ان کے قبیلہ کے بعض لوگوں کو اس کا علم ہوگیا۔ انہوں نے حضرت سعد رض کو بتایا کہ تمہارے ہم خیال چھ آدمیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی تو آپ نے ان کو ان کے اس خیال سے منع کیا اور فرمایا:۔

اَلَيْسَ لَكُمْ فِيَّ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [۱]

"کیا تمہارے لیے میری زندگی اچھا اسوہ نہیں ہے؟"

ازدواجی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غفلت نہیں کی اور مدت العمر تمام حقوق ادا فرماتے رہے، یہ آپ کی سنت ہے۔ اس لیے جو شخص ان حقوق کو پامال کرتا ہے وہ آپ کے طریقہ کا متبع نہیں۔ اس کی زندگی اس راستہ سے ہٹی ہوئی ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے نقوش مرتسم ہیں۔

عثمان بن مظعون رض نے اہل وعیال سے دلچسپی چھوڑ دی تھی، اور شب و روز عبادت میں مشغول رہنے لگے تھے۔ حضور کو اس کا علم ہوا، تو انہیں طلب فرمایا۔ جب وہ حاضر ہوئے تو فرمایا۔

عثمان! مجھے رہبانیت کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ بتاؤ کیا تم نے میرے اسوہ کو ترک کر دیا ہے؟

عثمان بن مظعون رض نے جواب دیا نہیں یارسول اللہ! میں تو آپ ہی کے اسوہ کا طالب ہوں۔

ارشاد ہوا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں (رات) کو نماز پڑھتا بھی ہوں اور سو بھی جاتا ہوں۔ کبھی روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا۔ نکاح اور طلاق پر بھی عمل کرتا ہوں۔ یہ میرا طریقہ ہے جو شخص میرے طریقہ سے اعراض کرے اس کا مجھ سے تعلق نہیں ہے۔ عثمان بخدا سے ڈرو اس لیے کہ تم پر جس طرح اللہ کا

---

[۱] مسند احمد، جلد ۶ صفحہ ۲۲۶۔

حق ہے اسی طرح بال بچوں کا بھی حق ہے مہمانوں کا اور خود تمہارے نفس کا بھی
حق ہے لہذا ان سب حقوق کو ادا کرنے کی کوشش کرو۔[1]

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی آپ کو اسی قسم کی اطلاع ملی تو
ان سے بھی آپ نے یہی فرمایا کہ عبادت میں اس قدر منہمک نہ ہو جاؤ کہ بیوی
بچوں، مہمانوں اور خود اپنے نفس کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں انہیں فراموش
کر دو۔[2]

ایک مرتبہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ حضرت درداء سے ملنے گئے، تو دیکھا کہ
ان کی بیوی زیب و زینت سے خالی ہیں اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ہیں۔
پوچھا خیر تو ہے؟ انہوں نے جواب دیا آپ کے بھائی ابو درداء کو دنیا سے
کیا تعلق! ان کو عبادت ہی سے فرصت نہیں ملتی کہ ہمارا خیال کریں۔ اتنے میں
حضرت ابو درداء تشریف لے آئے اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے روبرو کھانا
پیش کرتے ہوئے معذرت کی میں روزہ سے ہوں اس لیے آپ کا ساتھ
نہیں دے سکتا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا جب تک آپ نہیں کھائیں گے میں
بھی نہیں کھاؤں گا۔ چنانچہ بالآخر حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے روزہ توڑ دیا اور
کھانے میں شریک ہو گئے۔ جب رات ہوئی تو انہوں نے نماز کی تیاری شروع
کر دی۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا یہ آرام کا وقت ہے آرام کیجیے۔ کچھ دیر بعد
ابو الدرداء نماز کے لیے پھر اٹھ بیٹھے۔ حضرت سلمان نے کہا نہیں! ابھی نہیں۔
جب رات کا آخری حصہ ہوا تو خود ہی جگایا اور دونوں نے مل کر نماز پڑھی۔ اس
کے بعد حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے کہا تم پر تمہارے رب کا بھی
حق ہے اور بیوی بچوں اور نفس کا بھی حق ہے۔ لہذا ہر حق کو ادا کرنے کی کوشش
کرو۔ (ایسا نہ ہو کہ ایک حق کی ادائیگی کی فکر دوسرے حقوق سے غافل کر دے)

---

[1] مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۲۶۸، سنن دارمی، کتاب النکاح، باب النہی عن التبتل۔

[2] رواہ البخاری فی ابواب مختلفۃ من کتاب الصوم و فی باب حق الضیف من کتاب الآداب۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپؐ نے حضرت سلمانؓ کی تائید کی اور فرمایا سلمانؓ نے سچ کہا[1]

یعنی خدا کے حقوق کو نظر انداز کرنے والا جس طرح مجرم اور گناہگار ہے اسی طرح ازدواجی حقوق سے غفلت اور کوتاہی بھی ایک ایسا جرم ہے جس پر خدا کے دربار میں باز پرس ہوگی۔

جنسی تسکین

(جائز حدود میں)

تمام راہبانہ مذاہب نے تعلقات زن وشوہر کو منافی تقوی بتایا لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

وفی بضع احدکم صدقۃ[2]

"بیوی سے ہم بستری کرنا بھی صدقہ ہے"

علامہ ابن الہمام حنفیؒ نے تو قرآن وحدیث کے دلائل کی روشنی میں یہاں تک لکھ دیا ہے:۔

ان الاشتغال بہ افضل عن التخلی عنہ لمحض العبادۃ[3]

"ازدواجی تعلق سے کنارہ کش ہو کر محض عبادت میں لگے رہنے سے افضل یہ ہے کہ آدمی اس تعلق میں مشغول ہو"

اسلام ان باطل نظریات کے خلاف ہے جو عورت سے سانپ اور بچھو کی

---

[1] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف۔

[2] فتح القدیر، جلد ۲ صفحہ ۳۱۴۔

[3] بخاری، کتاب الصوم، باب من اقسم علی اخیہ لیفطر فی التطوع، کتاب الآداب، باب صنع الطعام والتکلیف للضیف۔

طرح احتراز کی تعلیم دیتے ہیں۔ کیونکہ مرد فطرتاً عورت کی طرف مائل ہے، وہ عورت سے کنارہ کش اور دور اسی وقت رہ سکتا ہے جب کہ غیر فطری تدابیر سے اپنے اس فطری میلان کو ختم کر دے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا رخ جنسی جذبات کی آسودگی کے لیے اپنے ہم جنس افراد کی طرف تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اس غیر فطری رجحان کی مذمت کرتے ہوئے ان کو بتایا کہ جنسی تسکین کا پاک اور فطری ذریعہ عورت ہے اس لیے عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اسی کو اختیار کیا جائے۔

یٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ۔ (ہود ع ۷)

"اے میری قوم! یہ میری لڑکیاں ہیں یہ تمہارے لیے زیادہ پاک ہیں، پس اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے ساتھ بدعملی کر کے مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں ایک بھی سمجھ دار اور صالح انسان نہیں ہے۔"

انسان عموماً جذبات کے مقابلہ میں شکست کھا جاتا ہے۔ بہت ہی کم لوگ ان پر کنٹرول کر سکتے ہیں ورنہ بیشتر افراد تو جائز اور فطری طریقوں کی عدم موجودگی میں ناجائز اور غیر فطری تدابیر کو اپنانے لگتے ہیں۔ اسی سے بچانے کے لیے شریعت نے نکاح کا تاکیدی حکم دیا ہے۔ کیونکہ نکاح اس کے نزدیک جنسی تسکین کا جائز اور فطری طریقہ ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

من قدر علی النکاح فلم ینکح فلیس منا[1]

"تم میں جو شخص نکاح کی مقدرت رکھے اور پھر نکاح نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

---

[1] سنن دارمی، کتاب النکاح باب الحث علی التزویج۔

ابو الزوائد نامی ایک شخص تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا تمہارے شادی نہ کرنے کی وجہ یا تو رجولیت کا فقدان ہے یا تم معصیت میں مبتلا ہو۔ مشہور تابعی طاؤس نے حضرت عمرؓ کے اس قول کا حوالہ دیتے ہوئے ایک دوسرے ایسے ہی شخص سے جو شادی نہیں کر رہا تھا کہا شادی کر لو ورنہ میں بھی تمہارے بارے میں وہی کہوں گا جو حضرت عمرؓ نے ابو الزوائد کے متعلق کہا تھا۔[1]

شریعت کا یہاں تک حکم ہے کہ اگر آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو تو آدمی لونڈی رکھے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ۔ (النساء)

"تم میں سے جو شخص خاندانی والی (آزاد) مسلمان عورت سے نکاح کی مقدرت نہ رکھتا ہو تو اسے تم میں کی مومن لونڈیوں سے شادی کر لینی چاہیئے۔"

اس میں شک نہیں، بعض اوقات انسان ایسے حالات میں گھر جاتا ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔ ان حالات میں شریعت نے بکثرت روزے رکھنے کا حکم دیا ہے تاکہ وہ یادِ الٰہی کی اس ڈھال سے جذبات کا مقابلہ کر سکے۔ علاوہ ازیں جسم میں جتنی زیادہ توانائی ہو گی اسی قدر جذبات بھی شدید ہوں گے۔ روزہ سے جہاں جسم کمزور ہوتا ہے وہاں جذبات بھی مضمحل ہوتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

---

[1] احکام القرآن جصاص، جلد ۳ صفحہ ۳۹۶۔ المحلیٰ لابن حزم جلد ۹ صفحہ ۴۴۰۔

یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فان الصوم لہ وجاء۔[۱]

"نوجوانو! تم میں سے جو شخص نکاح کی مقدرت رکھتا ہو اسے ضرور نکاح کر لینا چاہیے کیونکہ وہ آنکھ کو نیچی رکھنے (یعنی بدنگاہی سے بچانے) والا اور شرم گاہ کو (غلط کاری) سے محفوظ رکھنے والا ہے لیکن جو شخص اس کی استطاعت نہ رکھے اسے روزے رکھنے چاہئیں کیونکہ روزے اس کے لیے (معصیت کے خلاف) ڈھال ہیں۔"

فقہاء حنفیہ و مالکیہ متفق ہیں کہ جس شخص کو روزے معصیت سے نہ روک سکیں اور وہ لونڈی رکھنے پر بھی قادر نہ ہو تو اس کے لیے نکاح کرنا فرض ہے بشرطیکہ اس کو یہ یقین ہو جائے کہ نکاح نہ کرنے کی صورت میں وہ زنا کا ارتکاب کر بیٹھے گا۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ فرضیت نکاح کے لیے کیا یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی نان و نفقہ اور مہر کی ادائیگی پر بھی قادر ہو یا نہیں۔

احناف اور بعض فقہاء مالکیہ فرضیت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ انسان نان و نفقہ کی قدرت رکھتا ہو ورنہ اس کے لیے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہوگا۔ اس طرح ایک معصیت سے بچنے کے لیے اس کو دوسری معصیت اختیار کرنا پڑے گی۔

لیکن اکثر مالکیہ کا یہ خیال ہے کہ نان و نفقہ کی فکر میں نکاح کو مؤخر کرنا صحیح نہیں ہے جب زنا میں مبتلا ہونے کا یقین ہے تو اللہ پر توکل کر کے اس سے بچنے کی شرعی تدبیر پر عمل کرنا چاہیے۔

بلکہ ان کی رائے میں معصیت کا یقین کیا خوف ہو تب بھی نکاح فرض ہو جاتا

---

[۱] بخاری، کتاب النکاح، باب من لم یستطع الباءۃ فلیصم۔

ہے حنفیہ کے نزدیک خوف کی صورت میں استطاعت کی شرط کے ساتھ واجب ہوجاتا ہے (فرض اور واجب میں قانونا فرق ہے عملاً کوئی فرق نہیں دونوں لازمی ہیں)۔

حنابلہ تو مالکیہ سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ وہ کہتے ہیں عدم نکاح سے زنا کا یقین ہی نہیں گمان بھی ہو تب بھی نکاح واجب ہوجاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کو نکاح کرلینا چاہیے خواہ وہ نان ونفقہ پر قدرت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اور نکاح کے بعد کسب حلال کی کوشش کرنی چاہیئے۔ [۱]

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:۔

وان احتاج الانسان الی النکاح وخشی العنت بترکہ قدمہ علی الحج الواجب وان لم یخف قدم الحج ونص الامام احمد علیہ فی روایۃ صالح وغیرہ وان کانت العبادات فرض کفایۃ کالعلم والجہاد قدمت علی النکاح ان لم یخش العنت [۲]

"اگر انسان نکاح کا حاجت مند ہو اور ترک نکاح سے زنا میں مبتلا ہوجانے کا اندیشہ ہو تو اسے نکاح کو فرض حج پر بھی مقدم کرنا چاہیے (اور) اگر زنا کا خوف نہ ہو وہ حج کو نکاح پر مقدم کرے گا۔ اس بات پر صالح اور دوسرے لوگوں کی روایت کے مطابق امام احمد نے تصریح کی ہے۔ اگر عبادات فرض کفایہ کی نوعیت کے ہوں مثلاً تعلیم اور جہاد وغیرہ، تو زنا کا خوف نہ ہونے کی صورت میں وہ نکاح پر مقدم کی جائیں گی (بصورت دیگر نکاح مقدم ہوگا)۔"

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" جلد ۴ صفحہ تا ۔

[۲] اختیارات شیخ الاسلام ابن تیمیہ صفحہ ۱۱۱۔

علامہ ابن حزمؒ نے لکھا ہے:-

فرض على كل قادر على الوطء ان وجد من اين يتزوج او يتسرى ان يفعل احدهما ولا بد فان عجز عن ذالك فليكثر من الصوم[1]

"جو شخص جماع پر قادر ہو اور اسے آزاد عورت یا لونڈی مل رہی ہو تو اس کے لیے دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اس سے عاجز ہو تو کثرت سے روزے رکھے۔"

نکاح کی شرعی و قانونی اہمیت کو سمجھنے کے لیے فقہ حنفی کے مشہور شارح امام اکمل الدین البابرتی کا یہ قول کافی ہے:-

وما اتفق فى حكم من احكام الشرع مثل ما اتفق فى النكاح من اجتماع دواعى الشرع والعقل والطبع[2]

"جس طرح نکاح کے پیچھے شریعت، عقل اور فطرت کے محرکات کام کر رہے ہیں اس طرح احکام شرع میں کسی بھی حکم کی پشت پر اتنے سب محرکات نہیں پائے جاتے۔"

زنا حرام ہے

جنسی تسکین کی بعض صورتیں اسلام نے جائز کی ہیں۔ ان صورتوں پر عمل کی وہ انتہائی تاکید کرتا ہے۔ ان کے علاوہ شہوت برآری کے جتنے طریقے ہو سکتے ہیں۔ وہ سب اس کے نزدیک حرام اور ممنوع ہیں اور ان سے قریب ہونے کی بھی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

---

[1] المحلی، جلد ۹ صفحہ ۴۴۰

[2] العنایۃ علی الہدایۃ المطبوع علی حاشیۃ فتح القدیر، جلد ۲ صفحہ ۳۳۹۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا (بنی اسرائیل ۳۲)

"تم زنا کے قریب تک نہ جاؤ اس لیے کہ وہ بے حیائی کا کام اور بری راہ ہے"

اہل ایمان کا وصف امتیازی یہ ہے:۔

وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ (الشوریٰ ۳۷)

"کہ وہ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں"

زنا تو بڑا گناہ کیا معنی بہت بڑا گناہ ہے اس لیے ان کا دامن اس معصیت کے داغ دھبوں سے پاک ہوتا ہے:۔

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا۔ (الفرقان۔ ۶۸)

"(رحمٰن کے بندے) اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو شریک نہیں کرتے اور نہ کسی ایسی جان کو قتل کرتے ہیں جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ الّا یہ کہ حق کا تقاضا ہو اور نہ وہ زنا کرتے ہیں۔ جو شخص اس طرح کے گناہ کرے گا وہ اپنے کیے کا بدلہ پائے گا"

قرآن نے نمازیوں اور کامیاب مومنوں کی ایک صفت یہ بیان کی ہے:۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝ (المؤمنون۔ المعارج ا ۳)

"کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے (کہ ان سے جنسی آسودگی حاصل کرنے پر) وہ ملامت زدہ نہیں قرار پائیں گے (کیونکہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں ہاں) ان کے علاوہ

(کوئی تیسری صورت) جو لوگ تلاش کریں گے وہ دراصل زیادتی کرنے والے ہیں۔"

قاضی ابن رشد نے لکھا ہے :-

اباحه فی الشرع علی وجهین احدهما عقد النکاح والثانی ملک الیمین فلا یحل استباحة الفرج بما عدا هذین الوجهین[1]

"شریعت نے دو طریقوں سے جنسی تسکین جائز قرار دی ہے۔ ایک یہ کہ نکاح کیا جائے دوسرے یہ کہ لونڈی رکھی جائے ان دو طریقوں کے علاوہ کسی بھی ذریعہ سے شرمگاہ کو حلال نہیں کیا جا سکتا۔"

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں :-

فان الابضاع فی الاصل علی التحریم فیقتصر فی اباحتها علی ما ورد به الشرع وما عداه فعلی اصل التحریم[2]

"کسی سے جنسی تعلق قائم کرنا اصلاً حرام ہے لہٰذا اس کا جواز ان ہی حدود میں محدود رہے گا جو شریعت میں بیان ہوئی ہیں، ان حدود سے باہر اپنی اصل کے اعتبار سے وہ حرام ہی ہو گا۔"

"الفقہ علی المذاہب الاربعہ" کا مصنف لکھتا ہے :-

فقواعد المذاهب تجعل الرجل مقصورا علی من یحل له کما تجعل المرأة مقصورة علیه[3]

"فقہی مسالک کے اصول مرد کو پابند بناتے ہیں کہ وہ ان ہی عورتوں سے جنسی لذت حاصل کرے جو اس کے لیے حلال ہیں اسی لیے یہ اصول عورت کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ صرف اپنے شوہر پر اکتفا کرے۔"

---

[1] مقدمات ابن رشد المطبوعہ مع المدونۃ الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۲۰۱۔

[2] زاد المعاد ج ۴ ص ۵۔

[3] الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۴ صفحہ ۔

حرمتِ زنا کے اسباب

آپ پوچھ سکتے ہیں جنسی تعلقات کو بعض حدود و قیود کا پابند بنانے میں کیا حکمتیں ہیں اور اُن کو آزاد رکھنے میں کون سی خرابیاں ہیں جن کی بنا پر شریعت پہلی صورت کو جائز اور دوسری صورت کو ممنوع قرار دیتی ہے؟

قرآن مجید نے اس سوال کا تفصیل سے جواب دیا ہے۔ سورۂ نساء میں حکمِ نکاح اور حرمتِ زنا کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○ وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ○ يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا۔

(النساء ۲۶ – ۲۸)

"اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے کھول کھول کر بیان کرے اور تمہاری ان لوگوں کے طریقوں کی طرف راہنمائی کرے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی کے ساتھ توجہ ہو لیکن جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں ان کی خواہش یہ ہے کہ تم راہِ راست سے بہت دور ہٹ جاؤ اور اللہ تم پر سے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے (کیونکہ) انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے"

سورۂ نور میں حرمتِ زنا اور معاشرتی احکام کی تفصیل کے بعد ارشاد ہوا:۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُبَيِّنَاتٍ وَمَثَلًا مِنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ○ اللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلَى نُورٍ

يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (النور ۳۵-۳۴)

"ہم نے تمہاری طرف واضح آیات نازل کی ہیں اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا حال بیان کیا ہے اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت کی باتیں بھیجی ہیں۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال ایسی ہے گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ رکھا ہوا ہے اور وہ چراغ ایک شیشہ میں ہے اور وہ شیشہ اس قدر روشن ہے کہ چمکتا ہوا تارہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ چراغ جلایا جاتا ہے زیتون کے ایسے مبارک درخت کے تیل سے جو نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف۔ جس کی وجہ سے اس کا تیل اس قدر صاف ہے کہ قریب ہے از خود روشنی دینے لگے اگرچہ اسے آگ نہ بھی لگے۔ روشنی پر روشنی ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی روشنی کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے"

ان آیات سے چند حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

پہلی حقیقت یہ کہ بے قید شہوت رانی کے بجائے خدا کے بتائے ہوئے حدود کے اندر اپنی جنسی خواہش پوری کرنا یہ ان برگزیدہ بندوں کا اسوہ رہا ہے جن پر رحمت الٰہی ہر آن سایہ فگن رہتی تھی، جنہوں نے انسانیت کی کشتی کو جذبات اور خواہشات کے منجدھار سے نکال کر ہوش و خرد کے ساحل سے ہم کنار کیا، جنہوں نے آدمیت کی صحیح قدر کی اور اس کو کامیابی کے گر اور ناکامی کے اسباب بتائے جن کی کوششوں سے دنیا کو ایسا معاشرہ ملا جس میں جوش و ہوش اور جذبات و عقل کا پاسنگ ٹھیک ٹھیک قائم رہا جن کی تربیت سے جذبات کے دیوانے دانشور این وقت بن گئے اور فہم و بصیرت کے اندھے عقل و خرد کے ایسے تاجدار ہو گئے کہ فکر و دانش ان پر ناز کرتی تھی، جن کے جذبات اتنے ستھرے کہ عفت و عصمت بلائیں لیتی تھی۔ جن کا کردار اتنا بے داغ تھا کہ آفتاب رشک کرتا تھا اور جن کی

سیرت کی بلندی پر رفعت مہ و انجم شرمندہ تھی۔

دوسری حقیقت یہ کہ جو قوم بھی جنسی آوارگی میں مبتلا ہوئی نامراد ہوئی۔ وہ اس اندھے کی طرح تباہی کے گڑھے میں گر کر ہلاک ہوئی جس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ ہو۔ اس کے اقدامات دیوانوں کی طرح عقل و ہوش سے خالی ہوتے تھے، کیونکہ جذبات کی آندھیوں نے اس کی بصیرت کے چراغ کو بجھا دیا تھا۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے اور وہ اپنے فیصلہ کو بار بار دہرا چکی ہے۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ اس قانون کے ذریعہ قرآن یہ چاہتا ہے کہ آدمی جذبات کا غلام بننے کے بجائے خدا کا پرستار ہو تاکہ وہ اس کی نوازشات بے پایاں کا مستحق قرار پائے اور اسے ایسی زندگی نصیب ہو جس میں چین ہی چین ہے اور رنج و کلفت سے دور ہے۔ لیکن بندگانِ ہوا و ہوس کی خواہش یہ ہے کہ ساری دنیا ان ہی کی طرح خواہشات کی پرستش میں لگ جائے۔

چوتھی حقیقت یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جنسی تعلقات کو بالکلیہ ممنوع نہیں قرار دیا۔ ان پر صرف پابندی عائد کی ہے۔ چنانچہ اس نے انسان کے سامنے جائز راہیں کھلی رکھی ہیں۔ اگر یہ راہیں مسدود ہوتیں تو جذبات کا سیلاب تمام حد بندیوں کو توڑ پھینکتا۔ کیونکہ انسان بہت کمزور واقع ہوا ہے۔ وہ جذبات کو دبا نہیں سکتا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی کمزوریوں کی رعایت کی ہے۔ اپنے قانون میں سختی نہیں رکھی۔

پانچویں اور آخری حقیقت یہ کہ خدا ترسی، پرہیزگاری اور تقویٰ و طہارت عین تقاضائے فطرت ہے۔ یہ ایسی آواز ہے جو انسان کے اندرون سے اٹھتی ہے۔ اس لیے عفت و عصمت اور پاک دامنی کے تصور سے انسان کی فطرت ابا نہیں کرتی بلکہ آگے بڑھ کر اس کا استقبال اور خیر مقدم کرتی ہے۔ ان پر عمل سے اس کو جلا اور تب و تاب ملتی ہے اور وہ نور نصیب ہوتا ہے جس کے ذریعہ انسان کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

ومن لم یجعل اللہ لہٗ نورا فما لہ من نور۔

"لیکن جس کو خدا کا نور نہ ملے اس کے لیے کہیں روشنی نہیں۔"

اسلام نے جنسی تعلقات کا جو تصور پیش کیا ہے آیئے اب ہم تفصیل سے دیکھیں کہ وہ اس تصور کے مطابق کس طرح فرد کی تربیت اور معاشرہ کی اصلاح کرتا ہے کیونکہ ان ہی دو ذرائع پر کسی تصور کی کامیابی یا ناکامی منحصر ہے۔

فرد کی تربیت

کوئی بھی اجتماعی حیثیت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اس کے زیر سایہ رہنے والے افراد اپنی زندگیوں میں اس کے مناسب تبدیلی نہ کر لیں۔ اسی لیے ہر معاشرہ اپنے افراد کو ان نظریات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے جن پر وہ خود قائم ہے۔ اسلام نے بھی فرد کی اصلاح کو دیگر امور پر مقدم رکھا ہے۔ لیکن دنیا کے اور نظریات کے مقابلہ میں اسلام کا وصف امتیازی یہ ہے کہ وہ فرد سے پُر امید رہ کر اصلاح کا آغاز کرتا ہے۔ وہ انسان کے بارے میں نہایت ہی بلند و ارفع تصور رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان بد معاش اور غنڈہ نہیں ہے بلکہ فطرتاً وہ ملکوتی پرواز رکھتا ہے جسے غلط افکار و خیالات اور فاسد تعلیم و تربیت نے پستی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ یہیں سے ان تصورات کی جڑ کٹ جاتی ہے جن کے ہاتھ میں اس وقت دنیا کی قیادت کا علم ہے اور جو معصیت اور بدکاری کو عین تقاضائے فطرت سمجھتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح بدن کو سردی گرمی سے محفوظ رکھنے کے لیے پوشاک اور زندہ رہنے کے لیے غذا کا تقاضا ہے۔ اگر آدمی غذا اور لباس کے مطالبات کی تکمیل کرتے ہوئے کوئی جھجک نہیں محسوس کرتا تو جنسی خواہش کو پورا کرتے ہوئے کیوں نادم و پشیمان ہو!

احساس عظمت

اس کے برعکس اسلام کا دعویٰ ہے کہ زنا ایک معصیت ہے اور معصیت

انسانی فطرت سے میل نہیں کھاتی۔ اس کے مزاج نے نیکی اور صرف نیکی ہی مطابقت رکھتی ہے۔ اس کی عظمت و بزرگی برائی میں نہیں بھلائی میں ہے۔ شر میں نہیں خیر میں رکھی گئی ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ انسان کسی نازیبا عمل سے اپنے دل میں خلش اور انقباض محسوس کرتا ہے؟ کیوں غلط روش پر اس کا نفس سرزنش کرتا ہے! اس کا ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ کہ انسان کی عزت نفس محامد و فضائل کے ساتھ وابستہ ہے۔ پاکیزگی کردار اور محاسن اعمال ہی سے اس کے انا اور خودی کی نشوونما ہوتی ہے۔ اگر ان جوہری صفات سے وہ عاری ہو تو میزان عالم میں اس کا وزن گھٹ جاتا ہے یہی احساس ہے جو ایک ننگِ آدمیت کو بھی مجبور کرتا ہے کہ حسن عمل کا لبادہ اوڑھ کر دنیا کے سامنے آئے۔ وہ اس بات کا متمنی ہوتا ہے کہ دنیا اس کی تیرہ باطنی اور بد اطواری کو بھی روشن ضمیری اور پاکیزہ کرداری یقین کرے۔

قرآن مجید اسی احساس کو زندہ اور بیدار کرتا ہے اور اس سے بار بار کہتا ہے کہ کب تک اس فریب نفس میں مبتلا رہو گے۔ اگر واقعی تمہیں اپنا شرف و مجد اور مقام عزت عزیز ہے تو زندگی کو ان کمالات کے حصول میں لگاؤ جن سے تم اپنی عظمت گم گشتہ حاصل کر سکتے ہو۔

قرآن مجید نے کتنے اچھوتے انداز میں اس حقیقت کو پیش کیا ہے:

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (الاعراف۔ ۲۸)

"اور جب وہ بے حیائی کا کوئی کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسے ہی کرتے پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ تم کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ قطعاً بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں کوئی علم نہیں"

غور کیجیے! آج کے معصیت کیشوں اور عرب جاہلیت کے غلط کاروں کے

افکار و عقائد میں کس قدر مماثلت پائی جاتی ہے کہ یہ بھی اپنی عیاشی کے لیے تاریخی حقائق کو مسخ کرتے ہیں اور وہ بھی اپنے مزعومات کی سند میں تاریخ ہی کو پیش کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی غلط روی کو وحیٔ الٰہی کا نام دے رکھا تھا اور موجودہ دور کے بندگانِ ہوا و ہوس نے اپنی خواہشاتِ نفس کی پرستش علم و بصیرت اور فلسفہ و حکمت کے عنوان سے شروع کر رکھی ہے۔

ضمیر کی آواز

لیکن چونکہ انسان طبعاً خیر پسند ہے اس لیے خود اس کا ضمیر ان برائیوں کی ہمنوائی سے انکار کرتا ہے۔ قدرت نے انسان کے اندرون میں ایسے متعدد عوامل پیدا کر دیے ہیں جو اس کو کسی خارجی دباؤ کے بغیر برائی سے نفرت دلاتے ہیں۔ یہ عوامل بسا اوقات اتنے شدید ہو جاتے ہیں کہ آدمی ان کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ورنہ گناہ خصوصاً موجودہ دور میں جتنے نظر فریب اور سحر آفریں انداز میں سامنے لایا جا رہا ہے، اس سے نیکی کا تصور تک ذہنوں سے محو ہو جاتا۔

ان ہی داخلی عوامل میں سے ایک کو ضمیر اور وجدان کہا جاتا ہے جو آدمی کے حسنِ عمل کی مدح و توصیف اور اس کی بری روش پر ملامت کرتا ہے اور اسے یاد دلاتا رہتا ہے کہ معصیت کے داغ دھبے اس کی جبینِ عظمت کو خاک آلود کرنے والے ہیں اور اس منصبِ رفیع کے منافی ہیں جو قدرت نے اسے عطا کیا ہے۔

ضمیر کی یہ صدا برائی کی راہ کا سنگ گراں ہے لیکن اگر اس پر کان نہ دھرا جائے اور اسے دبانے کی مسلسل کوشش کی جائے تو یہ آواز دھیمی پڑ جاتی ہے۔ اسلام اپنی تعلیمات کے ذریعہ ضمیر کو زیادہ حساس اور طاقتور بناتا ہے تاکہ یہ برائی کے ان راستوں کی بھی چوکی داری کرے جہاں قانون کا خوف، بدنامی کا اندیشہ اور سوسائٹی کا دباؤ محافظت سے قاصر ہیں۔

نواس بن سمعان رض روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

"بر و اثم" کی حقیقت دریافت کی، آپ نے جواب دیا۔

البر حسن الخلق والاثم ما حاك فی نفسك وكرهت ان

یطلع الناس علیہ[1]

"نیکی حسن خلق کو کہتے ہیں اور گناہ وہ ہے جو تمہارے اندر کھٹک پیدا کرے اور اس سے لوگوں کا واقف ہو جانا تمہیں ناپسند ہو۔"

اس حدیث کا ایک ایک لفظ قابل غور ہے۔ کتنی ہی اہم حقیقتیں ہیں جن کو اس بلیغ ارشاد نے بے نقاب کر دیا ہے۔ بر (نیکی) وہ ہے جس میں اخلاق کا حسن اور کردار کی پاکیزگی جھلک رہی ہو لیکن اثم (گناہ) اس دل کشی و رعنائی سے محروم ہوتا ہے اور برائی کا یہ بھی وصف ہے کہ وہ قلب و ضمیر کا کانٹا بنی رہتی ہے اور مجرم کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اپنی بد عملی کے ساتھ ننگا و خلق کے سامنے آ سکے۔ لیکن ایک صالح انسان کا دل اس خلش سے پاک ہوتا ہے۔ اس کو اپنے صحیفۂ عمل پر حسرت و ندامت نہیں لاحق ہوتی، وہ مسرور و مطمئن ہوتا ہے کہ اس نے عرصۂ حیات میں وہی کچھ کیا جو اسے کرنا چاہیے۔

ایمان آدمی کے اندر یہی وصف پیدا کرتا ہے:۔

اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ[2]

"جب تمہیں اپنا نیک عمل مسرور و شاداں کرے اور اپنی برائی ناگوار محسوس ہونے لگے تو سمجھ لو کہ تم مومن ہو۔"

جذبۂ حیا کا فروغ

جب احساس عظمت جاگ اٹھتا ہے اور وجدان و ضمیر کی قوتیں زندہ ہو گئیں تو آدمی اپنے مرتبے سے فروتر کسی فعل کا ارتکاب کرتے ہوئے ندامت اور شرمساری محسوس

---

[1] ترمذی، ابواب الزہد باب ما جاء فی البر والاثم۔

[2] مشکوٰۃ، کتاب الایمان بحوالہ احمد۔

کرتا ہے۔ گناہوں کے ارتکاب سے اس کا سر اونچا نہیں ہوتا بلکہ جھک جاتا ہے۔ معصیت کوشی اس کے لیے باعث افتخار نہیں، شرم و غیرت کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ جذبہ اگر سرد ہو جائے تو آدمی کو معصیت کے حملوں سے بچانے والی ساری قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ یہی حقیقت ہے جسے ہر داعی خیر نے اپنے اپنے دور میں سمجھایا تھا۔

عن ابی مسعودؓ قال قال النبیؐ ان مما ادرک الناس من کلام النبوۃ الاولی اذا لم تستحی فاصنع ما شئت۔[1]

"ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گزشتہ انبیاء کی تعلیمات کا جو حصہ لوگوں تک پہنچا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ جب حیا اٹھ گئی تو جو چاہے کرو۔"

حیا اور غیرت کی تعلیم ہمیشہ سے کیوں لازمۂ نبوت رہی ؛ اس کی وجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور موقعہ پر بیان فرمائی ہے۔

حضرت سعدؓ نے ایک مرتبہ فرمایا یا رسول اللہ! اگر کوئی شخص کسی کو اپنی بیوی کی عصمت دری کرتے دیکھے تو کیا اس کی غیرت اس بات کی اجازت دے گی کہ وہ قرآن کے حکم کے مطابق چار گواہ تلاش کرتا پھرے، خدانخواستہ اگر میرے ساتھ یہ ناگوار صورت پیش آئے تو میں اس بدمعاش کو وہیں ڈھیر کر دوں گا۔

آنحضرتؐ، اس غیرت مندانہ تقریر کو سن کر حاضرین سے مخاطب ہوئے اور فرمایا:۔

اتعجبون من غیرۃ سعد واللہ لانا اغیر منہ واللہ اغیر منی من اجل غیرۃ اللہ حرم اللہ الفواحش ما ظہر منہا وما بطن۔[2]

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب اذا لم تستحی فاصنع ما شئت۔ ابو داؤد، کتاب الادب باب فی الحیاء۔

[2] بخاری، کتاب التوحید، باب قول النبیؐ لا شخص اغیر من اللہ۔ مسلم، کتاب اللعان۔

"کیا تم سعدؓ کی غیرت سے تعجب کرتے ہو، خدا کی قسم میں اس سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ مجھ سے بھی زیادہ صاحب غیرت ہے اور اپنی اسی غیرت کی وجہ سے اس نے کھلی اور چھپی تمام بے حیائیوں کو حرام کیا۔"

یہ حدیث بتاتی ہے کہ جب کوئی ذکی الطبع اور کیینہ انسان اپنی طرف رذائل کا انتساب پسند نہیں کرتا تو خدائے تعالیٰ کی مقدس و باعظمت ہستی اس سے کہیں ارفع ہے کہ معاصی و فواحش اسے محبوب ہوں اور وہ ان کا حکم دے۔ جب ایک شریف اور باحیا انسان خود تو کیا معصیت کا مرتکب ہوگا دوسرے تک کو آلودۂ معصیت نہیں دیکھ سکتا تو خدائے غیور اپنے بندوں کی بے حیائی اور جرم پروری کو کیسے بخوشی برداشت کرسکتا ہے! اس نے ہر دور میں اپنے برگزیدہ بندوں کی زبانی اسی ناپسندیدگی کا اعلان کیا تھا۔ خدا کے جس بندے پر ان صفات الٰہی کا جتنا زیادہ اثر پڑے وہ اتنا ہی گناہ سے دور بھاگے گا بلکہ ایک متقی شخص کو تصور جرم تک سرنگوں اور شرمسار کرسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی خدا ترس ہستی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں آتا ہے:۔

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا وَكَانَ اِذَا كَرِهَ شَيْئًا عَرَفْنَاهُ فِي وَجْهِهِ[1]

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم پردہ میں رہنے والی دوشیزہ سے زیادہ شرمیلے تھے۔ جب حیاء کے منافی کوئی بات پیش آجاتی تو آپ زبان مبارک سے اس کا تذکرہ تک نہیں کرتے تھے بلکہ ناپسندیدگی رخ مبارک سے ظاہر ہونے لگتی جسے ہم بھانپ لیتے۔"

اس باحیا انسان نے دنیا کو جس انداز سے حیا کی تعلیم دی اس کا اندازہ ذیل کی

---

[1] مسلم کتاب الادب باب کثرۃ حیائہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

دو حدیثوں سے کیا جا سکتا ہے:۔

عن بهز بن حکیم عن ابیه عن جده قال قلت یا نبی الله عوراتنا ما نأتی منها وما نذر قال احفظ عورتك الا من زوجتك او ما ملکت یمینك قال قلت یا رسول الله اذا کان القوم بعضهم فی بعض قال ان استطعت ان لا یرینها احد فلا ترینها احداً قال قلت یا نبی الله اذا کان احدنا خالیاً قال فالله احق ان یستحیی منه من الناس [1]

"بہز بن حکیم اپنے باپ کی وساطت سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، اے اللہ کے نبی! ہم اپنی ستر پوشی کہاں کریں اور کہاں نہ کریں۔ آپ نے جواب دیا، اپنی شرم گاہ کو اپنی بیوی اور اپنی باندی کے علاوہ کسی کے سامنے کھلنے نہ دو۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! جب کہ لوگ باہم ملے جلے ہوں اور آدمی ستر پر پوری طرح قادر نہ ہو تو کیا کرے؟ جہاں تک ممکن ہو کوشش کرو کہ کوئی شخص تمہارے قابل ستر مقامات کو دیکھنے نہ پائے۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! جب کوئی شخص تنہا ہو تو کیا اس وقت بھی وہ ننگا نہیں ہو سکتا؟ آپ نے جواب دیا۔ اس وقت اللہ تو موجود ہوتا ہے اور اللہ کی ذات لوگوں کے مقابلہ میں اس کی زیادہ مستحق ہے کہ اس سے شرم کی جائے"۔

عن عتبة بن عبد السلمیؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا اتی احدکم اهله فلیستتر ولا یتجردا العیرین۔ [2]

---

[1] ترمذی، ابواب الاستیذان والآداب، باب ما جاء فی حفظ العورة

ابن ماجہ، ابواب النکاح باب التستر عند الجماع۔

[2] ابن ماجہ، ابواب النکاح باب التستر عند الجماع۔

"عتبہ بن عبد السلمی روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے ہم بستری کرے تو چاہیئے کہ پردہ کر لے
اور دونوں اس حالت میں گدھوں کی طرح ننگے نہ ہو جائیں"

اس تعلیم نے شرم و حیا کا درجہ اس قدر بلند کر دیا کہ دورِ حاضر کے ذہن کے لیے اس کا تصور بھی دشوار ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ترین بیوی حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں ''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قابلِ ستر حصتہ کبھی نہیں دیکھا''

تہذیب و شرافت اور شرم و حیا کا ایک معیار یہ ہے اور دوسرا معیار وہ ہے جو اس وقت کی عریاں تہذیب پیش کر رہی ہے کہ بے حجابی کے بغیر وہ تکمیل ہی نہیں پاتی۔ یہاں یہ کیفیت کہ تعلقات کے فطری حدود کے اندر بھی شرم و حیا کا دامن نہیں چھوٹتا۔ وہاں عریانیت کا یہ عالم کہ مرد اور عورت دونوں برسرِ بازار ننگے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک طرف زبان ناشائستہ کلمہ تک نکالنے سے انکار کر رہی ہے اور دوسری طرف ہر گلی کوچہ میں داستانِ حسن و عشق سنائی جا رہی ہے اور محبت و جوانی کے نغمات گائے جا رہے ہیں۔ بتائیے سیرت کی تعمیر کا وہ انداز آدمی کو معصیت کے دلدل میں پھنسنے سے باز رکھ سکتا ہے یا یہ؟

محاسبۂ آخرت

حیا کا جذبہ بالکل فطری ہے لیکن اس کو حیات دوام، محاسبۂ آخرت کی فکر اور پرسشِ اعمال کے خوف سے حاصل ہوتا ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ یہ زوال پذیر ہو جائے۔ کیونکہ حیا کو زندگی اور فروغ دینے والی قوت اندیشۂ ملامت ہے لیکن جہاں یہ تصور ہو کہ آدمی سرزنش و عتاب اور مدح و توصیف کا مستحق بس یہی دنیا میں ہوتا ہے اور اس کے ماوراء کوئی ایسا عالم نہیں ہے جہاں ہمارے اعمال زیرِ بحث آ سکتے ہوں، تو آدمی معصیت کے لیے ایسے بے شمار گوشے تلاش کر سکتا ہے کہ گناہ گناہ نہ رہے بلکہ کارِ ثواب بن جائے اور خود ملامت کرنے

والی قوتیں اس پر مفتون ہو جائیں۔ اس کے برعکس اسلام یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ اس کائنات میں ایک ایسی ہستی ہے جس کی چشم نگراں سے اعمالِ انسانی کا کوئی گوشہ اوجھل نہیں ہو سکتا۔ نہ تو سحر میں واقع ہونے والے افعال اور نہ ظلمت شب میں کی جانے والی حرکات۔ جس کا علم جہاں کے بڑے واقعات سے لے کر عزم و ارادہ کی جنبش اور خطراتِ قلب تک پر یکساں حاوی ہے، اور ایک دن ضرور ایسا آنے والا ہے جب کہ تمام انسانوں کے سامنے میرے اعمال کا دفتر کھول دیا جائے گا اور مجھے اس لطیف و خبیر ہستی کو اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔ یہ یقین انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان اعمال سے احتراز کرے جو اس کو سرنگوں اور رسوا کرنے والے ہیں۔

آج اگر دو چار افراد کے سامنے ہمارا کوئی جرم آجاتا ہے تو شرمندگی سے نگاہیں جھک جاتی ہیں، حسرت و ندامت کے آنسوؤں سے گلا گھٹنے لگتا ہے جس شخص کا یہ ایمان ہو کہ کل تمام اہلِ دنیا اور ان کے آقا و مالک کے سامنے اس کا صحیفۂ سیّات پڑھا جائے گا اور اس کے داغ دھبے عالم آشکارا کیے جائیں گے۔ سوچیے اس سے زیادہ محتاط اور پاکیزہ کردار اور کون ہو سکتا ہے! اس یقین کو بڑھانے کے لیے قرآن مجید نے جگہ جگہ احوالِ قیامت کا تذکرہ اس انداز سے کیا ہے کہ ظالموں کے بے پایاں افسوس اور انتہائی ندامت کی تصویر کھنچ جاتی ہے کہ کس طرح ان کے چہروں پر ذلت و رسوائی کی پھٹکار ہوگی، شرمندگی سے ان کی آنکھیں نیچی اور دل دہل رہے ہوں گے! اس کے ساتھ وہ نیکو کاروں کی حسنِ عاقبت کا بھی بڑے دلکش و موثر پیرایہ میں ذکر کرتا ہے تاکہ آدمی کی نگاہ میں گناہ مکروہ اور نیکی محبوب ہو جائے:۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُسْفِرَةٌ. ضَاحِكَةٌ مُسْتَبْشِرَةٌ. وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ. تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ. أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ۔ (عبس ۳۸-۴۲)

"اس دن کتنے ہی چہرے روشن ہوں گے خنداں و شاداں، اور کتنے ہی چہرے ایسے ہوں گے جن پر گرد پڑی ہوئی ہوگی، ان پر سیاہی چڑھی ہوگی یہی لوگ ناشکرے اور بدکار ہیں۔"

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ ۖ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۖ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (یونس ۲۶-۲۷)

"جن لوگوں نے بھلائی کی روش اختیار کی ان کے لیے اچھا بدلہ ہے اور اس سے بھی زیادہ ان کو دیا جائے گا، اور ان کے چہروں پر تاریکی نہیں چھائی ہوگی اور نہ انہیں کسی قسم کی رسوائی لاحق ہوگی۔ یہ لوگ جنت والے ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے لیکن جن لوگوں نے برے عمل کیے (انہیں ان کی برائی کے مقدار ہی بدلہ دیا جائے گا اس لیے کہ برائی کا بدلہ اسی کے مثل دیا جاتا ہے (یعنی) ان سے ذلت و رسوائی چپکی ہوگی، انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا ان کے چہرے بالکل سیاہ ہوں گے، گویا کسی تاریک رات کے ٹکڑے نے انہیں ڈھانک لیا ہے، یہ لوگ دوزخ والے ہیں جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔"

خدائے تعالیٰ کی ذات اور روزِ جزا پر یقین ایک مومن کے ایمان کی اساس ہے۔ اس کے تمام اعمال اسی محور کے گرد چکر کاٹتے ہیں، اس عقیدہ کے دل و دماغ میں راسخ ہو جانے کے بعد تصور گناہ تک سوہانِ روح ہو جاتا ہے اور معصیت وجہ کیف و سرور نہیں رہتی بلکہ دل اس سے انقباض اور گھٹن محسوس کرنے لگتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستانِ حیات میں جہاں عبرت و بصیرت کے

بے شمار خزانے پوشیدہ ہیں وہاں یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ جو دل خشیت الٰہی کا مسکن ہو اور جن نگاہوں میں خالق کائنات کے جلوے سما گئے ہوئے ہوں انہیں دنیا کا کوئی حسن و جمال خیرہ نہیں کر سکتا۔ حسینان مصر اپنی دلربائیوں سے یوسفؑ پاک باز کو مسحور کرنا چاہتی ہیں، لیکن حضرت یوسفؑ ہیں کہ خدا کے خوف سے کانپ رہے ہیں اور اپنے ہاتھ تضرع و الحاح کے ساتھ اس کے روبرو پھیلائے ہوئے ہیں کہ ان آندھیوں میں تو ہی مجھے ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ میرے لیے ہر مصیبت قابل برداشت اگر اس کے نتیجہ میں میرا دامن حیات کے چھینٹوں سے محفوظ رہے۔

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ وَاِلَّا تَصْرِفْ
عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ (یوسف ۳۳)

"میرے رب مجھے قید خانہ محبوب ہے اس عمل سے جس کی مجھے یہ
دعوت دے رہی ہیں اور اگر تو نے ان کی چال کو مجھ سے نہیں پھیرا تو میں ان
کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور پھر نادانوں میں میرا شمار ہو گا۔"

فکر و نظر کے اس تفاوت کو دیکھئے کہ ایک طرف تو اہشات نفس کی تسکین کے لیے صد ہا چالیں چلی جاتی ہیں۔ ہزار طریقہ سے دام مکر و فریب پھیلایا جاتا ہے۔ تقویٰ و طہارت کی دنیا کو تاریک کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی جاتی ہے اور دوسری طرف یہی گوشت پوست اور جذبات و خواہشات والا انسان ہے کہ کائنات حسن و جمال کی ملتجیانہ پیش کش کو ٹھکرا دیتا ہے۔ اسے یہ پسند ہے کہ قید کی سختیاں جھیلے لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ دنیا کے عیش و آرام کے ساتھ معصیت کی گندگی اس سے چپکی رہے۔ اب آپ بتائیے جب تک کسی علیم و خبیر ہستی کی باز پرس کا یقین نہ ہو گیا یہ حیرت انگیز کردار وجود میں آ سکتا ہے؟ جو دل اس یقین سے خالی ہو گیا اس کے لیے ممکن ہے کہ جذبات کے سیلاب میں پہاڑ کی مانند اس طرح جما رہے؟

حضرت مریم علیہا السلام کے روبرو اچانک ایک متناسب الاعضا اور خوبصورت انسان نمودار ہوتا ہے۔ تنہائی میں حضرت مریم اسے دیکھتے ہی خوف خدا سے پکار اٹھتی ہیں۔

إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا

"میں تجھ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو خدا سے ڈرنے والا ہے"

جب اس "انسان" نے انہیں بتایا کہ وہ انسانی شکل میں فرشتہ ہے جو انہیں ایک صالح اور نیک اولاد کی خوشخبری سنانے کے لیے آیا ہے تو حضرت مریم حیرت سے پوچھتی ہیں۔

أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا

"میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ کسی بشر نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں بدکار رہی ہوں"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

سبعة يظلهم الله يوم لا ظل الا ظله، وشاب نشأ في عبادة الله ورجل دعته امرأة ذات منصب وجمال فقال اني اخاف الله ورجل ذكر الله خاليا ففاضت عيناه

"سات قسم کے آدمی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اس دن سایہ عطا کرے گا جب کہ اس کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ان میں دو نوجوان بھی ہے جس کی نشو و نما ہی اللہ کی بندگی میں ہوئی ہو۔ اور ایسا شخص جس کو کسی صاحب مرتبہ اور حسین و جمیل عورت نے معصیت کی پیش کش کی ہو اور اس پیش کش کو اس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا ہو کہ میں گناہ کرتے ہوئے اللہ سے ڈرتا

له بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الصدقہ بالیمین مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب اخفاء الصدقہ ترمذی ابواب الزہد، باب ما جاء فی الحب فی اللہ۔

ہوں۔ اور ایسا شخص جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرتا ہے اور اپنے اعمال کا خیال کر کے اس کی آنکھوں سے اشک ندامت رواں ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے وہ کردار جو قیامت کے خوف سے وجود میں آتا ہے، اور اسلام ایسی ہی اعلیٰ سیرت کی ایک مومن سے توقع رکھتا ہے۔

گناہ کا واضح تصور

اسلام معصیت کے خلاف انسان کے ان فطری جذبات کو ابھار کر چھوڑ نہیں دیتا بلکہ گناہ و ثواب حق و باطل اور حسن و قبح کا واضح تصور عطا کرتا ہے تاکہ حق کی راہ کا مسافر ظلمتوں میں بھٹکنے نہ پائے اور ایک طالب نجات خوب جان لے کہ معاصی کیا ہیں اور محاسن کیا؛ فضائل کن اعمال کو کہا جاتا ہے اور رذائل کن افعال کو؛ اور اگر کوئی بے راہ روی اور آوارگی ہی کو کمال فکر و نظر سمجھتا ہے تو اس انجام سے بھی واقف ہو جائے جس سے ہر غلط کار کو لازماً دوچار ہونا ہے۔

اس نے یہ تفصیلی ہدایات زندگی کے اور معاملات کی طرح تعلقات مرد و زن کے سلسلہ میں بھی دی ہیں اور بتایا ہے کہ دونوں کے درمیان روابط کی وہ کون سی نوعیت ہے جو خدائے تعالیٰ کی رضا کی موجب ہے اور وہ کون سی صورتیں ہیں جو مالک ارض و سماء کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور مبغوض ہیں اور دنیا و آخرت میں ناکامی اور خسران کا سبب بنتی ہیں۔

زوجین ایک دوسرے کیلیے وجہ آزمائش ہیں

جنسی میلان کے متعلق وہ پہلے قدم پر یہ اعلان کرتا ہے کہ اس امتحان گاہ حیات میں وہ خدا کی جانب سے بندہ کی ابتلاء و آزمائش کا ایک ذریعہ ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان بے پایاں کشش آدمی کو ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیتی ہے، جہاں سے اس کے حق پرست اور بندۂ ہوا و ہوس ہونے کا آسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف جذبات کے ہنگامے ہیں کہ اس کو ہر بندش کے توڑ پھینکنے پر آمادہ کرتے اور دوسری طرف خدا کا خوف اور عقل و فطرت کے تقاضے

اسے حدود کی پاسبانی پر مجبور کرتے ہیں اسی کش مکش آدمی کے دعوائی ایمان کے لیے ایک کسوٹی بن جاتی ہے کہ کہاں تک وہ اپنے عزم و اعتقاد میں سچا ہے۔

بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:۔

ما ترکت بعدی فتنۃ اضر علی الرجال من النساء[1]

"میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے زیادہ نقصان رساں اور کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔"

ایک اور موقعہ پر آپؐ نے فرمایا۔

ما من صباح الا وملکان ینادیان ویل للرجال من النساء وویل للنساء من الرجال[2]

"ہر صبح دو فرشتے اعلان کرتے ہیں کہ مردوں کے لیے عورتیں تباہ کن ہیں اور عورتوں کے لیے مرد۔"

زنا کی پاداش

کامیابی اسی شخص کے لیے ہے جو اس کش مکش میں عفت و پاک بازی کا دامن نہ چھوڑے اور جذبات کے اندھے بہرے تقاضے اس کو جادۂ مستقیم سے منحرف نہ کریں۔

---

[1] بخاری، کتاب النکاح باب ما یتقی من شؤم المرأۃ۔

[2] ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب فتنۃ النساء، مستدرک حاکم جلد ۴ صفحہ ۱۵۹ اس حدیث کے ایک راوی خارجہ بن مصعب کو بیشتر محدثین نے ضعیف اور ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ لیکن ابو حاتم کی رائے اتنی سخت نہیں ہے۔ یحییٰ بن یحییٰ اس کے صرف ایک سلسلۂ سند پر تنقید کرتے ہیں اور بقیہ سلسلوں کو صحیح سمجھتے ہیں مذکورہ بالا حدیث اس متروک سند سے نہیں ہے ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ ۷۶ تا ۷۸۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ
النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ. وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
يَلْقَ اَثَامًا (فرقان ۶۸)

"(اللہ کے نیک بندے وہ ہیں) جو اس کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جان کو اللہ نے محترم قرار دیا ہے اسے قتل نہیں کرتے الا یہ کہ حق اس کا تقاضا کرے اور وہ زنا نہیں کرتے۔ جو شخص ان بدعملیوں کا ارتکاب کرے گا وہ اپنے گناہوں کے نتائج سے ضرور دوچار ہوگا۔"

عن ابی سعیدؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الدنیا حلوۃ خضرۃ وان اللہ مستخلفکم فیھا فینظر کیف تعملون فاتقوا الدنیا واتقوا النساء فان اول فتنۃ بنی اسرائیل کانت فی النساء[1]

"حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا ایک میٹھی اور سرسبز شے ہے اور اللہ تمہیں اسی پر لذت دنیا کا جانشین بنانے والا ہے۔ پس تم دنیا کی رنگینیوں سے احتراز کرو اور عورتوں کے فتنہ سے بچو، تم سے اگلی امت بنی اسرائیل کی پہلی آزمائش عورتوں ہی کے ذریعہ ہوئی تھی۔"

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ خلافت ارضی کے وسیع اختیارات ان ہی بلند کردار اور صالح سیرت افراد کو سونپے جاتے ہیں جن کو یہ اختیارات دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں منہمک نہ کر سکیں خصوصاً جو پاسبانِ عصمت ہوں جن کی فرشتہ سیرتی معیارِ عفت و پاکبازی ہو۔ لیکن جس قوم کا دامن ان اخلاقی جواہر سے خالی ہو وہ خدا کی اس عظیم الشان نعمت سے محروم کر دی جاتی ہے۔ اگر

---

[1] رواہ مسلم و رواہ ابن ماجۃ فی ابواب الفتن غیر قولہ فان اول فتنۃ الخ۔

دیدۂ عبرت ہو تو گزشتہ امتوں سے سبق لیا جاسکتا ہے کہ کس طرح وہ اپنی ہوس ناکیوں کی وجہ سے منصب خلافت سے ہٹادی گئیں۔

عفت کی جزا

سوال یہ ہے کہ اس تباہی سے کیسے بچا جاسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب ایک اور سوال کے حل پر منحصر ہے اور وہ یہ کہ آدمی زنا کیوں کرتا ہے؟ اس کے دو ہی سبب ہیں، ایک تو یہ کہ وہ زنا میں لذت اور کیف محسوس کرتا ہے، اس سے اس کے جذبات کو آسودگی اور سکون میسر آتا ہے۔ دوسرا سبب یہ کہ وہ باعفت زندگی نہیں گزار سکتا اس لیے زنا پر مجبور ہے۔ یہ مجبوری خواہ ماحول اور معاشرے کی پیدا کردہ ہو یا غلط افکار و عقاید کی، یہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہو یا تہذیب و ثقافت کا جب تک ان دونوں محرکات کا سدِ باب نہیں کیا جاتا، دامنِ عفت محفوظ نہیں رہ سکتا۔

لہٰذا زنا اور اس کے نتائج سے تحفظ کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ اولاً انسان کی نگاہ میں معصیت کی رنگینیاں پھیکی پڑ جائیں اور اس کی جاذبیت ختم ہو جائے۔ ثانیاً اس کے سامنے صحیح راہیں کھلی ہوئی ہوں تاکہ وہ جذبات کے مقابلہ میں نہتا اور غیر مسلح ہو کر نہ رہ جائے اور ان صحیح راستوں میں اتنی دلکشی اور رعنائی پیدا کر دی جائے کہ اس کے لیے ناجائز رستوں کی طرف نگاہ اٹھانے کی ضرورت نہ رہے۔

اسلام نے معصیت کو بے کیف کرنے کے لیے ایک ایسی زندگی کا تصور پیش کیا ہے جو اس زندگی سے زیادہ رنگین اور زیادہ پُرکشش ہے جس کا عیش بے پایاں اور جس کی آسائشیں ختم نہ ہونے والی ہیں۔

ایک طرف وہ زنا اور بدکاری سے روکتا ہے اور دوسری طرف ایسی حسین و جمیل اور پری پیکر دوشیزاؤں کا وعدہ کرتا ہے جن کے تصور تک سے فکر و خیال کی قوتیں قاصر ہیں۔

حسن وجمال کے ان بے پایاں جلوؤں کا تصور معصیت کو بے نور بنا دیتا ہے اور اس ابدی کیف و سرور کی یاد دنیا کی فانی لذتوں کو بے نمک کر کے رکھ دیتی ہے۔ زندگی کے اس تابناک پہلو پر یقین، آدمی کے اندر ایک امنگ اور بے چینی پیدا کرتا ہے کہ وہ اسی کو اپنی جدوجہد کا نشانہ بنائے۔

نکاح کا مقصد

زنا کے دوسرے محرک کو ختم کرنے کے لیے اسلام نے جائز صورتوں کو بالکل آسان اور سہل الحصول کر دیا ہے، وہ ایک ایک فرد کو انتہائی ترغیب دیتا ہے کہ ان کو اختیار کرے تاکہ اپنے آپ کو معصیت کی آلودگی سے بچا سکے۔ اس کے نزدیک نکاح کا منشاء یہ نہیں ہے کہ گھر پر ہی ایک داشتہ موجود رہے بلکہ وہ نکاح کو معالیٔ اخلاق اور پاک دامنی کی نگہداشت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید نے اپنے خاص اندازِ بلاغت میں پیش کیا ہے:-

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ...... مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ۔

"قیدِ نکاح میں لانے والے مرد نہ کہ زنا کرنے والے ...... قید میں آنے والیاں نہ کہ زنا کرنے والیاں"

ان آیات میں قرآن مجید نے "احصان" اور "سفاح" کے دو الفاظ سے نکاح کے مقصد کو بالکل واضح کر دیا ہے۔

لفظ "سفح" کے اندر انڈیلنے اور بہا دینے کا مفہوم ہے۔ زنا کو "سفاح" اس لیے کہا جاتا ہے:-

لانّه كان عن غير عقد كانّه بمنزلة الماء الذي لا يحبسه شيئ۔[1]

۱؎ لسان العرب لفظ سفح۔

"کیونکہ وہ بغیر مقصد کے ہوتا ہے گویا وہ اس پانی کی طرح ہے جس کی راہ میں کوئی چیز مانع نہ ہو"

گویا بے قید شہوت رانی اس پانی کی طرح ہے جو بہا چلا جا رہا ہے اور جس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ چنانچہ جوئے کے ایسے تیر کو "السفیح" کہتے ہیں جس کا کوئی حصہ نہ ہو اور بازی میں جس کا وزن نہ محسوس کیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت زنا کی حرمت اور نکاح کے جواز کے دو اہم مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے، اوّل یہ کہ آدمی جنسی خواہش کے پورا کرنے میں بے قید اور آزاد نہ رہے بلکہ حدود کی پابندی کرے، دوئم یہ کہ یہ پابندی تحفظ عصمت کے لیے مفید اور کارآمد ہو۔ قرآن نے نکاح کے لیے دوسرا لفظ "احصان" کا استعمال کیا ہے "محصن" کے معنی ہیں محفوظ قلعہ، عمدہ گھوڑا اور ہتھیار وغیرہ، یہ معانی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آدمی نکاح کے ذریعہ حرام طریقوں سے محفوظ ہو جاتا ہے، وہ ایسے ہتھیار سے لیس ہوتا ہے جس کے ذریعہ جنسی ترغیبات کے ہر نار وا حملہ کو بے اثر کر سکے۔

اسی مفہوم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:۔

اذا احدکم اعجبته المرأة فوقعت فی قلبه فلیعمد الی امرأته فلیوقعها فان ذلک یرد ما فی نفسه [1]

"جب تم میں سے کسی کو کوئی عورت اچھی معلوم ہو اور اس سے اس کا دل متاثر ہو جائے تو اسے اپنی بیوی کے پاس جانا چاہیے اور اس سے ہم بستر ہونا چاہیے اس طرح اس کے دل میں پیدا شدہ خیالات دور ہو سکیں گے"

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ ایک مومن کس مقصد کے لیے نکاح کرتا ہے؟

---

[1] مسلم کتاب النکاح، باب ندب من رای امرأة فوقعت فی نفسه، ترمذی، ابواب الرضاع و الالفاظ لمسلم۔

اور تجرد کی زندگی سے وہ کون سے خطرات ہیں جن کے لاحق ہونے کا ہر آن اندیشہ رہتا ہے؟

حصولِ مقصد کے لیے زوجین کی معاونت

یہی وجہ ہے کہ شریعت شدت کے ساتھ زوجین سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے کی معاونت کریں اور کوئی ایسی روش نہ اختیار کریں جو چاک عصمت کا سبب بن سکتی ہو۔

عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دعا الرجل امرأتہ الی فراشہ فلم تأتہ فبات غضبان علیھا لعنتھا الملائکۃ حتی تصبح [1]

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص اپنی بیوی کو ہم بستری کے لیے بلائے اور وہ نہ آئے۔ اور اس وجہ سے خاوند رات بھر اس پر خفا رہے تو ایسی عورت پر فرشتے صبح تک لعنت بھیجتے ہیں۔"

ایک اور موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اذا الرجل دعا زوجتہ لحاجتہ فلتأتہ وان کانت علی التنور [2]

"جب کوئی شخص اپنی بیوی کو ہم بستری کے لیے بلائے تو اسے فوراً آجانا چاہیے خواہ وہ کھانے پکانے ہی میں کیوں نہ مصروف ہو۔"

اسلام یہ مطالبہ صرف عورت ہی سے نہیں کرتا بلکہ مرد کو بھی حکم دیتا ہے کہ عورت کے جذبات کی آسودگی کی فکر کرے ورنہ وہ ایک بہت بڑے حق کی

---

[1] بخاری، مسلم، ابوداؤد، کتاب النکاح۔ واللفظ لمسلم باب تحریم امتناعھا من فراش زوجھا۔

[2] ترمذی، ابواب الرضاع ما جاء فی حق الزوج علی المرأۃ و روی ابن ماجۃ والبیہقی والحاکم بمعناہ۔

عدم ادائیگی کا مجرم ہوگا۔

عبدالرحمن الجزری کہتے ہیں :-

وتحتم علی الرجل ان یعفها بقدر ما یستطیع کما تحتم علیها ان تطیعه فی ما یامرها به من استمتاع الا لعذر صحیح[1]

"چاروں فقہی مذاہب کے قوانین مرد پر لازم کرتے ہیں کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق عورت کو عفیف رکھے، اسی طرح عورت کے لیے بھی ضروری قرار دیتے ہیں کہ خاوند اگر اس سے آسودگی حاصل کرنا چاہے تو اس کے مطالبہ کو رد نہ کرے الایہ کہ کوئی صحیح اور جائز عذر ہو۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ایک خطبہ کے دوران میں فرماتے ہیں وَحَصِّنُوْا فروج هذا النساء[2] (ان عورتوں کی شرمگاہوں کو محفوظ رکھو) یعنی مرد پر ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی کی عصمت کا سامان کرے اور اسے بے راہ روی سے بچائے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :-

ویجب علی الرجل ان یطأ زوجته بالمعروف وهو من اوکد حقها علیه اعظم من اطعامها[3]

"بیوی کا بہت ہی مؤکد حق ہے، نان و نفقہ سے بھی عظیم تر۔"

عرب جاہلیت میں بعض اوقات شوہر، بیوی کو اس کے اس حق سے محروم کردیتا تھا، مثلاً اگر زوجین میں ناچاقی اور اختلاف ہو جاتا تو شوہر بیوی کو دکھ دینے

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد ۴ ص ۲۷۔

[2] مسند احمد حدیث ۲۸۳۔

[3] فتاوٰی ابن تیمیہؒ جلد ۳ ص ۱۴۸۔

کے لیے اس سے کہہ دیتا کہ تو مجھ پر میری ماں کی طرح حرام ہے اور ازدواجی تعلقات منقطع کر لیتا (اس طریقہ کو ظہار کہا جاتا ہے) یا ان تعلقات کے ادا نہ کرنے کی قسم کھا لیتا (اس کا نام ایلاء ہے)

اس طرح وہ بیچاری شوہر رکھنے کے باوجود بے شوہر کے پڑی رہتی اور اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کے لیے اس کے سامنے سوائے اس راستہ کے اور کوئی راہ نہ ہوتی کہ وہ بدکاری کرے۔

پہلی صورت اسلام کے مزاج سے بالکل متصادم تھی، اس لیے اس نے اسے حرام قرار دیا کیونکہ میاں بیوی میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے عصمت کا ذریعہ ہیں، یہ کتنی بڑی جہالت ہوگی کہ آدمی بیوی کو ماں اور بہن کی حیثیت عطا کر دے اور اس بند کو توڑ دے جو قرآنی عصمت کو روکے ہوئے ہے۔

چنانچہ قرآن مجید نے "ظہار" کے سلسلہ میں کہا کہ بیوی، بیوی ہی رہے گی۔ تمہاری لغو بیانی اور لاف گوئی سے ماں نہیں بن جائے گی۔ لہٰذا اگر تمہاری زبان اس قسم کے تباہ کن الفاظ نکالنے کی مجرم ہو تو بطور تاوان قدریہ ادا کرو اور بیوی کے بطور شوہر کے سے تعلقات رکھو، اس کے بیٹے نہ بنے رہو۔

ایلاء میں اس نے چار ماہ کی مہلت دی تاکہ اس مدت میں خاوند یہ فیصلہ کر لے کہ آیا بیوی کے ساتھ اس کا نباہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس عرصہ کے بعد وہ حقوق زوجیت ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ ان ذمہ داریوں سے دست کش ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب عورت اپنے کسی اور پاسبان کی تلاش میں آزاد ہوگی[1]

اس سلسلہ کا تیسرا اصول، شریعت جس کا ایک خاوند کو پابند بناتی ہے

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ مجادلہ آیت ۱ تا ۴، اور سورۂ بقرہ آیت ۲۲۶ و ۲۲۷ اور ۲ ۔ تفصیل فقہ کی مشہور کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ ہے کہ وہ صنفی خواہش کی تکمیل کا وہی فطری طریقہ اختیار کرے، جس سے عورت کے جذبات کی بھی آسودگی ہوتی ہو اور قطعاً کوئی ایسا طریقہ نہ اپنائے جو عورت کے جائز مطالبات نفس کو پامال کرنے والا ہو۔ اسی لیے شریعت نے عورت کے ساتھ لواطت کو حرام قرار دیا ہے، کیونکہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی دنی الطبع اور سفلہ شعار اپنے جذبات کی آگ بجھا لے، لیکن عورت اس سکون سے محروم ہو جائے گی جو با عفت زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملعون من اتی امرأۃ فی دبرھا[1]

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کی لعنت اور پھٹکار ہے اس شخص پر جو اپنی بیوی کے ساتھ لواطت کرے"

ایک اور روایت ہے:۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا ینظر اللہ الی رجل جامع امرأۃ فی دبرھا[2]

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو دیکھے گا بھی نہیں جس نے اپنی بیوی کے ساتھ لواطت کی"

اس ممانعت کی علت واضح کرتے ہوئے امام ابن قیم تحریر فرماتے ہیں:۔

فللمرأۃ حق علی الزوج فی الوطی ووطؤھا فی دبرھا یفوت حقھا ولا یقضی وطرھا ولا یحصل مقصودھا وایضا فان الدبر لم یتھیأ لھذا العمل ولم یخلق لہ وانما الذی ھیئ لہ الفرج فالعادلون عنہ الی الدبر خارجون

---

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی جامع النکاح۔

[2] ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب النہی عن اتیان النساء فی ادبارھن۔

عن حکمۃ اللہ وشرعہ جمیعاً[۱]

"بیوی کا خاوند پر یہ حق ہے کہ وہ اس کے ساتھ فطری طریقہ پر ہم بستری کرے، عمل لواطت سے خاوند اس کے اس حق کو تلف کرتا ہے، اور اس طبعی حاجت کو پورا نہیں کرتا اور نہ اس طریقہ سے عورت کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں، سرین اس گندے فعل کے لیے نہ تیار کی گئی ہے اور نہ بنائی گئی ہے، اس مقصد کے لیے تو صرف شرمگاہ ہے، پس جو لوگ خواہش نفس کے لیے اس فطری طریقہ کو چھوڑ کر غیر فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ اللہ کی حکمت اور اس کی شریعت سب کو پھاندتے ہیں۔"

احکام کی یہ سختی بلاوجہ نہیں ہے۔ اگر ازدواجی زندگی فرد کو عفت کی زندگی گزارنے میں مدد نہ دے اور اس کو اخلاقی پراگندگی اور پستی عمل سے نہ بچا سکے تو یہ رشتہ ایک لغو اور مہمل رشتہ ہے۔ اس کے بعد یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اسلام کا نظام معاشرت اپنے مطلوبہ ثمرات پیدا کر سکے گا۔ اس لیے شریعت ضروری سمجھتی ہے کہ نکاح زیادہ سے زیادہ عصمت کے تحفظ کا ذریعہ بنے۔

مقصد کے معاون اسباب

چنانچہ اس نے جائز حدود میں ایسی تمام صورتوں کے اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے جو مقصد نکاح میں معاون ہو سکتی ہیں اور ان تمام طریقوں سے اجتناب کا حکم دیا ہے جو آدمی کو شادی شدہ ہونے کے باوجود بے شادی شدہ کی پوزیشن میں رکھتے ہیں۔

اس پہلو سے جب ہم اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس نے کتنی دقت نظر اور گہرائی سے نکاح کو ایک محفوظ قلعہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس وقت ہم اس سلسلہ کے بعض پہلوؤں کی طرف چند جمل سے اشارات کرنا

---

[۱] زاد المعاد، جلد ۳ ص۲۰

کرنا چاہتے ہیں :-

(۱) محبت اور دل بستگی جنسی تعلقات کی جان ہے۔ محبت ہی سے اس چمن کو بہار ہے۔ محبت کے بغیر ان تعلقات میں وہ کیفیت نہیں پیدا ہوتی، جو مرد کو عورت کے لیے وجہ سرور اور عورت کو مرد کے لیے سکون قلب کا باعث بناتی ہے۔ یہ انتہائی اہم بات ہے کہ متقابل جنس کے جن افراد کے درمیان طبعی مناسبت اور لگاؤ پایا جائے شریعت ان کو نکاح کا مشورہ دیتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لم یر للمتحابین مثل النکاح ۔ ؎۱

"دو محبت کرنے والوں کے لیے نکاح سے بہتر اور کوئی چیز نہیں دیکھی گئی ہے"

اس حدیث کا قطعاً یہ منشا نہیں ہے کہ جائز تعلقات سے قبل ہی عشق بازی اور آشنائی شروع کر دی جائے۔ اس کا تصور بھی اسلام کے مزاج پر بار ہے۔ جو دین کسی نامحرم کی طرف آنکھ اٹھانے تک کو غلط سمجھتا ہو وہ داستان حسن و عشق سننے اور سنانے کی کیسے اجازت دے سکتا ہے! یہ حدیث ہمارے سامنے دو پہلو رکھتی ہے، ایک تو یہ کہ اگر کہیں فطری طور پر اسباب محبت موجود ہوں تو ان کو صحیح رخ دے دیا جائے تاکہ یہ اسباب محبت فرد اور معاشرہ کے لیے بجائے ضرر رساں ہونے کے سود بخش اور کار آمد بن جائیں۔ دوسرا پہلو یہ کہ مزاجوں کا اتحاد تحفظ عصمت میں بہت مددگار ہوتا ہے کیونکہ انسان کو جائز ذریعہ سے جتنی زیادہ وابستگی ہو گی، ناجائز ذرائع کی طرف اسی قدر اس کی توجہ کم ہو گی۔

(۲) جائز رشتوں میں دل کشی کو بڑھانے کے لیے شریعت سن و سال کی برابری کو بھی اہمیت دیتی ہے۔ کیونکہ عمروں کے بین تفاوت کے ساتھ تعلقات میں

؎۱ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب ما جاء فی فضل النکاح، مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۱۶۰۔

وہ جاذبیت مشکل ہی سے پیدا ہو سکتی ہے جو شوہر دل و روح کے لیے کوئی کشش نہ چھوڑے۔

اس نفسیاتی حقیقت کی طرف ذیل کے دو واقعات اشارہ کر رہے ہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنی جوانی میں ایک بیوہ سے شادی کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا:

فھلا جاریۃ تلاعبھا وتلاعبک وتضاحکھا وتضاحکک[1]

"کیوں نہیں تم نے کسی دوشیزہ سے شادی کی کہ تم اس کے ساتھ کھیلتے اور وہ تمہارے ساتھ کھیلتی اور تم اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے اور وہ تمہارے ساتھ مذاق کرتی"

اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک بیوہ جس کے جذبات بڑی حد تک سرد ہو چکے ہوں اس آتش جذبات کی متحمل نہ ہو سکے جو ایک نوجوان کے سینہ میں شعلہ فگن ہے۔

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ حضرت فاطمہؓ کا ان سے نکاح کر دیا جائے۔ آپ نے دونوں کی درخواست یہ کہہ کر رد کر دی کہ وہ چھوٹی ہے لیکن جب حضرت علیؓ نے یہی درخواست کی تو آپ نے قبول فرما لیا اور نکاح کرا دیا۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے اس کی پیش کش کی تھی۔

اس واقعہ پر امام نسائی نے اپنی سنن میں باب باندھا ہے "تزوج المرأۃ مثلھا فی السن" (عورت کا اپنے ہم سن مرد سے شادی کرنا) یعنی یہ مناسب اور اولیٰ ہے۔

امام نسائی کا یہ استدلال اس غرض سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے جس کے لیے شریعت نے نکاح پر زور دیا ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک اس کی تردید

---

[1] بخاری، کتاب النفقات، باب عون المرأۃ زوجھا فی ولدہ۔

کی کوئی وجہ نہیں الا یہ کہ شریعت کے عظیم تقاضے سن و سال کے فرق کو نظر انداز کرنے پر مجبور کرتے ہوں۔

(۳) شریعت اس مقصد کی خاطر نامحرم عورت کو دیکھنے تک کی اجازت دیتی ہے، تاکہ آدمی اپنے جذبۂ خاطر اور رغبت و شوق کا فیصلہ کر سکے کہ آیا یہ رشتہ عفت کی زندگی گزارنے میں معاون ہو سکتا ہے یا نہیں!

عن المغیرۃ بن شعبۃ رضی اللہ عنہ انہ خطب امرأۃ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انظر الیھا فانہ احری ان یؤدم بینکما لہ

"مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک عورت سے نسبت کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسے دیکھ لو کیونکہ یہ تم دونوں کے درمیان موافقت پیدا کرنے کی بہتر صورت ہے۔"

"یہ تم دونوں کے درمیان موافقت پیدا کرنے کی بہتر صورت ہے" کے الفاظ صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ شریعت چاہتی ہے کہ زوجین کے درمیان رشتۂ محبت محکم تر ہو اور اس میں کوئی ایسا پیچ نہ آنے پائے جس سے نکاح کی غرض کو دھکا لگتا ہو، کیونکہ زوجیت کی دنیا میں اختلاف و نفرت کے راہ پانے کے بعد حریف عصمت طاقتیں بآسانی حملہ آور ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے نکاح فسخ کر دیے جن میں عورت، اپنے خاوند کی بدشکلی کی وجہ سے اس کی رفاقت پر آمادہ نہیں تھی۔

(۴) اس کشش و جاذبیت کو فزوں تر کرنے کے لیے اسلام ازدواجی زندگی میں عورت کے لیے زینت و آرائش کو مستحسن سمجھتا ہے، جب کہ وہ ایک نامحرم کے سامنے عورت کو آراستگی اور بناؤ سنگار کی نمائش کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ پہلی صورت میں صنفی کشش کو تقویت دینا چاہتا ہے اور دوسری صورت میں اس کا منشا یہ ہے کہ اسے کمزور سے کمزور تر کر دیا جائے۔

دورِ اوّل کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عورتیں، اپنے خاوندوں کی خاطر

لہ ترمذی، ابواب النکاح باجاء فی النظر الی المخطوبۃ نسائی، ابن ماجہ، ابواب النکاح۔

زیب و زینت کا سامان کیا کرتی تھیں۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عثمان بن مظعونؓ کی بیوی کو ان اسباب زینت سے خالی پایا جن سے اس دور کی عورت، شوہر کی موجودگی میں بالعموم آراستہ ہوتی تھی۔ آپ نے فوراً دریافت فرمایا، کیا عثمانؓ کہیں سفر پر گئے ہوئے ہیں؟[۱]

اس حدیث کی شرح میں امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فاستنكار عائشة عليها ترك الخضاب والتطيب يشعر بأن ذوات الأزواج يحسن منهن التزين للأزواج بذالك[۲]

"خضاب اور خوشبو کو چھوڑ دینے پر حضرت عائشہؓ کا ان سے تعجب کے ساتھ سوال کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ سہاگنوں کو اپنے شوہروں کی خاطر زیب و زینت کرنا پسندیدہ ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی جب کسی دور کے سفر سے واپس ہو تو اچانک گھر میں گھس نہ جائے کیونکہ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ ایسے نکلے پن اور ناپسندیدہ حال میں گھر والوں پر اس کی نظر پڑے جو نفرت کا موجب ہو۔

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک غزوے سے واپسی کے بعد ہم اپنے گھر جانے لگے تو آپ نے فرمایا:

امهلوا حتى تدخلوا ليلا أي عشاء لكي تمتشط الشعثة وتستحد المغيبة[۳]

"ابھی رک جاؤ اور رات کو اپنے اپنے گھر جاؤ تاکہ جس عورت نے

---

[۱] مسند احمد، جلد ۶ صفحہ ۱۰۶

[۲] نیل الاوطار، جلد ۶ صفحہ ۲۲۴۔

[۳] بخاری، کتاب النکاح، باب طلب الولد۔ مسلم، کتاب الرضاع، باب استحباب نکاح البکر۔

کنگھی چوٹی نہیں کی ہے وہ کنگھی چوٹی کرلے اور جس عورت کا شوہر غائب تھا وہ نہا دھو کر صاف ستھری ہو جائے۔"

(۵) اسلام نے جیسے مرد کے جذبات کا پاس و لحاظ رکھا ہے ویسے ہی وہ عورت کے جذبات کے احترام کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ اس نے مختلف اسالیب سے اس حقیقت کی توضیح کی کہ عورت محض شہوت رانی اور تکمیل ہوس کا کوئی آلہ ہے اور نہ وہ احساسات سے خالی کوئی مضغۂ گوشت ہے بلکہ اس کا دل لطیف ترین احساسات کا نشیمن ہے، جو ایسے ہی لطافت اعمال اور نزاکت کردار کے متقاضی ہیں معاملات کی ناہمواری اور کرختگی اس کے جذبات کے آبگینوں کو چور چور کر سکتی ہے، پھر وہ ایک پتھر ہو جائے گی جسے توڑا تو جا سکتا ہے لیکن اس سے وہ نگینہ نہیں تراشا جا سکتا جس کی تابانی قلب و نظر کو اپنا گرویدہ کر لے اور معیت کے ہر نظارے سے دلکشی چھین لے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

ان المرأۃ کالضلع اذا ذھبت تقیمھا کسرتھا وان ترکتھا استمتعت بھا وفیھا عوج۔ [۱]

"عورت پسلی کے مانند ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو اسے توڑ دو گے لیکن اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دو گے تو اس کی کجی کے باوجود اس سے فائدہ حاصل کر سکو گے"

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:۔

لا یجلد احدکم امرأتہ جلد العبد ثم یجامعھا فی آخر الیوم۔ [۲]

---

[۱] بخاری، کتاب النکاح، باب المداراۃ مع النساء۔ مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء۔ ترمذی، ابواب الطلاق واللفظ لمسلم۔

[۲] بخاری، کتاب النکاح، باب ما یکرہ من ضرب النساء۔

"ایسا نہ ہو کہ تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح پیٹنے لگے اور پھر شام کو اس سے ہم بستری کرے"

عبداللہ بن عباس رض فرماتے ہیں کہ میں اپنی بیوی کے (ذوق کی تسکین) کے لیے آراستہ پیراستہ رہنا پسند کرتا ہوں جیسا کہ خود میری خواہش ہوتی ہے کہ وہ میرے لیے زیب و زینت کے ساتھ رہے۔[1]

(۷) زوجین کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں اسلام نے حسن خلق اور بلند کرداری کی جو تعلیم دی ہے اس کی بھی ایک اہم غرض یہی ہے کہ دونوں کی باہمی آمیزش اور کشیدگی اس جاذبیت کو ختم نہ کر دے جو صنفی آوارگی سے بچائے رکھتی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ آپ نے ازواج مطہرات کے ساتھ ایسے امور میں دلچسپی لی جو بہت ممکن ہے زہد و اتقا کے عام تصور کے خلاف معلوم ہوں۔ لیکن درحقیقت ان سے ازدواجی تعلقات میں شگفتگی اور حسن پیدا ہوتا ہے۔

اس قسم کے چند واقعات ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں جن سے ہر شخص ان کی تہ میں کام کرنے والی روح کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رض کو گیارہ عورتوں کی ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ جن میں سے بیشتر نے اپنے شوہروں کی شکایت کی تھی، لیکن گیارھویں (ام زرع) نے کہا کہ میں اپنے شوہر ابو زرع کی کیا مدح و توصیف کر سکتی ہوں! انہوں نے تو میرے کانوں کو زیورات سے ڈھک دیا اور میرے دبلے پتلے بازوؤں کو پر گوشت بنا دیا، غرض مجھے خوش و خرم رکھنے کا اتنا سامان کیا کہ میری زندگی مسرت سے گزرنے لگی۔ میری خوش بختی کا کیا کہنا۔ میں بکریوں والے کم حیثیت خاندان میں عسرت کی زندگی گزار رہی تھی۔ مجھے انہوں نے گھوڑے، اونٹ اور

---

[1] السنن الکبریٰ بیہقی، جلد ۷، صفحہ ۲۹۵۔

کھیتی باڑی والے لوگوں میں بسایا۔ میں ان سے بے تکلف گفتگو کرتی لیکن کبھی انہوں نے میری زبان نہیں پکڑی۔ میں بلا کسی خوف کے صبح تک آرام کرتی اور لذیذ ترین کھانے اور پینے کی چیزیں سیر ہو کر کھاتی اور پیتی۔

اس کے بعد آپ نے حضرت عائشہ رض سے فرمایا اے عائشہ رض! میں تیرے حق میں ابو زرع ہوں[1] ایک موقع پر حضرت عائشہ رض نے اپنے بارے میں ایک دلچسپ تمثیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی تھی۔ یا رسول اللہ! بتایئے! اگر درختوں والی وادی میں آپ کا گذر ہو تو کیا آپ اپنی بکریوں کو کسی برگ دار درخت کے پاس چراتے یا ایسے پیڑ کے پاس جسے جانوروں نے صاف کر دیا ہو؟ آپ نے جواب دیا! پتوں والے درخت ہی کے پاس چراتا۔[2] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں صرف حضرت عائشہ رض باکرہ تھیں، باقی سب بیوہ تھیں۔ غور کیجئے! یہ کنایہ مزاج کے حسن اور لطافت ذوق کی کتنی عمدہ دلیل ہے!

حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ ایک سفر میں میں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوڑ لگائی تھی۔ چونکہ اس وقت میں دُبلی پتلی تھی اس لیے آگے نکل گئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہم دونوں میں مسابقت ہوئی تو میں پیچھے رہ گئی کیوں کہ میں ان دنوں فربہ ہو گئی تھی۔ اس پر آپ نے فرمایا یہ اُس پہلے کا بدلہ چکا دیا۔[3]

---

[1] اس حدیث کو امام بخاری (کتاب النکاح، حسن المعاشرۃ مع الاہل) مسلم اور نسائی وغیرہ نے نقل کیا ہے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری کہانی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنائی اور بعض روایات ظاہر کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف آخری فقرہ ارشاد فرمایا۔ حافظ ابن حجر کی تحقیق یہ مکمل داستان نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے ادا ہوئی تھی۔ فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۲۰۲

[2] بخاری، کتاب النکاح، باب نکاح الابکار۔

[3] مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۳۹۔ ابو داؤد کتاب الجہاد، باب فی السبق علی الرجل۔

صحاح کی مشہور روایت ہے کہ کسی عید میں حبشی کھیل کود کی نمائش کر رہے تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہ رض سے دریافت کیا کہ کیا تماشہ دیکھو گی ؟ یا حضرت عائشہ رض نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے انہیں اپنے پیچھے کھڑا کر لیا جب حضرت عائشہ رض اکتا گئیں تو آپ نے کہا اچھا تو اب چلی جاؤ۔[1]

حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ گوشت سے بھری ہوئی ہڈی تھوڑی سی کھا کر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتی تھی اور آپ اسے اسی جگہ سے تناول فرماتے جہاں سے میں نے چھوڑا تھا۔ اسی طرح میں کوئی چیز پی کر آپ کی طرف بڑھاتی اور آپ اپنا دہن مبارک پیالے کے اسی حصہ کو لگا کر پیتے تھے جہاں میں نے پیا تھا۔[2]

اس قسم کے واقعات اگر جمع کیے جائیں تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ چند مثالیں بھی اس بات کا با آسانی ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ اسلام ازدواجی زندگی کو کوئی ضابطہ کی بندش نہیں بنانا چاہتا بلکہ وہ اس میں اتنی رنگا رنگی اور جمال آرائی پیدا کر دیتا ہے کہ وہ خود ایک عالم کیف و سرور بن جاتی ہے اور جنسی داعیات میں سے کوئی ایسا داعیہ نہیں رہ جاتا جس کا ازدواجی رشتہ میں اس نے سامان نہ کیا ہو۔

احتیاطی تدابیر

اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ جنسی تقاضے ایسے طوفانوں کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کس وقت سیرت و کردار کی دنیا کو تہ و بالا کر دے۔ اس لیے شریعت فرد کو بعض ایسی احتیاطی تدابیر کے اختیار کرنے کا حکم دیتی ہے جو معصیت کی راہ کو تنگ سے تنگ کرنے والی ہیں اور جن پر عمل پیرا ہو کر انسان بڑی حد تک جنسی آلودگیوں سے دامن کش رہ سکتا ہے۔

قرآن نے اس سلسلہ میں ایک اہم اصول ہمیں عطا کیا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (زنا کے قریب نہ جاؤ کیونکہ وہ

---

[1] بخاری، کتاب العیدین، باب الحراب والدرق یوم العید، مسلم کتاب العیدین۔

[2] مسند احمد، جلد ۶ ص ۶۲، مسلم کتاب الحیض۔ نسائی کتاب الحیض۔ ابن ماجہ، ابواب الطہارۃ۔

بے حیائی اور بری راہ ہے۔ (بنی اسرائیل-۳۲) غور کیجیے! زنا سے اجتناب کی تعلیم کے لیے کتنا اچھوتا اسلوب اختیار کیا گیا ہے! اس انداز بیان نے انسانی نفسیات کے ایسے گوشوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی عدم رعایت سے موجودہ دور فحش کا دور بن گیا ہے۔ قرآن صرف زنا سے ملوث نہ ہونے ہی کا حکم نہیں دیتا بلکہ ان تمام صورتوں سے بھی احتراز کا حکم دیتا ہے جو بظاہر کتنی ہی معصوم اور بے ضرر کیوں نہ معلوم ہوں لیکن بالآخر اس عمل بد تک پہنچانے والی ہیں۔

اگر آپ انسانی اعمال کا ذرا ژرف نگاہی سے تجزیہ کریں تو وہ آپ کو مربوط اور منظم معلوم ہوں گے۔ اور ان میں ایک طرح کا تدریجی ارتقا ملے گا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ آدمی ایک ہی جست میں نیکی اور تقویٰ کے تمام مراحل طے کر لے یا گناہ کی آخری سرحد پر پہنچ جائے بلکہ اس کا ہر پہلا قدم دوسرے قدم کے لیے محرک کا کام دیتا ہے۔ جس طرح داخلی اور خارجی عوامل انسان کے فکر و خیال پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح اس کے اپنے اعمال بھی اس کے مزاج اور داخلی کیفیات کو متاثر کرتے ہیں۔ ایک شخص جھوٹ بولتا ہے، فریب دیتا ہے اور خیانت کرتا ہے تو یہ اعمال اس کی اگلی پچھلی زندگی سے بے تعلق نہیں ہوتے ان میں ماضی کی جھلک اور مستقبل کا نشان ملتا ہے وہ اس کے اگلے اقدامات کے لیے سمت سفر متعین کرتے ہیں اور ان میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ یہی حال نیکی کا ہے۔ اس کی ہر منزل دوسری منزل تک پہنچانے والی اور اس کو آسان کرنے والی ہوتی ہے۔

اسلام انتہائی باریک بینی کے ساتھ نشان دہی کرتا ہے کہ آدمی کن حدود کے اندر اپنی خواہشات اور جذبات کی تسکین کر سکتا ہے اور کہاں سے تباہی و بربادی کی سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس نے ان اعمال و افعال ہی کو ممنوع نہیں قرار دیا جو انسانیت کے لیے ہلاک ہیں بلکہ ان تمام راہوں پر بھی قدغن لگائی ہے جو تباہی کا پیش خیمہ ہیں اور جن پر چلنے والا کسی گھناؤنے نتیجے سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ موقع ان مباحث کی تفصیل کا نہیں ہے۔ ہم اپنے موضوع کی مناسبت سے چند ایسی پیش بندیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جن پر شریعت نے خاص زور دیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "ابن آدم کے زنا کی مختلف صورتیں ہیں۔ آنکھوں کا زنا، چلنا، نفس کا زنا خواہش اور آرزو، اور آخر میں شرم گاہ ان مقدمات کی تصدیق یا تکذیب کر دیتی ہے۔" [1]

یہ حدیث بتاتی ہے کہ شریعت کی نگاہ میں محرکات معصیت بھی معصیت ہی کا حکم رکھتے ہیں اسی لیے وہ ابتدائی اقدامات پر بھی زنا ہی کا حکم لگاتی ہے۔ دوسرے مقامات پر شریعت نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ آیئے اب ہم اس کا مطالعہ کریں:۔

غض بصر

قدرت نے انسان کے اندر ذوق جمال پیدا کیا ہے اس لیے وہ کائنات کے ایک ایک ذرہ میں نکھار اور جمال کا متلاشی ہے۔ وہ دنیا کی کسی بھی شے کو بے ڈھب اور غیر ہنگم حالت میں نہیں بلکہ حسن و خوبصورتی کے قالب میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ شب و روز قدرت کے دلکش مناظر سے کیف و سرور حاصل کرتے ہوئے اکتاتا نہیں کیونکہ وہ حسین ہیں، ان میں دل ربائی اور زیبائی ہے۔ اسی ذوق کی جلوہ گری ہے جو تمدن کے مختلف مظاہر میں کار فرما نظر آتی ہے۔
یقیناً یہ ذوق انسان کا ایک فطری ذوق ہے اور اس کی تکمیل نہ کرنا انسانیت پر ظلم کے مترادف ہوگا۔ اس کارآمد ذوق کے ختم کرنے کے بعد دنیا تمدن سے

---

[1] امام ابوداؤد نے اس حدیث کے مختلف ٹکڑوں کو مختلف سندوں سے نقل کیا ہے ہم نے ان سب کا ایک ساتھ ترتیب کا ترجمہ کر دیا ہے۔ (کتاب النکاح باب ما یؤمر بہ من غض البصر) مسلم میں یہ پوری حدیث ایک ہی سند سے روایت کی گئی ہے نیز اس کا بیشتر حصہ بخاری میں بھی ہے۔

ان بے شمار فوائد سے محروم ہو جائے گی جن سے آج وہ مالا مال ہے۔ لیکن جمال پسندی کا یہ رجحان اسی وقت تک خیر اور افادیت کا حامل رہتا ہے جب تک کہ وہ حدودِ اعتدال میں رہے۔ اس کی بے اعتدالی تہذیب کے بگاڑ اور فساد کا موجب بنتی ہے۔ یہ بے اعتدالی زندگی کے اور میدانوں کی طرح صنفی خواہش کے میدان میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔

لیکن فرق یہ ہے کہ مقابل صنف کا کوئی رُخِ زیبا جتنی سرعت کے ساتھ انسان کو کج رو بنا سکتا ہے اتنی تیزی سے حسن و جمال کا اور کوئی مظہر اس کو فساد کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ اس کی ایک وجہ تو خود انسان کی ساخت کا حسن ہے کہ وہ اس قدر متناسب الاعضاء اور موزوں قد و قامت کا مالک ہے کہ دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دوسری اہم ترین وجہ یہ ہے کہ جنسِ مقابل اپنے قد و قامت کی درستی اور بناوٹ کی خوبصورتی کے ساتھ انسان کے ایک زبردست داعیہ کی تسکین کا مرکز ہوتی ہے اور وہ بے اختیار اس کی طرف رغبت اور کشش رکھتا ہے۔ اس لیے شریعت جنسِ مقابل کے نظارہ سے روکتی ہے کیونکہ نظر کی آوارگی کے بعد جنسی آوارگی سے بچا رہنا انتہائی مشکل ہے۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:-

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ٥ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ ٥ (النور)

"(اے نبیؐ) تم مومنوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے حق میں بہت بہتر ہے اور بلا شبہ اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے باخبر ہے، اور ایمان والی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ (بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں"

قرآن مجید نے غضِ بصر اور شرمگاہ کی حفاظت کا بالکل ایک ساتھ ذکر کیا ہے

گویا پاک دامنی کے لیے نظر کی پاکی پہلی شرط ہے۔

اسی مفہوم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے انداز سے پیش فرمایا ہے:۔

یا علی لا تتبع النظرۃ النظرۃ فان لک الاولیٰ ولیست لک الآخرۃ۔[1]

"اے علی رضؓ! نظر کے پیچھے نظر نہ دوڑاؤ۔ کیونکہ پہلی (اتفاقی) نظر تو تمہارے لیے ہو سکتی ہے لیکن دوسری کا کسی طرح تمہیں حق نہیں پہنچتا"

یعنی پہلی نگاہ اتفاقی ہوتی ہے اس لیے قابل عفو و درگزر ہے۔ لیکن قصد و ارادہ کے ساتھ نظر بازی قطعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ یہی شیطانی تیر ہیں جو شرافت اخلاق کو چھلنی کر کے رکھ دیتے ہیں۔

حضرت جریر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا اگر کسی نامحرم پر اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کیا جائے؟ آپ نے جواب دیا فوراً اپنی نظر پھیر لو۔[2]

محرمات کے ساتھ اختلاط کی شریعت اس لیے اجازت دیتی ہے کہ یہاں بالعموم جذبات محبت موجزن ہوتے ہیں۔ اگر کوئی در توسط ان جذبات محبت کو ہوس اور شہوت کی آگ میں تبدیل کر کے نظر اٹھاتا ہے تو شریعت کی نگاہ میں وہ حرام کا ارتکاب کرتا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:۔

فلو نظر الی امہ واختہ وابنتہ یتلذذ بالنظر الیہا کما یتلذذ بالنظر الی وجہ المرأۃ الاجنبیۃ کان معلوماً لکل

---

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی ما یؤمر بہ من غض البصر، ترمذی، ابواب الآداب، باب ما جاء فی نظرۃ الفجاءۃ۔

[2] مسلم کتاب الادب، باب نظر الفجاءۃ، ترمذی، ابواب الآداب، ابوداؤد، کتاب النکاح۔

اجنبیات فهذا حرام۔ [1]

"اگر کوئی شخص اپنی ماں، بہن یا بیٹی کو اس خیال سے دیکھتا ہے کہ ان سے لذت حاصل کرے جس طرح وہ ایک اجنبی عورت کو دیکھ کر لذت یاب ہوتا ہے تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ حرام ہے۔"

سماع پر پابندی

بینائی کی طرح قوت سامعہ بھی انسان کے جذبات و احساسات پر گہرے اثرات ڈالتی ہے۔ وہ نفع بخش بھی ثابت ہو سکتی ہے اور نقصان دہ بھی۔ کسی قانون کی کامیابی یہ ہے کہ اس کے سود و زیاں کے خطوط کو واضح الفاظ میں نمایاں کر دے۔ اسلام نے ماننے والوں کو صاف صاف بتاتا ہے کہ وہ اس چمنستانِ عالم کے ہر حسین نغمے سے اپنے ذوقِ سماع کو بہرہ یاب کر سکتے ہیں، الّا یہ کہ وہ ہیجِ شہوت اور غارت گرِ اخلاق ہو کیونکہ عفت اور کردار کی پاکیزگی انسانیت کا تاج ہے۔ اس کے لیے دنیا کے ہر نشاط و سرور کو قربان کیا جا سکتا ہے لیکن کسی عیش و راحت کے عوض اس کی سودے بازی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اس کے نزدیک موسیقی اور آلاتِ موسیقی کے استعمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ گانے کی حرمت کی نفسیاتی توجیہ کے لیے ہم اس وقت حافظ ابن جوزیؒ کے الفاظ مستعار لیتے ہیں:-

اعلم ان سماع الغناء یجمع شیئین احدهما انه یلهی القلب عن التفکر فی عظمة الله سبحانه والقیام بخدمته والثانی انه یمیله الی اللذات العاجلة التی تدعوا الی استیفائها من جمیع الشهوات الحسیة ومعظمها النکاح ولیس تمام لذته الا فی المتجددات ولا سبیل الی کثرة المتجددات من الحل فلذالک یحث علی الزنا فبین الغناء والزنا

---

[1] فتاوی ابن تیمیہ جلد ا صفحہ ۴۳۔

تناسب من جهة ان الغناء لذة الروح والزنا اكبر لذة النفس ولهذا جاء في الحديث الغناء رقية الزنا؎

"معلوم ہونا چاہیے کہ گانے کے سننے سے دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں پہلی یہ کہ گانا آدمی کو خدا کی عظمت میں تفکر اور اس کے حقوق کی ادائیگی سے غافل کر دیتا ہے۔ دوسری خرابی گانے کی یہ ہے کہ وہ آدمی کو دنیوی لذتوں کی طرف مائل کر دیتا ہے، جو اس کو تمام مادی خواہشات کی تکمیل پر مجبور کرتے ہیں۔ ان خواہشات کے سرفہرست صنفی خواہش ہے اور صنفی خواہش کی پوری طرح آسودگی نئے نئے تعلقات کے بغیر مشکل ہے ظاہر ہے کہ اس قسم کے تعلقات کے لیے جائز حدود میں گنجائش نہیں۔ اس طرح غنا آدمی کو زنا پر اکساتا ہے۔ پس گانے اور زنا کے درمیان ایک طرح کی مناسبت ہے، بایں طور کہ گانا روح کی لذت تو زنا نفس کی ایک بڑی لذت ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ گانا آدمی کو زنا کی طرف لے جانے میں جادو کا حکم رکھتا ہے"

زبان کی حفاظت

زبان کے معاملے میں انسان بہت ہی بے احتیاط واقع ہوا ہے۔ حالانکہ جو کلمات ہماری زبان سے نکلتے ہیں وہ فضا میں تحلیل ہو کر نہیں رہ جاتے بلکہ ہمارے افکار و خیالات پر عکس ریز ہوتے ہیں زبان کے یہ اثرات سمع و بصر کے اثرات سے بھی زیادہ اپنے اندر وسعت اور گہرائی رکھتے ہیں کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز آپ کے لیے باصرہ نواز اور راحت گوش ثابت ہو رہی ہو وہ خود کو بھی کسی تاثر کے حوالے کر دے، برعکس اس کے زبان اظہار خیال کا ایسا ذریعہ ہے جس کے توسط سے آدمی اپنے اچھے یا بُرے خیالات کا پرتو اپنے مخاطب پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس کوشش کے نتیجہ میں مخاطب کا ردّ عمل اس کے موافق ہو تو اس کے خیالات کو مزید تقویت پہنچتی ہے اور وہ انفرادیت کے دائرہ سے نکل کر اجتماعی

؎ نقد العلم والعلماء ص ۲۴۳

شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اسی تناسب سے ان کی قوت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

خیال فرمایئے! اگر یہ عظیم قوت راہِ راست سے ہٹ جائے اور جذبات جیسے نازک اور کمزور گوشوں پر حملہ آور ہو تو کس قدر فتنہ سامانی پیدا کر سکتی ہے۔

عن سہل بن سعدؓ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من یضمن لی ما بین لحییہ وما بین رجلیہ اضمن لہ الجنۃ[1]

"حضرت سہل بن سعدؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جو شخص اپنی زبان اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی مجھے ضمانت دے، میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں"

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

من وقاہ اللہ شر ما بین لحییہ وشر ما بین رجلیہ دخل الجنۃ[2]

"جس شخص کو اللہ تعالیٰ زبان اور شرمگاہ کے شر سے بچا لے وہ جنت میں داخل ہو جائے گا"

لباس کا اہتمام

عریانی اس دور کا ایک عظیم فتنہ ہے جس نے جذبات کی دنیا میں آگ لگا دی اور انسان کو شہوت اور ہوس کا دیوانہ بنا دیا ہے۔ صنفِ مقابل ویسے

---

[1] بخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان۔ ترمذی، ابواب الزہد، باب ما جاء فی حفظ اللسان۔

[2] ترمذی، ابواب الزہد۔

بھی اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے۔ عریانی اس جاذبیت کو اس قدر سخت کر دیتی ہے کہ آدمی کا معصیت سے دور رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لیے فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ فحاشی اور بدکاری کے اس محرک کو ختم کیا جائے چنانچہ اسی مطالبہ فطرت کے تحت آدمی نے لباس کا اہتمام کیا۔

لیکن تہذیب نو کے نزدیک معراج آدمیت یہ ہے کہ آدمی عفت و پاکدامنی کے تصور تک سے ناآشنا ہو، چونکہ لباس اس ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ تھا اس لیے اس نے اسے اتار پھینکا۔ اسلام کی نگاہ میں زنا حرام ہے اور وہ آدمی کو اس جرم سے باز رکھنا چاہتا ہے اس لیے وہ اس مانع معصیت قوت کو اور مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ اس نے تفصیل کے ساتھ مرد اور عورت کے حدود ستر کا تعین کیا ہے اور دونوں کو ان کے التزام کی سخت تاکید کی ہے۔

اسلام عریانی کو کس قدر بلا کنعف خیز تصور کرتا ہے اس کا اندازہ آپ ایک حدیث سے فرما سکتے ہیں:

عن عائشۃ رض قالت سمعت رسول اللہ یقول ایما امرأۃ نزعت ثیابھا فی غیر بیت زوجھا ھتکت ستر ما بینھا وبین ربھا[1]

"حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کے مکان کے علاوہ کسی اور جگہ اپنے کپڑوں کو اتارتی ہے وہ اپنے اور اپنے رب کے تعلق کو توڑتی ہے۔"

نامحرم کے ساتھ تنہائی کی ممانعت

تحفظ عصمت کی راہ میں ایک اور مرحلہ آتا ہے جو نظربازی، ہیجان انگیز نغموں، فحش گفتگو اور عریانی سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے اور وہ ہے صنف مقابل

---

[1] مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۱۷۳۔

کے ساتھ تنہائی جبکہ دونوں کے درمیان کوئی طبعی حجاب بھی نہ ہو ایسے نازک موقع پر کوئی ایسا خارجی دباؤ نہیں ہوتا جو انسان کو جذبات کے ہاتھوں مارے جانے سے بچا سکے۔

اسلام انسان کی اس کمزوری کے پیش نظر کسی نامحرم کے ساتھ خلوت کو سختی سے منع کرتا ہے۔

عن جابرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تلجوا علی المغیبات فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم[1]

"حضرت جابرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جن عورتوں کے ساتھ محرم مرد نہ ہوں ان کے ہاں نہ جاؤ کیونکہ شیطان آدمی کے اندر خون کی طرح گردش کرتا رہتا ہے (پتہ نہیں کب وہ آدمی کو گناہ کے دلدل میں پھنسا دے)۔"

شریعت نے انسان کو پاکباز بنانے اور معصیت سے بچانے کے لیے جو پابندیاں اس پر عائد کی ہیں ان کی مزید عنوانات کے تحت تشریح کی جا سکتی ہے لیکن وہ کسی نہ کسی صورت سے مذکورہ بالا تفصیل کے تحت آجاتے ہیں اس لیے انہیں یہاں نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام فرد کی تربیت کے ساتھ معاشرہ کی اصلاح کا کیا طریقہ اختیار کرتا ہے جس سے عفت کی زندگی گزارنے میں مدد ملے۔

معاشرہ کی اصلاح

ہر معاشرہ کے کچھ بنیادی مطالبات ہوتے ہیں جن کا پورا کرنا افراد کے لیے

---

[1] مسلم، کتاب اللباس والزینۃ۔ ترمذی، کتاب النکاح۔

ناگزیر ہوتا ہے۔ ان مطالبات سے اعراض یا مخالفت کو کوئی بھی معاشرہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان تقاضوں سے انحراف سوسائٹی سے بغاوت کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اگر کوئی سوسائٹی ان مطالبات سے دست بردار ہو جائے یا عوام کو ان کا پابند نہ کر سکے تو اس کی ہستی فنا ہو جاتی ہے۔

اسلامی معاشرہ کے بھی کچھ اساسی تقاضے ہیں جن کا پورا کرنا اس کے ہر ماننے والے کے لیے ضروری ہے۔ قرآن مجید نے ان تقاضوں کو مختلف مقامات پر پیش کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (الممتحنہ ۱۲)

"اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے ارادہ سے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ زنا کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ جانتے بوجھتے کسی پر بہتان باندھیں گی اور نہ کسی بھلی بات میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت کر لیجئے اور اللہ سے ان کے گناہوں کی معافی کی دعا کیجئے بلاشبہ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

ان احکام کا رُخ عورتوں کی طرف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت مدینہ میں اسلامی سوسائٹی کی تعمیر جاری تھی، اسلامی ریاست نے بعض مصالح کے تحت اہل مکہ سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ قریش کے کسی فرزند کو ان کی مرضی کے خلاف پناہ نہیں دے گی۔ اس لیے وہ قانوناً صرف ان خواتین ہی کو امان دینے کی مجاز تھی جو اس کے زیر سایہ رہنا چاہتی ہوں۔ اس پس منظر میں قرآن مجید نے ان شرائط کی

توضیح کردی جن کی پابندی کا عہد کرنے کے بعد کوئی عورت مسلم سوسائٹی کا جز قرار پاتی ہے۔ اس مخصوص پس منظر سے قطع نظر یہ اسلامی معاشرہ کے ایسے حتمی تقاضے ہیں جن سے مرد بھی قطعاً مستثنیٰ نہیں ہیں۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

اخذ علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما اخذ علی النساء ان لا نشرک باللہ شیئا ولا نسرق ولا نزنی ولا نقتل اولادنا ولا یعضہ بعضنا بعضا۔[1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح عورتوں سے عہد لیا تھا اسی طرح ہم سے بھی عہد لیا کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، چوری نہ کریں، زنا نہ کریں، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں اور یہ کہ ہم ایک دوسرے پہ تہمت نہ تراشیں"

اس عہد نامہ کو دیکھ کر ہر شخص بتا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کسے کہتے ہیں! اس کا مقصد وجود کیا ہے؟ وہ انسانیت کے قافلہ کو کس راہ پر لے جانا چاہتا ہے! اور یہ کہ اس کی فضا میں کس قسم کے افراد پرورش پا سکتے ہیں! کیونکہ معاشرہ ہی فرد کی تگ و دو کے لیے میدان فراہم کرتا ہے اور فرد اپنی ساری جدوجہد کو اس کے کھینچے ہوئے دائرہ میں محصور رکھنے پر مجبور ہے۔ اگر وہ اس سے باہر قدم رکھنا چاہے تو معاشرہ کی قوتیں اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتی ہیں بلکہ مزاحم راہ اور بندش پا بن جاتی ہیں۔ لہذا معاشرہ جس قسم کے افکار و رجحانات کا حامل ہوگا اسی قسم کا کردار ابھر کر سامنے آئے گا۔ ایک پاکیزہ ماحول اپنے اندر گندے اطوار و عادات کو جگہ نہیں دے سکتا اور نہ کوئی معصیت پرست سوسائٹی کسی تو گرا اخلاق کو برداشت کر سکتی ہے۔

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُم

---

[1] مسلم، کتاب الحدود، باب الحدود کفارات لاهلها۔

بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝ (الاعراف ۸۰-۸۲)

"اے نبیؐ! تم لوطؑ کا واقعہ ان لوگوں کو سناؤ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم انتہائی بے حیائی کا کام کرتے ہو۔ تم سے پہلے اس گندے فعل کا ارتکاب کسی نے نہیں کیا تم تو اپنی شہوت رانی کے لیے عورتوں کے بجائے مردوں کے پاس جاتے ہو۔ بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) تم حد سے بڑھ جانے والی قوم ہو۔ اور (یہ سن کر) اس کی قوم کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ نکالو ان کو اپنی بستی سے، یہ تو بڑے ہی پاکباز لوگ ہیں۔"

لہٰذا اگر آپ عیاشی اور بدکاری کو اپنے اور انسانیت کے لیے تباہ کن سمجھتے ہیں تو آپ کو سب سے پہلے موجودہ جرائم پرور ماحول کو بدلنا ہوگا اور ایسی فضا تیار کرنی ہوگی جس میں عفت و پاک دامنی کی نشوونما ہو سکے۔

موجودہ معاشروں کی ناکامی کی اہم ترین وجہ یہی ہے کہ وہ افراد سے جن قوانین کا اتباع کرانا چاہتے ہیں خود ہی ان کی راہ کا سنگ گراں بن جاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے زیر بحث موضوع ہی کو لے لیجئے۔ آج بھی دنیا کی بیشتر سوسائیٹیوں میں زنا قانوناً ممنوع ہے لیکن ہر جگہ کے افکار و عقائد، تعلیم و تربیت، تہذیب و معاشرت غرض تمام اجتماعی قوتیں اس قانون کی بے حرمتی اور پامالی پر مجبور کرنے والی ہیں۔ اس وقت کے تمدن و تہذیب کا کوئی جزء ایسا نہیں ہے جس پر شہوانیت اور خواہش نفس کا تسلط نہ ہو گیا ہو۔ یہ فحش لٹریچر، ننگی تصاویر، عریاں لباس، عورت اور مرد کا آزادانہ اختلاط، رقص و سرود کی ہیجان انگیز محفلیں، کیا یہ سب کچھ آدمی کو باعفت زندگی گزارنے میں مدد دینے والے اسباب ہیں یا آلودۂ معصیت کرنے والے؟ ایسے گندے معاشرہ میں پاک دامنی کا مطالبہ خود ایک جرم ہے۔

جب سوسائٹی افراد پر کوئی فرض عائد کرتی ہے تو اس کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس فرض کی ادائیگی میں ہر طرح سے معاونت کرے۔ ورنہ قانون کی پابندی کے مطالبہ کا اسے کوئی حق نہیں پہنچتا۔

اسلام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قانون دینے سے پہلے ایسا ماحول تیار کرتا ہے جس میں اس کا نفاذ ہو سکے۔ اور جس پر عمل درآمد افراد کے لیے ممکن ہو، وہ زنا کو حرام قرار دیتا اور عفت کا مطالبہ کرتا ہے، تو سوسائٹی میں ایسی فضا بھی پیدا کرتا ہے جس میں معصیت کا درخت خزاں رسیدہ ہو کر رہ جائے، اور جہاں باعفت و پاک دامن رہنا آسان تر اور زنانی اور اوباش بن کر رہنا زیادہ دشوار ہو۔

کسی نظریہ کے نفاذ کے لیے معاشرہ کے پاس تین قوتیں ہوتی ہیں۔ افکار و نظریات کی قوت، اجتماعی احساس کی قوت اور قانون کی قوت۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ اسلام معاشرہ کو با اخلاق اور عفت شعار بنانے کے لیے اپنی ان توانائیوں کو کس طرح صرف کرتا ہے۔

نظریات کی قوت

کسی معاشرہ کی کامیابی ان نظریات میں مضمر ہوتی ہے جو اس کی قیادت کرتے ہیں۔ اگر نظریات کھوکھلے اور کمزور ہوں تو دنیا کی کوئی قوت اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ دنیا قوانین کے صدہا دفتر تیار کر چکی لیکن اس کے باوجود انسان کو بے راہ روی سے باز نہیں رکھ سکی۔ اس کے پاس وہ طاقت ہی نہیں جو آدمی کو ہر آن آئین کی زنجیر میں باندھے رکھے۔

اسلام ایسے نظریات عطا کرتا ہے جو انسان کے ارادہ و عمل پر شب و روز خفیہ اور علانیہ ہر حال میں یکساں حکمرانی کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی ایسا لمحہ نہیں ہے جس میں ان کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہو۔

وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ ○ (الانعام ۱۲۰)

"اور چھوڑ دو خفیہ اور علانیہ ہر قسم کے گناہ کو۔ بلاشبہ جو لوگ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں انہیں ان کی بدعملی کی سزا مل کر رہے گی"

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔

(الاعراف ۳۳)

"کہہ دو (اے نبی ﷺ!) کہ میرے رب نے تو کھلے اور چھپے تمام فحش کاموں کو حرام کیا ہے"

معصیت و فحاشی کا ظہور جس شکل اور جس رنگ میں بھی ہو اس کے جواز کی سند اسلام کی جانب سے نہیں مل سکتی کیونکہ وہ جس نقشہ پر فرد کی تربیت اور معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے اس میں گناہ کی کسی بھی صورت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے پیش نظر حیوانوں کا کوئی جنگل نہیں بسانا ہے جس میں آدمی ہر طرف چرتا چگتا اور شہوت رانی کرتا پھرے بلکہ وہ انسانوں کی ایسی بستی آباد کرنا چاہتا ہے جو انسانیت اور شرافت و اخلاق کا گہوارہ ہو جو صفاتِ حسنہ اور پاکیزہ کردار کو نشوونما دے سکے۔ وہ انسان کو انسانیت کے سانچے میں ڈھالتا ہے تاکہ اس کا ہر نقش پاکردار کی پاکیزگی اور حسنِ سیرت کا نشان بن جائے اور اس کے پاک انفاس سے روح کو بالیدگی اور احساسات کو جلا نصیب ہو، اور سوسائٹی اس اعلیٰ کردار کی بدولت پاسبانِ عصمت و ناموس بن جائے۔

عن سليمان بن بريدة عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم حرمة نساء المجاهدين على القاعدين كحرمة امهاتهم وما من رجل من القاعدين يخلف رجلاً من المجاهدين فى اهله فيخونه فيهم الا وقف له يوم القيامة فيأخذ من عمله ما شاء فما ظنكم له

لہ مسلم کتاب الامارۃ، باب حرمۃ نساء المجاہدین واثم خانہم۔ ابوداؤد کتاب الجہاد، باب فی حرمۃ نساء المجاہدین۔

سلیمان بن بریدہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو لوگ میدانِ جنگ میں نہ جائیں اور اپنے گھروں ہی میں رہ جائیں ان پر جانے والوں کی عورتیں ان کی ماؤں کی طرح محترم ہیں۔ جنگ سے پیچھے رہ جانے والوں میں سے جو شخص کسی مجاہد کے اہل و عیال میں اس کا جانشین ہو اور وہ ان میں خیانت کرے تو قیامت کے دن اس خائن کو مجاہد کے سامنے کھڑا کیا جائے گا، اور وہ اس کی نیکیوں سے جتنا چاہے گا لے لے گا۔ خیال کرو کہ اس وقت اس مجرم کا کیا حال ہوگا۔

عن زید بن خالدؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من جھز غازیا فی سبیل اللہ فقد غزا ومن خلف غازیا فی سبیل اللہ بخیر فقد غزا[1]

"زید بن خالدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اللہ کی راہ میں کسی جہاد کرنے والے کے لیے سامانِ جنگ فراہم کیا تو گویا اس نے بھی جہاد کیا اور جس شخص نے کسی اللہ کی راہ کے مجاہد کی اس کے اہل و عیال میں بہتر طریقے سے جانشینی کی تو اس نے بھی جہاد کیا۔"

اخلاق کی قدر و قیمت

ظاہر ہے جس سوسائٹی کی اساس اس قدر شائستہ خیالات اور پاکیزہ جذبات پر رکھی گئی ہو، اس میں اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت لازماً بڑھ جائے گی۔ عفت و عصمت، پاک دامنی و نیک سیرتی جیسی اعلیٰ صفات صرف واعظانہ مسکینی کی مظہر نہیں ہوں گی بلکہ ان میں قانون کی قوت اور سیاست کا زور پیدا ہو جائے گا، اور ہر فرد ان اخلاقی خوبیوں کو اپنی عزت و آبرو کا سرمایہ سمجھے گا، اور سوسائٹی میں باعزت و مفتخر

---

[1] بخاری، کتاب الجہاد، باب فضل من جہز غازیا او خلفہ بخیر۔ مسلم، کتاب الامارۃ باب فضل اعانۃ الغازی الخ۔

رہنے کے لیے جان و مال اور خاندان وقبیلہ کی طرح ان کی حفاظت کرے گا۔
اسلامی معاشرہ فرد کے جذبۂ عفت و پاکبازی کی انتہائی قدر کرتا ہے اور
اس کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :-

ومن طلب منہ الفجور کان علیہ ان یدافع الصائل علیہ فان تمدیدا فعہ الا بالقتل کان لہ ذلک باتفاق الفقہاء[1]

"اگر کسی شخص سے سختی کے ساتھ بدکاری کا مطالبہ کیا جائے تو اس پر ضروری ہے کہ حملہ آور کی مدافعت کرے، اگر وہ دفع ہو جائے تو ٹھیک ہے لیکن اگر سوائے قتل کے مدافعت کی اور کوئی صورت نہ ہو تو فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اسے قتل کا بھی حق حاصل ہے۔"

اسلام فرد کے اس پاکیزہ جذبہ کو اس کا فطری حق سمجھتا ہے جس کی توہین و تحقیر کسی طرح برداشت نہیں کی جا سکتی اور اس کو مجروح کرنے کی ہر کوشش اسلامی معاشرہ کی نگاہ میں قابلِ مواخذہ اور مستحقِ تعزیر ہے۔ اسی لیے اسلامی معاشرہ کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے کی عصمت دری کرے اور اس کی پاک دامنی پر بٹہ لگائے کیونکہ تہمت تراشنے والا متعلقہ فرد کی سیرت ہی پر حملہ نہیں کرتا بلکہ سوسائٹی میں اس کو جو باعزت مقام حاصل ہے اسے بھی وہ خطرہ میں ڈال رہا ہے۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (النور ۴)

"جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت باندھیں اور پھر چار گواہ پیش نہ کریں تو ان کو اسّی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی نہ قبول کرو کیونکہ

---

[1] مختارات علمیہ ص۱۳۷۔

ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔"

بدکاروں کی توہین

ایک طرف اسلامی معاشرہ کسی باعصمت انسان کے خلاف افتراپردازی کو قابل سزا جرم قرار دیتا ہے تاکہ وہ عزت و وقار کی زندگی بسر کرسکے، دوسری طرف وہ کسی عصمت فروش کو اپنے اندر وہ پوزیشن دینے کے لیے قطعاً آمادہ نہیں ہے جو ایک صالح سیرت انسان کو حاصل ہوتی ہے۔

مغربی تہذیب نے جن سوسائٹیوں کو جنم دیا ہے چونکہ ان کی نگاہ میں اخلاقی اقدار کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے اس لیے ان میں ایک شخص انتہائی عیاش اور غنڈہ صفت ہوتے ہوئے بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح سوسائٹی بالواسطہ افراد کی بدعملی کی ہمت افزائی کرتی رہتی ہے۔

لیکن اسلام ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں بدکار اپنا مقام کھو دے، اس کی قدر و قیمت گھٹ جائے۔ اس کی طرف بجائے عزت کی نگاہوں کے حقارت کی نظریں اٹھنے لگیں۔ وہ سوسائٹی کا انتہائی ناپاک اور گندہ عنصر قرار پائے جس سے شریف اور باعزت افراد کنارہ کشی اختیار کرلیں اور وہ اپنے ہی جیسے کم ظرف انسانوں سے تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہو جائے۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ○ (النور ۳)

"زانی نکاح نہیں کرتا مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ سے نکاح نہیں کرتا سوائے زانی یا مشرک کے۔ اور یہ مومنوں پر حرام کردیا گیا ہے۔"

عن ابی ھریرۃ و زید بن خالدؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن الامۃ اذا زنت ولم تحصن قال ان زنت فاجلدوھا ثم ان زنت فاجلدوھا ثم ان زنت فاجلدوھا

ثم بیعوھا ولو بضفیر لہ

"ابو ہریرہؓ اور زید بن خالد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لونڈی کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ اگر اس کی شادی نہ ہوئی ہو اور وہ زنا کرے تو کیا کیا جائے؟ آپ نے جواب دیا۔ اگر وہ زنا کرے تو اس کو کوڑے لگاؤ۔ دوبارہ زنا کرے تو پھر کوڑے لگاؤ۔ اور اگر اس کے بعد بھی زنا کرے تو کوڑے مارو اور پھر اسے بیچ دو خواہ ایک رسی کی قیمت ہی پر کیوں نہ ہو۔"

تعزیر کا خاتمہ

کیا مجرم کی توہین و تحقیر اور اس سے کنارہ کشی کے ساتھ معاشرہ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کا اصل فرض تو یہ ہے کہ بدچلن کو نیک راہ پر لے چلے۔ سرگشتہ معصیت کو عصمت کا شیدا کر دے تاکہ اس کا ہر فرد عفت و پاکبازی کا منادا اور شائستہ زندگی کا علم بردار بن جائے۔ اور ضعیف اخلاق کا طالب جنگل کا تنہا مسافر نہ ہو بلکہ کاروان صلاح و تقویٰ اس کا ہم سفر رہے۔ وہ گناہ سے دامن کش ہونا چاہے تو ہزار ہاتھ اسے بچانے والے ہوں۔ وہ معصیت کے خلاف صدا بلند کرے تو صد ہا زبانیں اس کی ہم آواز ہو جائیں۔ وہ فسق و بدکاری کے مقابلہ کے لیے اٹھے تو پوری سوسائٹی اس کے لیے ڈھال بن جائے۔

قدرتی طور پر یہ ذمہ داری ہر شخص کے متعلقین پر سب سے زیادہ عاید ہوتی ہے۔ ایک شخص جن لوگوں کو زندگی کے تمام معاملات میں قابل اعتماد سمجھتا ہے انہی کی طرف اپنی پریشانیوں میں رجوع کرتا ہے اور جن کو اپنی کمزوری و بے بسی کا سہارا تصور کرتا ہے وہی اس بات کے مستحق ہیں کہ آدمی انہیں طلب عفت و عصمت میں ہاتھ بٹانے والا، نیکی کی راہ کا ساتھی اور بھلائی کے کاموں کا معاون خیال کرے۔

لہ بخاری، کتاب المحاربین۔ اذا زنت الامۃ۔

آپ کسی خاندان کے فرد ہوں تو آپ کا صرف یہی فرض نہیں ہے کہ وہ بھوکے ہوں تو ان کو کھانا دیں۔ ننگے ہوں تو پوشاک فراہم کریں۔ بے گھر ہوں تو مکان کا انتظام کریں بلکہ یہ بھی آپ کی ذمہ داری ہے کہ ان کو اخلاقی گراوٹ سے بچائیں ان کے نفسیاتی امراض کا علاج کریں۔ اور ان کے روحانی تقاضوں کی تکمیل کا سامان فرمائیں۔ جس بچہ کے بدن پر ایک ادنیٰ چوٹ دیکھنا پسند نہیں کرتے، کیا اس کا سفلی رذیلہ میں گرفتار ہو جانا آپ کو گوارا ہے؟

قرآن مجید نے اس فطری حق کو حسب ذیل الفاظ میں یاد دلایا ہے:۔

وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ۔ (النور)

"تم میں سے جو بے شادی شدہ ہوں ان کا نکاح کر دو اور اپنے صالح غلاموں اور لونڈیوں کا بھی۔"

اس حکم کو فقہی زبان میں جس اصطلاح سے بھی تعبیر کیا جائے اور اس کے مخاطب خواہ اولیاء سرپرست ہوں یا حکومت و ریاست اس آیت کا واضح مطالبہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں کوئی شخص تجرد کی زندگی گزارنے نہ پائے تاکہ اسے اپنے نفس کی تشنگی کو ختم کرنے کے لیے ناجائز صورتیں نہ تلاش کرنی پڑیں۔

اس آیت میں مسلم معاشرہ کے مرد اور عورت، لونڈی اور غلام سب ہی اصناف شامل ہیں۔ اور دور اول کی اسلامی سوسائٹی ان تمام طبقات کے صنفی مطالبات کی تکمیل کا انتظام کرتی تھی۔

مشہور تابعی احنف کہتے ہیں کہ تین معاملات ایسے ہیں جن میں کسی قسم کی تاخیر نہیں کی جا سکتی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ کون سے معاملات ہیں تو جواب دیا! عمل صالح کی انجام دہی، میت کو سپرد خاک کرنا اور کسی ناکتخدا کے لیے مناسب بر مل جانے پر اس کی شادی کر دینا۔

فرماتے تھے میرے گھر کے کسی کونے میں اژدہے کا پایا جانا مجھے زیادہ پسندیدہ

ہے اس بات سے کہ کسی بے شوہر عورت کے لیے اس کے ہم مرتبہ مرد کی جانب سے پیغام آئے اور میں اسے رد کر دوں[1]

شداد بن اوسؓ اپنے اعزہ سے فرماتے ہیں۔ میری شادی کا انتظام کرو۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کی ہے کہ میں بے شادی شدہ رہ کر خدا سے ملاقات نہ کروں[2]

مجاہدؒ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباسؓ اپنے غلاموں کو شادی کی پیشکش کرتے تھے اور فرماتے تم میں سے جو شادی کرنا چاہے میں اس کی شادی کرانے کے لیے تیار ہوں۔ (یاد رکھو) تجرد کی زندگی بسر کرنے میں زنا میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے، اور زنا کی خباثت کا یہ حال ہے کہ زانی زنا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی گردن سے ایمان کا قلادہ نکال دیتا ہے، اگر وہ چاہے تو دوبارہ یہ قلادہ پہنا دے اور نہ چاہے تو نہ پہنائے"[3]

امام نخعیؒ کہتے ہیں "سلف اپنے غلاموں کو نکاح پر مجبور کرتے تھے (اگر وہ نکاح کے لیے آمادہ نہ ہوتے) ان کو مکانات میں بند کر دیتے تھے (تاکہ معاشرہ کے بگاڑ کا سبب نہ بنیں)۔

اسلامی معاشرہ میں یہ صرف افراد ہی کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ ریاست کے فرائض میں بھی شامل ہے کہ وہ متعففانہ زندگی گزارنے میں مدد دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

السلطان ولی من لا ولی لہ[5]

---

[1] البیان والتبیین، جلد ۲ صفحہ ۱۰۲

[2] احکام القرآن جصاص، جلد ۳ صفحہ ۲۵۲

[3] المحلی لابن حزم، جلد ۱ صفحہ ۱۲۱

[4] تفسیر قرطبی، جلد ۱۲ صفحہ ۲۴۲

[5] ترمذی، ابوداؤد، ابواب النکاح۔

"جس (عورت) کا کوئی سرپرست نہ ہو حاکم وقت اس کا سرپرست ہے"۔

آپ نے حضرت علی رضؓ کو تین باتیں یاد رکھنے کا حکم دیا۔ نماز اپنے وقت پر ادا کرو۔ کسی کا انتقال ہو تو اس کے کفن و دفن میں تاخیر نہ کرو۔ کسی بے شادی شدہ کو مناسب شریک حیات مل جائے تو شادی میں جلدی کرو۔ [1]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ گورنر کوفہ زید بن عبدالرحمٰن کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"تم نے لکھا ہے کہ فوج کو تنخواہ دینے کے بعد بھی تمہارے پاس مال بچا ہوا ہے۔ پس اس مال کے ذریعہ ان میں سے جو شخص حقیقی ضروریات کے تحت مقروض ہو گیا ہو اس کا قرض ادا کرو، اور جو لوگ ادائیگی مہر سے قاصر ہوں ان کو مہر دو۔" [2]

چار بیویاں رکھنے کی اجازت

عمر کی ایک خاص حد تک مرد کے اندر جنسی جذبات پوری شدت کے ساتھ موجود رہتے ہیں لیکن عورت بار بار ایسے حالات سے گزرتی رہتی ہے جن میں اکثر وہ نا شکر و زہ پڑ جاتے ہیں اور بعض اوقات تو یہ حالات لمبے عرصے تک اس پر طاری رہتے ہیں اس لیے وہ ہر وقت مرد کی جنسی خواہش پوری نہیں کر سکتی۔ اس وجہ سے اسلامی معاشرہ مرد کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ چار تک بیویاں رکھے۔ یہ حق عیاشی کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ مرد اپنی جنسی خواہش کی تسکین کے لیے بعض اوقات ایک سے زائد جائز ذرائع کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن شریعت کے اس حق سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ مرد بیویوں

---

[1] ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی الوقت الاول من فضل۔

[2] سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ تالیف عبداللہ بن عبدالحکم المتوفی ۲۱۴ھ

درمیان ان تمام معاملات میں عدل و مساوات کا پابند ہے جو اس کے بس میں ہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء ۳)

"پس جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو اور تین تین اور چار چار سے نکاح کرو، اور اگر تم کو اس کا خوف ہو کہ تم ان کے ساتھ عدل نہیں کر سکو گے تو صرف ایک پر اکتفا کرو یا لونڈیوں پر"

علامہ ابن الہمام حنفی نے اس آیت کے قانونی پہلو پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:۔

فاستفدنا ان حل الاربع مقید بعدم خوف عدم العدل وثبوت المنع عن اکثر من واحد عند خوفه فعلم ایجابه عند تعددهن[1]

"اس سے معلوم یہ ہوا کہ چار عورتیں اس شرط کے ساتھ حلال ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی کا خوف نہ ہو لیکن اگر اس کا خوف ہو تو ایک سے زائد شادی کرنا ممنوع ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ متعدد بیویاں ہوں تو ان کے ساتھ انصاف ضروری ہے"

علامہ بدرالدین کاشانی فرماتے ہیں:۔

لو کانت تحته امرأتان حرتان او امتان یجب علیه ان یعدل بینهما فی الماکول والمشروب والملبوس والسکنی والبیوتة[2]

"اگر شاوند دو آزاد عورتیں یا دو لونڈیاں رکھتا ہو تو اس کے لیے واجب ہے کہ ان دونوں کے درمیان غذا، لباس، مکان اور شب باشی

---

[1] فتح القدیر، جلد ۲ صفحہ ۲۱۶۔

[2] بدائع الصنائع، جلد ۲ صفحہ ۳۳۲۔

میں عدل اور برابری کا سلوک کرے۔"

عورت کے لیے عقد ثانی کا حق

عورت کے طبعی حالات مرد کے طبعی حالات سے مختلف ہیں۔ اس لیے اسلام یہ توصیح نہیں سمجھتا کہ ایک عورت کے بہت سے شوہر ہوں۔ البتہ یہ ضروری سمجھتا ہے کہ وہ تسکین نفس کے جائز ذریعہ سے کبھی محروم نہ رہے۔ چنانچہ وہ اس کے نکاح کی اتنی ہی شدت سے تاکید کرتا ہے جتنی شدت سے کہ مرد کے نکاح پر زور دیتا ہے۔ اور اگر بیوگی یا طلاق اور خلع نے اس کو شوہر سے الگ کر دیا ہے تو معاشرہ کو ترغیب دیتا ہے کہ فوراً اس کا دوسرا نکاح کر دے۔

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کے دور میں بڑی آسانی سے عورتوں کا عقد ثانی ہو جاتا تھا۔

عاتکہ بنت زید کی شادی حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبداللہؓ سے ہوئی۔ بعض اسباب کی بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدیں۔ عبداللہ نے اپنے والد کے مشورہ پر بیوی کو طلاق دے تو دی، لیکن ان کو اپنے اس اقدام کا سخت افسوس تھا۔ کیونکہ وہ عاتکہ کو بہت چاہتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہ کا رجحان دیکھا تو دوبارہ نکاح کی اجازت دے دی اور عبداللہؓ نے اس پر عمل کیا۔ لیکن طائف کی جنگ میں ان کی شہادت پیش آئی۔ اس کے بعد بعض روایات کے مطابق زید بن خطاب نے عاتکہ سے نکاح کر لیا۔ جب وہ یمامہ میں شہید ہو گئے تو حضرت عمرؓ، اور حضرت عمرؓ کے بعد حضرت زبیرؓ سے ان کی شادی ہوئی۔ حضرت زبیرؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ نے ان کو پیغام بھیجا لیکن خود ہی انہوں نے انکار کر دیا۔

سہیلہ بنت سہیل کا نکاح یکے بعد دیگرے چار اصحاب حضرت حذیفہؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، عبداللہ بن الاسود اور شماخ بن سعید سے ہوا۔

اسی طرح عبداللہ بن ابی کی لڑکی جمیلہ کا عقد حضرت حنظلہؓ سے ہوا۔ وہ احد میں شہید ہو گئے تو ثابتؓ بن قیس نے ان سے شادی کی۔ ثابتؓ کے بعد مالک بن دخشم نے، اور آخر میں حبیب بن لیاف کے عقد میں وہ آئیں۔

اسماء بنت عمیس کی پہلی شادی حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفرؓ سے ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اور حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت علیؓ نے ان سے نکاح کیا۔

حضرت علیؓ کی صاحبزادی ام کلثوم حضرت عمرؓ سے بیاہی گئیں، حضرت عمرؓ شہید ہو گئے تو عون بن جعفرؓ سے ان کا نکاح ہوا۔ عون کی وفات کے بعد ان کے بھائی عبداللہ نے ان سے نکاح کر لیا[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے دور میں عورت کے لیے نکاح ثانی کے معیوب یا ناپسندیدہ ہونے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا جیسا کہ ہندو مذہب یا بعض دوسرے مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ اس لیے خواتین کے ایک سے زائد نکاح بکثرت ہوتے ہیں۔ ہم نے کسی خاص چھان بین اور تلاش کے بغیر چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کی ہیں۔ ورنہ اس طرح کے واقعات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہاں ان کی تفصیل بھی دشوار ہے۔

فسخ نکاح کا اختیار

اسلام کے نزدیک نکاح کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ انسان کو عفت کی زندگی گزارنے میں مدد ملے۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ میاں بیوی میں سے ہر ایک اس قابل ہو کہ دوسرے کا جنسی مطالبہ پورا کر سکے۔ اس لیے اسلام زوجین کو یہ حق دیتا ہے کہ فریق ثانی میں اس کی صلاحیت نہ ہو تو ازدواجی بندھن

---

[1] ان مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو ابن سعد کی طبقات، اور ابن عبدالبر کی الاستیعاب فی اسماء الاصحاب میں متعلقہ صحابیات کا تذکرہ۔

سے کٹ جائے۔

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور بعض دیگر صحابہ و تابعین کی رائے میں جنسی نقص ہی نہیں بلکہ برص، جذام، اندھاپن اور جنون بھی ایسے عیوب ہیں جن کی بنا پر زوجین کو ایک دوسرے سے جدا ہونے کا اختیار ہے۔[1]

امام ابن قیمؒ نے ان عیوب پر دوسرے عیوب کو بھی قیاس کیا ہے فرماتے ہیں:-

اما الاقتصار علی عیبین او ستة او سبعة او ثمانية دون ما هو اولیٰ منها او مساویها فلا وجه له ...... و القياس ان كل عيب ينفر الزوج الاخر منه ولا يحصل به مقصود النكاح من الرحمة والمودة يوجب الخيار[2]

”دو یا چھ یا سات یا آٹھ عیبوں پر اقتصار کرنا اور ان سے بڑے بڑے یا ان کے برابر کے عیوب کو شمار نہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا........ قیاس یہ کہتا ہے کہ ہر اس عیب پر علیحدگی کا اختیار ملنا چاہیے جو میاں بیوی میں سے ایک کو دوسرے سے متنفر کرے اور جس کی وجہ سے باہمی رحمت و مودت ختم ہو جائے جو نکاح کا مقصود ہے۔“

جائز رشتوں کا احترام

ایک طرف اسلام ان رشتوں کو توڑنے اور ختم کرنے کی آزادی دیتا ہے جن سے

---

[1] السنن الکبریٰ بیہقی، جلد ۷، صفحہ ۲۱۵، ۲۱۴۔ حنفیہ کے نزدیک خاوند کو اگر جذام یا برص کی قسم کا کوئی عیب ہو تو بیوی کو فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق نہیں ہے البتہ اگر خاوند مقطوع الذکر ہو یا خصی ہو تو اس کو تفریق کے مطالبہ کا حق ہے تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد ۴، صفحہ ۱۸۰ تا ۱۸۹۔

[2] زاد المعاد، جلد ۴، صفحہ ۳۳۔

عفت کی زندگی گزارنے میں مدد نہ ملے۔ دوسری طرف وہ ایسے رشتوں کو مستحکم کرنے اور حتی الوسع ان سے چمٹے رہنے کی تعلیم دیتا ہے جو طلب عفت میں معاون ہوں۔ کیونکہ جب تک یہ رشتے مضبوط نہ ہوں اور ان کی عظمت اور احترام دلوں میں بیٹھ نہ جائے اس وقت تک وہ ذہنیت نہیں مٹ سکتی جو آدمی کو ہر وقت ایک نئے دلبر کی تلاش میں سرگرداں رکھتی ہے۔ آج جو لوگ بدکار و بدچلن ہیں ایسا نہیں ہے کہ وہ جنسی آسودگی کے لیے جائز ذرائع نہ رکھتے ہوں۔ لیکن وہ ان کو ایسے ذرائع سمجھتے ہیں جو جذبات کی آگ بجھانے کے لیے ہر وقت ان کے قبضہ میں ہیں، وہ اس تصور ہی سے نا آشنا ہیں کہ ان مخصوص طریقوں کے علاوہ کسی اور طریقہ سے نفسانی خواہشات کی تسکین صحیح نہیں سمجھتے بیوی یا محبوبہ کہ ان کی جنسی محبت کا مرکز آج ایک ہے تو کل دوسرا ہو سکتا ہے۔ اس سے چھوٹتے وقت کسی لمبے غور و فکر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ کوئی شخص جتنا پس و پیش کرتا ہے اتنا غور و فکر بھی وہ اپنے رفیق حیات کو جدا کرتے ہوئے ضروری نہیں سمجھتے۔

اسلام اس ذہنیت کا دشمن ہے وہ سختی کے ساتھ اسے بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک نکاح ایک قابل احترام عہد و پیمان ہے وہ اس لیے نہیں باندھا جاتا ہے کہ آدمی جب تک چاہے حظ نفس اٹھاتا رہے اور جب چاہے توڑ پھینکے۔ اگر نکاح اتنا ہی بے وقعت تعلق ہے تو اس میں اور کھلی کھلی حرام کاری میں کیا فرق ہے؟ ایک شخص جو ہر روز نئے نکاح اور نئے تعلق کی ضرورت محسوس کرتا ہو آخر اس میں اور اس شخص میں کیا وجہ امتیاز ہے جو اپنی جنسی بھوک کو ختم کرنے کے لیے کسی بیسوا کے کوٹھے کی طرف رجوع کرتا ہے؟

اس ناپاک جذبہ کے خلاف اسلام کی تعلیمات بہت ہی سخت ہیں۔ ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المنتزعات والمختلعات هن المنافقات [1]

---

[1] نسائی، کتاب الطلاق، باب ما جاء فی الخلع۔

"جو عورتیں بلا وجہ اپنے شوہروں سے طلاق و خلع کا مطالبہ کرتی ہیں، وہ منافق ہیں"

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:۔

ایما امرأۃ سألت زوجھا طلاقا من غیر بأس فحرام علیھا رائحۃ الجنۃ[1]

"جو عورت بلا کسی حقیقی وجہ کے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنت کی خوشبو تک حرام ہے"

ایک تیسری حدیث ہے:۔

ان اعظم الذنوب عند اللہ رجل تزوج امرأۃ فلما قضی حاجتہ طلقھا وذھب بمھرھا[2]

"اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ ایک شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور جب اپنی خواہش پوری کرلے تو اسے طلاق دیدے اور ساتھ ہی اس کا مہر بھی کھا جائے"

جائز حدود میں قائم ہونے والے تعلقات کا احترام صرف فرد ہی کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ معاشرہ بھی اس کا پابند ہے، اسلام کہتا ہے کہ جب سوسائٹی ناپسندیدہ تعلقات کی مذمت کرتی ہے تو جائز رشتوں کی توقیر و عزت بھی اس کا فرض ہے۔ چنانچہ وہ ایک شرعی رشتہ کو پوری سوسائٹی کے لیے ماں کی طرح محترم قرار دیتا ہے جب تک قانون کی قینچی اس رشتہ کو کاٹ نہ دے کسی کو اس حرمت کے توڑنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔ "شادی شدہ

---

[1] ترمذی، ابواب الطلاق واللعان، باب ما جاء فی المختلعات، ابن ماجہ، ابواب الطلاق باب کراہیۃ الخلع للمرأۃ۔

[2] مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۱۸۲۔

عورتیں تم پر حرام ہیں" اس حرمت کو ختم کرنے والی ہر کوشش اسلام کی نگاہ میں انتہائی مبغوض اور سخت ناپسندیدہ ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لیس منا من خبب امرأۃ علی زوجھا او عبدًا علی سیدہٖ[1]

"وہ شخص ہم میں سے نہیں جو کسی عورت کو اس خاوند سے برگشتہ کر دے یا کسی غلام کو اس کے آقا سے"

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں "اگر کوئی شخص کسی کی بیوی سے خود نکاح کرنے یا کسی دوسرے سے نکاح کرانے کے لیے اس کے شوہر کو قتل کر دیتا ہے تو خواہ عورت اس سازش میں شریک ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں اصولِ دین اور اس کی روح کا تقاضا یہ ہے کہ متعلقہ شخص کو حقِ نکاح سے محروم کر دیا جائے[2]

اجتماعی احساس

انسان اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر اس کی زندگی میں کردار کا نور ہے تو اس سے بہت سی زندگیاں تب و تاب حاصل کرتی ہیں اور اگر وہ برا ہے تو اس کی برائی بھی اس کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کے ماحول میں پھیلتی ہے۔ اس طرح انسان اپنی سیرت و کردار سے دوسروں کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے۔ اس لیے جب تک ہر شخص یہ نہ محسوس کرے کہ وہ سوسائٹی کی سیرت و کردار کا محافظ اور نگران ہے اس وقت تک اخلاق کی دنیا آباد نہیں ہو سکتی۔

اسلام فرد کے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ تم سوسائٹی کے معمار ہو۔ تمہارا کام صرف اپنی سیرت کی تعمیر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی اصلاح بھی ہے۔ تمہیں اپنے

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب من خبب امرأۃ علی زوجہا۔

[2] اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل المطبوع مع الفتاویٰ ص ۱۴۷، ۱۴۸۔

ماحول میں با اخلاق ہی نہیں بلکہ معلم اخلاق بن کر رہنا ہے۔ تمہارا فرض صرف اپنے کردار ہی کو بلند کرنا نہیں ہے بلکہ دوسروں کو پستی کردار سے بچانا بھی ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے:۔

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ فالامام الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیتہ والرجل راع علی اھل بیتہ وھو مسئول عن رعیتہ والمرأۃ راعیۃ علی اھل بیت زوجھا وولدہ وھی مسئولۃ عنھم وعبد الرجل راع علی مال سیدہ وھو مسئول عنہ الا فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ[1]

"سن لو تم میں کا ہر شخص نگراں ہے، اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ امام جو لوگوں کا حاکم ہوتا ہے وہ نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کے بچوں کی نگراں ہے اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ غلام اپنے آقا کے مال کا نگراں ہے اور اس مال کے بارے اس سے پوچھا جائیگا (دوبارہ) سن لو، تم میں سے ہر ایک شخص نگراں ہے۔ اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔"

سوسائٹی کا دباؤ بہت سخت ہے۔ اگر وہ اخلاق کی تخریب کی اجازت نہ دے تو کوئی شخص اس کی ہمت نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر سوسائٹی کی مجموعی فضا خراب ہو تو ہر طرف سے فسق و فجور کا سیلاب امنڈ پڑتا ہے اور اخلاق و سیرت کے

---

[1] بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ اطیعوا اللہ الخ

چشمے خشک ہونے لگتے ہیں۔

اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کی اخلاقی حس کو اس قدر بیدار کرتا ہے کہ وہ کسی معمولی سی بداخلاقی کو بھی برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتی۔

ایک عورت خوب عطر اور خوشبو لگائے راستہ سے گزر رہی تھی کہ حضرت ابوہریرہؓ نے اسے دیکھ لیا۔ پوچھا کیا مسجد سے آ رہی ہو؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے دوبارہ سوال کیا۔ کیا مسجد جانے ہی کے لیے تم نے یہ خوشبو استعمال کی تھی؟ عورت نے اثبات میں جواب دیا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو عورت خوشبو لگا کر مسجد کو جائے اللہ تعالیٰ اس کی نماز نہیں قبول کرتا جب تک کہ وہ پورے اہتمام سے اس طرح غسل نہ کرے جیسے جنابت سے غسل کیا جاتا ہے[1]

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ام درداءؓ کو حمام سے آتے دیکھا تو ان کو حمام جانے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ جو عورت اپنے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ کپڑے اتارتی ہے وہ اس پردے کو چاک کرتی ہے جو اس کے اور اللہ کے درمیان ہے[2]

اسلام انسان کی یہ ذمہ داری سمجھتا ہے کہ جن لوگوں سے اس کے سماجی و ذہنی اور معاشرتی تعلقات ہوں وہ ان کی اخلاقی نگرانی بھی کرے۔ یہ تعلقات جتنے گہرے اور مضبوط ہوں انسان کی ذمہ داری بھی اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نزدیک اپنے کسی عزیز کی عصمت دری انسان کی سیاہ کاریوں کی بدترین مثال ہے۔ بعض فقہاء ایسے شخص کی سزا قتل سے کم نہیں سمجھتے[3]

---

[1] ابوداؤد، کتاب الترجل، باب فی طیب المرأۃ للخروج۔

[2] مسند احمد، جلد ۶ صفحہ ۳۶۲۔

[3] زاد المعاد، جلد ۳ صفحہ ۲۷۲۔

یہی حال پڑوسی کی عورت کی عصمت پر دست درازی کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ فرماتے ہیں:-

قال رجل یا رسول اللہ ای الذنب اکبر عند اللہ قال ان تدعو للہ ندا وھو خلقک قال ثم ای قال ان تقتل ولدک خشیۃ ان یطعم معک قال ثم ای قال ان تزانی حلیلۃ جارک ؎

"ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ نے جواب دیا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرے حالانکہ تنہا اس نے تجھ کو پیدا کیا ہے، اس نے پوچھا، اس کے بعد کون سا گناہ؟ آپ نے فرمایا اس کے بعد سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تو اپنے بچہ کو اس خوف سے قتل کر دے کہ وہ تیری روزی میں شریک ہو جائے گا (اور تجھ کو کھلانا پڑے گا) اس نے پھر سوال کیا کہ ان دونوں گناہوں کے بعد کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے۔"

زنا ہر حال میں ایک جرم ہے اور انتہائی گھناؤنا جرم ہے۔ لیکن جب اس کا ارتکاب ایسا کوئی شخص کرے جسے سب سے زیادہ عفت پناہ ہونا چاہیئے تو اس جرم کی شناعت بھی دس گنا بڑھ جاتی ہے۔

ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا۔ زنا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ صحابہ نے جواب دیا کہ خدا اور اس کے رسول نے اس کو حرام کیا اور وہ قیامت تک حرام ہی رہے گا۔ آپ نے فرمایا۔ دس عورتوں کے ساتھ زنا کرنا نسبتاً ہلکا جرم ہے اس سے کہ انسان اپنے پڑوسی کی بیوی کا دامن عفت

؎ مشکوٰۃ کتاب الایمان بحوالہ بخاری ومسلم۔

چاک کرے [1]

اسلامی قانون

آئیے اب اسلامی قانون کا جائزہ لیں کہ وہ سوسائٹی کو کس طرح جنسی بے راہ روی سے بچاتا ہے۔

(۱) محارم ابدیہ

انسان پیدا ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے ماں باپ بھائی بہن اور دوسرے قریبی عزیزوں سے آشنا ہوتا ہے۔ یہ انسان کا قریب ترین ماحول ہے جس میں وہ بڑھتا اور نشوونما پاتا ہے۔ اس ماحول کو وہ اپنی جدوجہد سے نہیں پیدا کرتا بلکہ یہ فطری طور پر اس کو ملتا ہے۔ اگر اس ماحول کو اس سے چھین لیا جائے تو وہ کوئی ایسا ماحول نہیں پیدا کر سکتا جو اس کا بے لوث خادم ہو، جو اس کے رنج و راحت اور خوشی اور غم کو اپنا رنج و راحت اور خوشی غم سمجھے، جو زندگی کے تمام مراحل میں اس کا حقیقی معاون اور مددگار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انسان غیر شعوری طور پر اپنے اس قریبی ماحول کو ایسی مدد سمجھتا رہا ہے جو اس کی ساخت و پرداخت اور پرورش کے لیے غیب سے فراہم کی جاتی ہے۔ اس احساس نے اس ماحول کو ایک مقدس حرم کی حیثیت دے دی اور اس کے ساتھ انتہائی عقیدت اور محبت کے جذبات وابستہ ہو گئے۔

اس کا ایک بڑا فائدہ یہ نکلا کہ انسان جس دائرہ میں شب و روز رہتا اور زندگی گزارتا ہے وہ اخلاقی خرابیوں سے بڑی حد تک محفوظ ہو گیا ورنہ اس دائرہ میں میل جول اور اختلاط کی کثرت کی وجہ سے ہر طرح کی بے راہ روی کے امکانات پائے جاتے ہیں۔

---

[1] مسند احمد، جلد ۴ صفحہ ۸۔

اسلام نے ان امکانات کو اور بھی گھٹا دیا ہے۔ اس نے قانون کے ذریعہ ان افراد کے درمیان جنسی تعلق کو ممنوع قرار دیا جو فطری طور پر ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس نے ان افراد کا تعین بھی کر دیا جن سے جنسی تعلق جائز نہیں ہے تاکہ نہ تو کوئی تقشف پسند ایسے افراد کو ان میں شامل کر دے جن سے جنسی تعلق رکھنے میں کوئی معقول رکاوٹ نہیں ہے اور نہ کسی اباحت پسند کو یہ موقع ملے کہ وہ اس دائرہ کو بھی اپنی اس ہوس رانی کا نشانہ بنا لے جسے جنسی آوارگیوں سے پاک ہونا چاہیئے۔

(۲) خفیہ تعلقات کی ممانعت

اس مخصوص دائرہ سے باہر وہ صنفی روابط قائم کرنے کی اجازت دیتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آدمی ان تمام ذمہ داریوں کے اٹھانے کا عہد کرے جو ان تعلقات سے لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ یہ تعلقات برملا اور معاشرہ کی آنکھوں کے سامنے وجود میں آئیں تاکہ معاشرہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں فرد کی دستگیری کرے اور اگر فرد ان کی انجام دہی سے گریز کرے یا تساہل برتے تو اس سے مواخذہ کر سکے۔

قرآن مجید نے جہاں جنسی تعلقات سے بحث کی ہے، وہاں اس بات کی صاف تصریح کر دی ہے:۔

وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ (النساء-۲۵) اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں۔

وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ (المائدۃ-۵) اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والے۔

آدمی ان تعلقات کو پوشیدہ اسی لیے رکھنا چاہتا ہے، تاکہ سوسائٹی کا کوئی دباؤ اس پر نہ پڑے اور وہ ماحول کی عائد کردہ بندشوں سے بالکل آزاد رہے۔ کیونکہ یہ بندشیں اس کی بے راہ روی میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ان کے ٹوٹ جانے کے بعد وہ بے راہ روی میں بھٹک سکتا ہے، اور ان تعلقات اور ان کے نتائج کو جس رنگ میں چاہے بدل سکتا ہے۔ اسلام انسان کو اسی آوارگی سے بچانے

کے لیے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے اس تعلق کو خفیہ نہ رکھے بلکہ اس کا اعلان کرے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک ایسا نکاح زیر بحث آیا جس کی گواہی دینے والے صرف ایک مرد اور ایک عورت تھے، تو آپ نے فرمایا یہ خفیہ نکاح ہے اسے میں جائز نہیں کر سکتا۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت ابو بکرؓ کا کوئی اسوہ میرے سامنے ہوتا تو میں (اس تعلق کو زنا کے حکم میں شامل کر کے) رجم کرتا۔[1]

(۳) بیسوائی کے پیشہ پر قدغن

جنسی تعلقات کے سلسلہ میں جائز حدود پر اصرار کرنے کے لیے لازمی ہے کہ بدکاری پر آمادہ کرنے والے محرکات کو معاشرہ سے ختم کیا جائے اور ایسی تمام راہیں بند کر دی جائیں جو فکر و عمل کی آوارگی کا سبب بنتی ہیں، اس کے بغیر انسان کا صحیح راہ پر قائم رہنا دشوار ہے۔ کبھی نہ کبھی ناپاک طریقوں پر اس کے قدم پڑ ہی جائیں گے۔

اس مقصد کے لیے اسلام، معاشرہ کو بیسوائی کی گندگی سے پاک کرتا ہے، وہ اس شاخ ہی کو کاٹ پھینکتا ہے جس پر منحوس پرندے اپنے آشیانے تعمیر کرتے ہیں۔

عرب جاہلیت کی تہذیب نے باقاعدہ زنا کے اڈے قائم کر رکھے تھے جہاں شہوت رانی کی تمام سہولتیں مہیا تھیں۔ سرمایہ دار اپنی لونڈیوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ اپنی عصمت کی قیمت سے ان کے حرص و آز کی بھوک مٹائیں۔

قرآن مجید نے اس ذلت آمیز کاروبار کو یک قلم ممنوع قرار دے دیا۔

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ (النور: ۳۳)

---

[1] موطا امام مالک، کتاب النکاح، باب جامع ما لا یجوز۔

"دنیوی زندگی کے (حقیر) سازو سامان کے حاصل کرنے کے لیے
اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو، اگر وہ عفت کی زندگی گزارنا چاہیں"

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ گو مالک صراحتاً لونڈی کو عصمت فروشی کا حکم نہیں دیتا لیکن اس پر اتنی بھاری رقم کی ادائیگی لازم کر دیتا کہ بیچاری کسی جائز طریقہ سے اس کو ادا نہیں کر پاتی، اس لیے اپنا جسم فروخت کرنے پر مجبور ہوتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک کے اس ظالمانہ حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بتایا کہ وہ لونڈی کو حدود عفت میں رکھتے ہوئے ہی کوئی بھی کام کرانے اور اس کی اجرت کھانے کا مجاز ہے۔

رافع بن رفاعہؓ کہتے ہیں:۔

نہانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کسب الامۃ
الا ما عملت بیدھا وقال ھکذا باصابعہ نحو الخبز
والغزل والنفش [1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈی کی "کمائی" کھانے سے
منع کیا الا یہ کہ وہ اپنے ہاتھ سے کوئی خدمت کر کے کمائے اور آپ نے اپنی
انگلیوں سے اشارہ کر کے فرمایا، مثلاً روٹی پکانا، کاتنا اور روئی دھنکنا"

رافع بن خدیج رضؓ کی روایت ہے:۔

نہی رسول اللہ عن کسب الامۃ حتی یعلم من این ھو [1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈی کی کمائی کھانے سے منع فرمایا
جب تک کہ قطعی طور پر یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اس نے کس طریقہ سے کمایا"

دور جاہلیت میں حرامکاری کے پیشہ کے لیے لونڈیاں مخصوص تھیں اس لیے مذکورہ بالا آیت وحدیث میں ان کو اس پیشہ سے باز رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن اگر

---

[1] ابوداؤد، کتاب البیوع، باب فی کسب الاماء۔

نئی تہذیب کی روشنی "شریف و مہذب" بیٹیوں سے یہ تجارت کراتی ہے تو اسلام کی تعلیمات اس کے بھی ناپاک و حرام ہونے کا اعلان کرتی ہیں۔ اسلام کسی کام کے کرنے والے کی شکل و صورت، حیثیت و مرتبہ اور خاندان و قبیلے سے نہیں بلکہ کام کی نوعیت سے بحث کرتا ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دوسرے مواقع پر عام الفاظ میں بیسوائی کی آمدنی کو ناجائز قرار دیا ہے۔

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہٰی عن ثمن الکلب ومھر البغی۔[1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت اور بیسوائی کی آمدنی سے فائدہ اٹھانے سے منع فرمایا۔"

ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں :۔

مھر البغی خبیث۔[2]

"زانیہ کی آمدنی گندی اور ناپاک ہے۔"

اس "کاروبار" کے خلاف اسلامی علوم کے محققین کی رائے کتنی سخت ہے اس کا اندازہ آپ امام ابن تیمیہؒ کی حسب ذیل تصریح سے کر سکتے ہیں :۔

فاما اذا کان ھو یرسلھا لتبغی وتنفق علی نفسھا من مھر البغاء او یاخذ ھو شیئاً من ذالک فھذا ممن لعنہ اللہ ورسولہ وھو فاسق خبیث آخذ فی الکبیرۃ ذآخذ مھر البغی ولمینھا عن الفاحشۃ ومثل ھذا لایجوز ان یکون معہ لاأبل لایجوز اقرارہ بین المسلمین بل یتحق

---

[1] بخاری، کتاب الاجارۃ، باب کسب البغی وغیرہ۔ مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ۔

[2] ابوداؤد، باب فی کسب الحجام۔ ترمذی، ابواب البیوع، باب ثمن الکلب۔

العقوبة الغليظة حتى يصون اماءه وأقل العقوبة ان يهجر فلا يسلم عليه ولا يصلى خلفه اذا امكنت الصلاة خلف غيره ولا يستشهد ولا يولى ولاية اصلاً ومن استحل ذالك فهو كافر مرتد يستتاب فان تاب والا قتل وكان مرتداً لا ترثه ورثته المسلمون وان كان جاهلاً بالتحريم عرف ذالك حتى تقوم عليه الحجة فان هذا من المحرمات المجمع عليها

"اگر کوئی شخص اپنی لونڈی کو زنا پر بھیجتا ہے تاکہ کمائے اور اپنے آپ پر خرچ کرے یا وہ خود اس کمائی میں شریک ہوتا ہے تو ایسے شخص پر اللہ اور اس کے رسول نے لعنت بھیجی ہے وہ فاسق و بدکار ہے کیونکہ اس نے ایک بہت بڑے گناہ کی اجازت دے رکھی ہے اور ایک فاحشہ کی آمدنی حاصل کر رہا ہے اور اسے اس فحاشی سے باز نہیں رکھتا ایسے شخص کو قانوناً ساقط الاعتبار سمجھا جائے بلکہ اسے مسلمانوں کے ہاں اچھے ہی نہ دیا جائے۔ ایسا بدکردار انتہائی سخت سزا کا مستحق ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ سے باز رکھے۔ اس کی کم سے کم سزا یہ ہو سکتی ہے کہ اس سے تعلقات منقطع کر لیے جائیں اس کو سلام نہ کیا جائے اس کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے بشرطیکہ کوئی دوسرا امام مل سکتا ہو۔ اس کو گواہ نہ بنایا جائے اور اس کو قطعاً کوئی عہدہ نہ دیا جائے۔ اگر وہ اس کو حلال سمجھتا ہے تو وہ کافر اور مرتد ہے اس سے توبہ کرائی جائے اگر وہ توبہ کرے تو ٹھیک ہے ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔ اس کے ارتداد کی وجہ سے اس کے مسلم ورثاء اس کے مال کے وارث نہیں ہوں گے۔ اگر اس کو حرمت کا علم

۵۷۔ فتاوی ابن تیمیہ، جلد ۴ صفحہ ۲۴۵

نہ ہو تو بتایا جائے گا تاکہ حجت پوری ہو جائے (اور پھر اس کے ساتھ اوپر والا معاملہ کیا جائے گا) کیونکہ یہ ایسا فعل ہے جس کی حرمت پر پوری امت کا اجماع ہے۔

(۴) آزادانہ اختلاط پر پابندی

آدمی بیسواؤں کے کوٹھوں اور معصیت کے مراکز سے آنکھیں میچ کر آگے بڑھ سکتا ہے لیکن جہاں پورے معاشرہ کو بدکاری کے اڈے میں تبدیل کر دیا گیا ہو وہاں وہ کس طرف بھاگے ؟ اپنے اخلاق و کردار کی تربیت کے لیے کون سی دنیا آباد کرے ؟ آج حال یہ ہے کہ ایک شخص خواہ بازار کا تاجر ہو یا کارخانہ کا ملازم، کالج کا طالب ہو، یا آفس کا کلرک، وہ کسی ہوٹل میں بیٹھا ہو یا پارک میں سیر و تفریح کر رہا ہو، ہر جگہ صنف مقابل معصیت کا پیغام لیے موجود ہوتی ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں موجودہ تہذیب نے عورت اور مرد کے ایک ساتھ عمل دخل کو لازم نہ کر دیا ہو۔ یہی نہیں بلکہ اس یکجائی کو اس قدر رنگین و جاذب بنا دیا ہے کہ قدم قدم پر نگاہیں بھٹکنے لگتی ہیں اور عزم و ارادہ جواب دیتا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ پر جنسی بھوک اور فاقہ کی کیفیت طاری ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے شہوانیت ہر طرف بھیک کا پیالہ لیے گھوم رہی ہو۔

جب تک عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کو ختم نہیں کیا جاتا معاشرہ اس کیفیت سے نجات نہیں پا سکتا۔ آگ اور روئی کا اتحاد ہمیشہ تباہی کا سبب بنتا ہے۔ اسلام نے عورت اور مرد کے حدود کار بالکل جدا رکھے ہیں اس لیے ایسے معاشرہ میں میل جول کے مواقع بہت کم آ سکتے ہیں جو اسلام کی بنیاد پر قائم ہو۔ اور اگر کبھی دونوں کو ایک ہی دائرہ میں کام کرنا پڑے تو اختلاط سے بچے رہنے کا اسلام سختی سے حکم دیتا ہے۔

عن ابن عمرؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی ان یمشی یعنی الرجل بین المرأتین [1]

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق۔

"حضرت عبداللہ بن عمر رض بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی مرد دو عورتوں کے درمیان چلے۔"

ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور مردوں کو خلط ملط ہوتے دیکھا تو عورتوں کو حکم دیا۔

استأخرن فانه ليس لكن ان تحققن الطريق عليكن بحافات الطريق ۲

"پیچھے ہو جاؤ کیونکہ تمہیں بیچ راستہ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، تمہیں راستے کے کنارے چلنا چاہیئے۔"

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورتیں راستہ چلتے وقت اس قدر سمٹی ہوئی اور دیواروں سے لگی ہوئی گزرتی تھیں کہ بسا اوقات ان کے کپڑے دیواروں میں اٹک اٹک جاتے تھے ۲

حضرت علی رض فرماتے ہیں:۔

الا تستحيون فانه بلغني أن نساءكم يخرجن في الأسواق يزاحمن العلوج ۳

"کیا تمہیں شرم نہیں آتی! مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہاری عورتیں بازاروں میں جاتی ہیں اور وہاں کفار سے ان کی مڈبھیڑ ہوتی رہتی ہے۔"

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بازار میں گشت لگا رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک شخص کسی عورت سے مصروف گفتگو ہے۔ آپ نے تعزیراً اس پر دُرّے برسانے شروع کر دیئے۔ اس شخص نے کہا۔ امیر المومنین! یہ تو میری بیوی ہے

---

۱ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی مشی النساء فی الطریق۔

۲ ابوداؤد بحوالہ مذکورہ۔

۳ مسند احمد حدیث ۱۱۱۸۔

یہ سن کر آپ کو بڑی ندامت ہوئی اور فرمایا میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے اگر تم چاہو تو مجھ سے بدلے سکتے ہو۔ اس نے کہا میں نے معاف کیا۔ؔ

شریعت اختلاط ہی کو نہیں روکتی بلکہ اس سے بھی منع کرتی ہے کہ عورت انتہائی شوخ لباس میں اور بن سنور کر گھر سے نکلے اور معاشرہ کی پاکیزہ فضا میں معصیت کے جراثیم پھیلائے۔

عن ابی موسٰی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کل عین زانیۃ والمراۃ اذا استعطرت فمرت بالمجلس فھو کذا وکذا یعنی زانیۃ ؔ

" حضرت ابو موسٰی رض نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ ہر آنکھ زنا کرتی ہے (اس لیے عورت کو چاہیے کہ مردوں کی نگاہوں سے بچ کر گزر جائے) جب عورت عطر لگا کر مجلس سے گزرتی ہے تو وہ ایسی اور ایسی ہوتی ہے یعنی زانیہ ہوتی ہے۔"

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایما امراۃ اصابت بخورا فلا تشھدن معنا العشاء ؔ

" حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو عورت خوشبو استعمال کرے وہ ہمارے ساتھ عشاء کی نماز میں شریک نہ ہو۔"

امام نوویؒ فرماتے ہیں، مختلف احادیث کی بنا پر علماء نے کہا ہے کہ عورت کو مسجد جانے کی اجازت اسی وقت دی جائے گی، جب کہ وہ :-

ان لا تکون متطیبۃ ولا متزینۃ ولا ذات خلاخل یسمع

ؔ العقد الفرید۔

ؔ ترمذی، ابواب الاداب، باب ماجاء فی کراھیۃ خروج المراۃ متعطرۃ۔

ؔ ابوداؤد، کتاب الترجل، باب فی طیب المراۃ للخروج۔

صوتها ولا ثیاب فاخرۃ ولا مختلطۃ بالرجال ولا شابۃ ونحوها ممن یفتتن بها وان لا یکون فی الطریق ما یخاف بہ مفسدۃ ونحوھا[1]

"خوشبو لگائے ہوئے نہ ہو زیب و زینت سے آراستہ نہ ہو ایسے پازیب نہ پہنی ہوئی ہو جس کی جھنکار سنائی دے بھڑکیلے لباس میں ملبوس نہ ہو، مردوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہو، جوان یا ایسی حالت میں نہ ہو جس سے وہ فتنہ کا باعث بنے اور راستہ میں کسی فساد کا خدشہ ہو اسی قسم کے شرائط علماء نے بیان کیے ہیں۔"

علامہ ابن الہمام حنفی رح فرماتے ہیں :-

وحیث ابحنا لھا الخروج فانما یباح بشرط عدم الزینۃ وتغییر الھیئۃ الی ما لا یکون داعیۃ الی نظر الرجال واستمالتھم[2]

"جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عورت کے لیے گھر سے نکلنا جائز ہے تو یہ جواز اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ زیب و زینت کے ساتھ نہیں نکلے گی اور ایسی ہیئت میں ہوگی جو مردوں کو دیکھنے اور مائل ہونے پر نہ ابھارے۔"

امام ابن قیم کی حسب ذیل تصریحات شریعت کے منشاء کی پوری پوری تائید کرتی ہیں :-

ان ولی الامر یجب علیہ ان یمنع من اختلاط الرجال بالنساء فی الاسواق والفرج ومجامع الرجال

---

[1] شرح مسلم، جلد ۱ صفحہ ۱۸۳۔

[2] فتح القدیر، جلد ۲ صفحہ ۳۰۰۔

فالامام مسئول عن ذالک والفتنۃ بہ عظیمۃ قال صلی اللہ علیہ وسلم ما ترکت بعدی فتنۃ اضر علی الرجال من النساء وفی حدیث آخر انہ قال للنساء لکن حافات الطرق ویجب علیہ منع النساء من الخروج متزینات متجملات ومنعھن من الثیاب التی یکن بھا کاسیات عاریات کالثیاب الواسعۃ والرقاق ومنعھن من حدیث الرجال فی الطرقات ومنع الرجال من ذالک وان رأی ولی الامر ان یفسد علی المرأۃ اذا تجملت وتزینت ثیابھا بحبر ونحوہ فقد رخص فی ذالک بعض الفقہاء و اصاب وھذا من ادنی عقوبتھن المالیۃ ولہ ان یحبس المرأۃ اذا اکثرت الخروج من منزلھا ولا سیما اذا خرجت متجملۃ بل اقرار النساء علی ذالک اعانۃ لھم علی الاثم والمعصیۃ واللہ سائل ولی الامر عن ذالک وقد منع امیر المومنین عمر ابن الخطاب النساء من المشی فی طریق الرجال والاختلاط بھم فی الطریق فعلی ولی الامر ان یقتدی بہ فی ذالک۔[1]

”حاکم کا فرض ہے کہ وہ بازاروں، کھلے مقاموں اور مردوں کے مجمعوں میں مردوں کو عورتوں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے باز رکھے۔ اس لیے کہ امام اس سلسلہ میں خدا کے ہاں جواب دہ ہے کیونکہ یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ (اور فتنہ کی روک تھام امام پر لازمی ہے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے بڑھ کر

---

[1] الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ صفحہ ۲۵۹، ۲۵۸۔

اور کوئی فتنہ نہیں چھوڑا ایک دوسری حدیث میں آپ نے عورتوں سے فرمایا تمہیں راستہ کے کناروں پر چلنا چاہیئے۔ امام کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ عورتوں کو آراستہ پیراستہ ہو کر نکلنے سے منع کرے اور انہیں ایسے کپڑوں میں ملبوس ہو کر نکلنے کی اجازت نہ دے جس کے پہننے کے بعد بھی وہ عریاں معلوم ہوتی ہوں۔ مثلاً چوڑے چوڑے اور پتلے کپڑے اور راستوں میں عورتوں کو مردوں سے گفتگو کرنے اور مردوں کو عورتوں سے گفتگو کرنے سے روکنا بھی اس پر ضروری ہے۔ بعض فقہاء کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ جب عورت بن سنور کر باہر نکلے تو امام کو یہ حق ہے کہ روشنائی وغیرہ سے اس کے کپڑے خراب کر دے، یہ بہت ہی ہلکی مالی سزا ہے۔ اگر عورت (بلا ضرورت) بار بار گھر سے باہر گھومنے لگے خصوصاً بھڑکیلے لباس میں تو امام کو اس کے قید کرنے کا بھی حق حاصل ہے بلکہ ان کو اس حالت پر چھوڑ دینا ان کے ساتھ معصیت میں تعاون کرنے کے مترادف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورتوں کو مردوں کے راستہ (یعنی راستہ کے بیچ میں) چلنے اور ان کے ساتھ خلط ملط ہونے سے روک دیا تھا۔ اس معاملہ میں حاکم کو حضرت عمرؓ کی اقتدا کرنا ضروری ہے۔

(۵) فحاشی کی اشاعت کا عدم جواز

بدکاری کی نشر و اشاعت عورت اور مرد کے بے حجابانہ میل جول سے کچھ کم فتنہ انگیز نہیں ہے۔ خیالات و جذبات کے بنانے اور بگاڑنے میں پبلسٹی کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ آدمی کے پاس فکر، احساس اور جذبات کا جو کچھ سرمایہ ہے نشر و اشاعت کے ذرائع اس کا مصرف متعین کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس پونجی کو کس جذبہ کی تسکین میں لگانا چاہیئے۔

عفت کی زندگی اسی وقت گزاری جا سکتی ہے جب کہ بدکاری کی طرف دعوت

دینے والی زبان کاٹ دی جائے اور معصیت کے چرچوں کو بند کر دیا جائے جس سوسائٹی میں تعلیمی ادارے عفت و پاک بازی کے تصور سے نا آشنا ہوں ریڈیو اور اخبار و رسائل بدکاری کے اعلانچی بنے ہوں، ادب اور آرٹ کے نام پر معصیت پھیلائی جا رہی ہو وہاں کیسے ممکن ہے کہ انسان خواہشات نفس کی اطاعت سے بچا رہے۔ جہاں جذبات میں آگ لگانے والی بے شمار قوتیں کام کر رہی ہوں وہاں آدمی اپنے دامن عفت کی کس طرح حفاظت کرے جس تہذیب میں دن ہو کہ رات، گھر ہو یا بازار، تنہائی ہو یا بھری محفل ہر جگہ ہوس پرستی کی ترغیب دی جا رہی ہو وہاں آدمی گناہ سے گریز کرے تو کیسے کرے!

اسلام کے آنے سے قبل عرب کا بھی کچھ حال تھا۔ ان کی مجلسوں میں اخلاق و شرافت کی موت کا سامان کیا جاتا تھا۔ شاعر اپنی شاعری سے سفلی جذبات کو برانگیختہ کرنے کا کام لیا کرتے تھے۔ ادیب اپنے ادب کے ذریعہ بدکاری کے مختلف عوامل و محرکات کو اس طرح سے بیان کرتے تھے کہ کسی شریف انسان کے لیے انہیں پڑھنا بھی گراں گزرتا ہے۔

اسلام نے اعلان کیا کہ معصیت و فحاشی کی اشاعت خواہ زبان و قلم سے ہو یا عملی نمونوں اور تمدن کے آثار سے، اس کا اظہار بھری محفلوں میں ہو یا نجی صحبتوں میں، یہ ایک جرم ہے، انتہائی گھناؤنا جرم جسے کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ○ (النور ۱۹)

"جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی پھیلے۔ بلا شبہ ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے (اور اس کی مصلحت) اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"

عطاء تابعی کہتے ہیں :-

علی من اشاع الفاحشۃ نکل وان صادق [۱]

"جو شخص بے حیائی پھیلائے اسے عبرتناک سزا دی جائے گی خواہ وہ اس میں وہ سچا ہی کیوں نہ ہو"

بعض لوگ جائز تعلقات کے مختلف احوال و کیفیات کی بھی اس انداز سے تصویر کشی کرتے ہیں کہ سننے والے کے حیوانی جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سختی سے ممانعت فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے۔

ان من اشر الناس منزلۃ یوم القیامۃ الرجل یفضی الی امرأتہ ثم ینشر سرھا [۲]

"قیامت کے دن تمام لوگوں میں بدترین ٹھکانا اس شخص کا ہوگا اپنی بیوی سے ہم بستری کرے اور پھر اس کی خفیہ حالت کو پھیلاتا پھرے"

ایک مرتبہ آپؐ نے نماز کے بعد حاضرین سے سوال کیا کہ جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے مجامعت کرتا ہے تو کیا پردہ لٹکاتا، اور دروازہ بند کر لیتا ہے!

لوگوں نے جواب دیا، ہاں۔

پھر آپؐ نے پوچھا کیا وہ اس کے بعد لوگوں میں بیٹھے اس تعلق کی کیفیت پر گفتگو نہیں کرتا!

یہ سن کر لوگ خاموش ہو گئے۔

یہی سوال دوبارہ آپؐ نے عورتوں کے مجمع سے کیا۔ وہاں بھی سکوت طاری رہا۔ لیکن ایک نوجوان لڑکی اٹھی اور اس نے کہا۔

ہاں یا رسول اللہ! عورتیں اور مرد سب کے سب آپس میں ایسی گفتگو

---

[۱] المحلی لابن حزم، جلد ۱۱ صا۲۸۔

[۲] مسلم کتاب النکاح، باب تحریم افشاء سر المرأۃ۔

کرتے رہتے ہیں۔

لڑکی کا جواب سننے کے بعد آپؐ نے فرمایا:-

هل تدرون ما مثل ذالك فقال انما مثل ذالك مثل شيطانة لقيت شيطانا في السكة فقضى منها حاجته والناس ينظرون اليه الا ان طيب الرجال ما ظهر ريحه ولم يظهر لونه وطيب النساء ما ظهر لونه ويظهر ريحه [1]

"معلوم ہے اس کی مثال کیسی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی گلی میں کسی مادہ شیطان کی نر شیطان سے ملاقات ہو جائے اور وہ اسے پکڑ کر وہیں لوگوں کی آنکھوں کے سامنے اپنی خواہش پوری کرنے لگے سُن لو بے حیائی اور فحاشی کا اشتہار ہر طریقہ سے ہوتا ہے یہاں تک کہ زیب و زینت سے بھی، اس لیے) مردوں کا عطر وہ ہے جس کی خوشبو ظاہر ہو اور رنگ نمایاں نہ ہو، اور عورتوں کے لیے ایسی خوشبو مناسب ہے جس کا رنگ تو ظاہر ہو لیکن خوشبو نہ پھیلے"

عن ابن مسعودؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تباشر المرأة المرأة لتنعتها لزوجها كانما ينظر اليها [2]

"ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی عورت کسی دوسری عورت کے ساتھ ایک چادر میں نہ سوئے کہ بعد میں وہ اس کے جسم کی نزاکتوں کا حال اپنے شوہر سے اس طرح

---

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابتہ اہلہ۔

[2] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب یؤمر بہ من غض البصر۔

بیان کرنے لگے گویا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔"

(۶) تعزیر

ان ساری اصلاحات کے بعد اگر کوئی فرد یا جماعت عفت کی راہ کا پتھر ثابت ہو تو اسلام پوری قوت کے ساتھ اکھاڑ پھینکتا ہے۔ وہ ایسی کوششوں کو برگ و بار لانے کا موقع ہی نہیں دیتا جو انسانیت کی کشتی کو معصیت کے منجدھار کی طرف لے جا رہی ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود میں منافقین اپنے کردار سے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ سوسائٹی کو باعفت دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسانیت کا جو قافلہ اخلاق و شرافت کی طرف بڑھ رہا ہے اس کو اپنی منزل سے بیگانہ کر دیں۔ قرآن مجید نے ان فتنہ پردازوں کو سخت تہدید کی اور آگاہ کیا کہ وہ اپنی روش بد سے باز آ جائیں ورنہ ان کے ارادوں کے روبعمل آنے سے پہلے ہی ان کا سر کچل دیا جائے گا۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۝ (الاحزاب ۶۱)

"منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے اور دلوں کو ہلا دینے والی باتیں مدینہ میں پھیلانے والے اگر اپنی روش سے باز نہ آئیں تو ہم تجھ کو ان کے خلاف ان پر مسلط کر دیں گے پھر وہ تیرے قریب کم ہی رہ سکیں گے، پھٹکار ہے ان پر جہاں کہیں وہ پائے جائیں، پکڑے جائیں اور بری طرح قتل کیے جائیں۔"

حضرت عمرؓ نے ایسے افراد کو جلا وطن کر دیا تھا جو معاشرہ کو بگاڑنے میں مصروف تھے۔ جعدۃ السلمی نام کے ایک صاحب تھے۔ جب مجاہدین محاذ جنگ

پر ہوتے تو یہ ان کی عورتوں کو شہر سے باہر بقیع کی طرف لے جاتے اور ان سے گفتگو کرتے رہتے۔ مجاہدین کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے حضرت عمرؓ کو صورت حال لکھ بھیجی۔ آپ نے فوراً ان صاحب کو مدینہ سے نکال باہر کیا [۱]

ایک رات حضرت عمرؓ پہرہ دے رہے تھے کہ ایک عورت کو یہ شعر پڑھتے سنا۔

ھل من سبیل الی خمر فاشربھا   او من سبیل الی نصر بن حجاج

"کیا شراب پینے کی کوئی صورت نکل سکتی ہے اور نصر بن حجاج تک پہنچنے کا کوئی طریقہ ممکن ہے؟"

دوسرے دن آپ نے نصر بن حجاج کو طلب کیا، حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ بہت ہی حسین وجمیل ہے۔ اس سے کہا ذرا اپنے بال ٹھیک کر لو، جب اس نے بال ٹھیک کیے تو اس کی خوبصورتی اور بڑھ گئی پھر آپ نے کہا اچھا تو عمامہ باندھ لو۔ اس نے عمامہ باندھا تو اس کے حسن میں مزید اضافہ ہو گیا۔

گزشتہ رات اس عورت کی بے کلی اور حسرت بھری تمنا صاف ظاہر کر رہی تھی کہ نصر بن حجاج اور اس کے درمیان ناجائز تعلق راہ پا چکی ہے۔ اس لیے آپ نے اس کی ضرورت کا انتظام کر کے اس کو بصرہ بھیج دیا۔ کیونکہ مدینہ میں اس کی موجودگی سے اس کا امکان زیادہ تھا کہ دونوں معصیت میں مبتلا ہوں [۲]

ایک مخنث ضرورت پر بغیر کسی روک ٹوک کے گھروں میں آیا جایا کرتا تھا کیونکہ اس کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ جنسی داعیات سے خالی ہے۔ ایک مرتبہ وہ ام سلمہؓ کے بھائی عبداللہ سے کہہ رہا تھا کہ اگر طائف فتح ہو تو میں تمہیں فلاں پیکر حسن وجمال دکھاؤں گا۔ پھر وہ اس عورت کے حسن کا اس انداز سے نقشہ

---

[۱] فتح الباری جلد ۱۲ صفحہ ۱۳۔

[۲] الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ جلد ۳ صفحہ ۵۷۹۔

کھینچنے لگا جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ صنفی رجحانات رکھتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاق سے اس کی یہ گفتگو سن لی۔ آپ نے ایک طرف ازواج مطہرات سے فرمایا کہ یہ کبھی تمہارے پاس نہ آنے پائے اور دوسری طرف بعض روایات کے مطابق اسے مدینہ سے باہر صحرا میں بھیج دیا۔ (ابوداؤد)

حضرت عمرؓ نے بھی ایک مخنث کو جلاوطن کیا تھا۔ (بخاری)

حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں بھی اسی قسم کا ایک اقدام منقول ہے۔ (بیہقی، جلد ۸ صفحہ ۲۲۴)

(۷) رجم اور کوڑوں کی سزا

بدکاری کی راہ میں جو شخص جتنا آگے بڑھتا جائے، اسلام کا قانون بھی اس کے حق میں اتنا ہی سخت ہوتا جاتا ہے۔ عشق و محبت کے تذکروں پر وہ انسان کو جلاوطن کرتا ہے تو علت جنسی پر بدلا دینے لگانے کا حکم دیتا ہے اور اگر کوئی شخص اپنے جذبہ کی آسودگی کے لیے جائز ذریعہ رکھتے ہوئے ناجائز طریقوں سے لذت حاصل کرتا پھرے تو اسے اس قابل نہیں سمجھتا کہ وہ کسی پاکیزہ سوسائٹی میں زندہ و سلامت چلے پھرے اس کے نزدیک ایسے ناپاک عنصر سے معاشرہ کو پاک کرنا ضروری ہے۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (النور ۲)

"زنا کرنے والی اور زنا کرنے والا ان میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگاؤ اور اللہ کے قانون کے نفاذ میں تمہارے اندر کوئی نرمی نہیں ہونی چاہیئے، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، اور ان دونوں کی سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو موجود ہونا چاہیئے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ یہ حکم بے شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے ہے لیکن جو شادی کے بعد زنا کا ارتکاب کرے اسے رجم کیا جائے گا۔

عن عبادۃ بن الصامت قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خذوا عنی خذوا عنی فقد جعل اللہ لھن سبیلاً البکر بالبکر جلد مأۃ ونفی سنۃ الثیب بالثیب جلد مأۃ والرجم[1]

”عبادہ بن صامتؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لو سنو میرے اس حکم کو، لو سنو میرے اس حکم کو۔ اللہ نے زانی عورتوں کے لیے صورت نکال دی ہے۔ جب کسی دوشیزہ کا کسی مجرد شخص سے زنا ہو تو دونوں کو سو سو کوڑے مارے جائیں گے اور ایک سال کے لیے جلا وطن کیا جائے گا، اور اگر کوئی شادی شدہ عورت کسی شادی شدہ مرد سے زنا کرے تو دونوں کو سو سو کوڑے اور رجم کی سزا دی جائے گی“

اس حدیث کی بنا پر امام احمدؒ، اسحٰقؒ اور داؤد ظاہریؒ کہتے ہیں کہ شادی شدہ شخص اگر زنا کرے تو اس کو پہلے کوڑے لگائے جائیں گے پھر رجم کیا جائے گا۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ، ابو یوسفؒ، زفرؒ، محمدؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، ابن ابی لیلیٰؒ، اوزاعیؒ، ثوریؒ، حسن بن صالح وغیرہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ رجم کے ساتھ کوڑوں کی سزا نہیں دی جائے گی۔

بے شادی شدہ شخص اگر بدکاری کا مرتکب ہو تو امت کا اجماع ہے کہ اسے سو کوڑے مارے جائیں گے۔ لیکن فقہاء کے خیالات اس میں مختلف ہیں کہ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الزنا۔ اس مفہوم کی روایات مستند طریقے سے مروی ہیں اور صحاح کی تمام کتابوں میں موجود ہیں، اس لیے سوائے خوارج اور بعض معتزلہ کے تمام امت کا رجم پر اتفاق ہے ملاحظہ ہو نیل الاوطار، جلد ۷ صفحہ ۲۴۶۔

جلاوطنی جزء حد ہے یا نہیں ! امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ زانی خواہ مرد ہو یا عورت اگر اس کی شادی نہیں ہوئی ہے تو اس کو سو کوڑوں کی سزا بھی دی جائے گی اور ایک سال کے لیے جلاوطن بھی کیا جائے گا۔ البتہ امام شافعیؒ اس میں اتنا اور اضافہ کرتے ہیں کہ زانی غلام ہے تو اس کو صرف چھ ماہ کے لیے جلاوطن کیا جائے گا۔

امام مالکؒ اور امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ جلاوطنی کی سزا صرف مردوں کو دی جائے گی عورتوں کو نہیں۔ فقہاء احناف جلاوطنی کو جزء حد نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق امام کی رائے اور وقت کے مصالح سے ہے۔ جن حالات میں امام مناسب سمجھے گا اس پر عمل کرے گا اور جب اس کو مملکت اور اسلام کے لیے نقصان دہ خیال کرے گا عمل نہیں کرے گا۔

جلاوطنی کے دو اہم مقصد ہیں، ایک تو یہ کہ مجرم کے حق میں حالات ناساز گار کر دیے جائیں اور اسے ایسے ماحول سے ہٹا دیا جائے جہاں محرک معصیت موجود ہے اور جہاں رہتے ہوئے اس کے لیے برائی سے دامن بچانا دشوار ہو رہا ہے۔ اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس سے مجرم کو راہ راست پر آنے میں مدد ملتی ہے کیونکہ وطن سے دوری اور آرام و آسائش سے محرومی آدمی کے جنسی جذبات کو ابھرنے نہیں دیتی۔ زندگی کی حقیقی کلفتوں میں اس کا موقع کم ہی ملتا ہے کہ انسان اپنی جنسی خواہش کی طرف توجہ کرے۔

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام چند خاص حدود ہی کے اندر جنسی تسکین کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان انسانیت کا لباس ہی اتار پھینکے اور معاشرہ کو حیوانیت کا مسکن بنا دے۔ وہ انسان جیسی کائنات کی عزیز ترین متاع کو بے دردی کے ساتھ ختم کر دینا پسند کرتا ہے لیکن اس کو یہ گوارا نہیں کہ سوسائٹی میں زنا کے مہلک جرثومے پرورش پاتے رہیں۔